مجلہ عثمانیہ

طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا رسالہ

مدیرین

سید غلام محی الدین قادری زور
سید معین الدین قریشی

مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

مجلۂ عثمانیہ

جلد اول ۔ شمارہ اول ۔ فروردی ۱۳۳۶ف

مجلس نگرانی

محمد عبد الرحمن خاں صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ
اے آر سی اس ۔ بی اس سی (لندن) فیلو آف دی فزیکل سوسائٹی (لندن)

محمد نظام الدین مولوی فاضل ۔ پی ایچ ڈی (کنٹب)
ام آر اے اس ۔ پروفیسر فارسی و رفیق جامعہ عثمانیہ

ای ای اسپیٹ بی اے ۔ (لندن)
پروفیسر انگریزی کلیہ جامعہ عثمانیہ

مدیرین

شعبۂ اردو
سید غلام محی الدین قادری زور متعلم ام اے
سید معین الدین قریشی متعلم ام اے

شعبۂ انگریزی
سید فضل حق متعلم ام اے ۔ ال ال بی ۔

چندہ سالانہ ۲ روپیہ عثمانیہ طلبہ قدیم سے ۳ روپیہ فی پرچہ ۸ آنہ معہ محصول ڈاک ملنے کا پتہ محمد عبد الجلیل متعلم ال ال بی منتظم مجلہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مجلۂ عثمانیہ

فہرست مضامین جلد اوّل شمارہ اوّل

ہوالفتاح

اِفتتاحیہ

از سید معین الدین قریشی متعلم ام' اے

خدا کا شکر ہے کہ ہماری دیرینہ آرزو اب عملی صورت میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کو کوئی سات آٹھ سال کا عرصہ گرزا۔ اس مدت میں اس نے نوجوان دماغوں کے آراستہ کرنے میں جو حصّہ لیا ہے اس کو ہندوستان کی تعلیمی تاریخ ہمیشہ محفوظ رکھیگی۔ جو توقعات جامعہ کی تحریک سے وابستہ رہی ہیں اُن کی تکمیل اس تھوڑی سی مدت میں ہونی ناممکن تھی کیونکہ قوموں کے ذہنی رجحانات صدیوں میں بدلتے ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں جامعہ نے جو نصب العین ہمارے دماغوں پر نقش کی طرح بٹھا دیا ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور اپنا رنگ دکھائیگا۔ دیر صرف اسی کی ہے کہ ہم خود اس نصب العین پا بس جائیں۔ موسم بدل چکا۔ خوشگوار مستقبل سامنے کھڑا یہ پیغام سنا رہا ہے۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

جس طرح کسی ملک کی سیاسی آزادی اس بات پر منحصر ہے کہ وہاں سیاسی شعور پیدا کیا جائے اسی طرح علم و ادب کی بستی میں جوش اور ہنگامہ پیدا کرنے کی یہ پہلی منزل رہی ہے کہ وہاں علمی شعور کا

بیج بو دیا جائے۔ جامعۂ عثمانیہ نے تھوڑے سے عرصہ میں اس مرحلہ کو کامیابی کے ساتھ طے کر دیا۔ اب عمل کا ایک بڑا انقلاب اس کے سامنے ہے اور علم کی وسیع دنیا سرفروشانِ صداقت کے جوش و خروش کی منتظر۔

جامعہ کی موجودہ جدوجہد سے عام طور پر یہ امید بندھی ہے کہ عنقریب ہندوستان میں یہ علم کا مرکز بن جائے گی اور جی کھول کر اُردو زبان و ادب کی خدمت کرے گی۔ اس کی ابتدا تصنیف و تالیف سے جامعہ کے بعض تعلیم یافتہ افراد کر چکے ہیں لیکن حالات کی ناموافقت مستقل تصنیف و تالیف کے میدان کو وسیع نہیں کر سکتی۔ ان حالات کے مدنظر طلبہ کی ایک عام خواہش تھی کہ کم از کم اس مرکز سے ایک ایسا رسالہ تو نکل جائے جو یہاں کی پیداوار اور اس کے ذہنی ارتقا کی ترجمانی کرتا رہے۔ ملک کے عام علمی اور ادبی حلقوں میں بھی اس کی آمد کا انتظار تھا۔ بارے خدا خدا کر کے یہ منزل بھی طے ہو گئی اور "یہ گنگا جمنی" رسالہ اربابِ علم و فن کی خدمت میں پیش ہے۔

رسالہ کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ بہت عجلت میں نکالا گیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ کسی طرح کام کی ابتدا ہو جائے۔ دوسرے نقش انشاء اللہ اس سے زیادہ کوشش و اہتمام سے نکلینگے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری یہ پہلی کوشش کس حد تک کامیاب رہی۔ اس کا فیصلہ اہلِ نظر اور صاحبانِ تنقید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

کسی ملک کی اصلی علمی اور ادبی خدمت اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اعلےٰ درجہ کے محققانہ اور طبعزاد مضمون لکھے جائیں اور انشا پردازی کے نئے اسلوب اور اقلیمیں پیدا کی جائیں۔ لیکن ملک کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے نشاداب دماغ زیادہ تر مغربی خیالات اور خاصکر انگریزی ادب کی ترجمانی میں مصروف ہیں۔ جس سے عام ذہنی زندگی پر یہ بُرا اثر پڑ رہا ہے کہ فکر کی جدت اور خیال کی روانی کم ہوتی جا رہی ہے۔ گیٹے کا قول ہے کہ ترجمہ ایک قسم کی مشاطہ گری ہے۔ کتنی اعلیٰ دماغی قوتیں ہیں جو اس کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لیکن قدرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کیجیے کہ بے اس کے علمی انقلاب کسی جگہ ممکن ہی نہیں۔ اس لحاظ سے ہم مترجمین کے اس ایثار اور خدمت کا

اندازہ نہیں کرسکتے جو وہ قوم اور ملک کی خاطر کرتے ہیں۔ یہ ایک ناگزیر برائی ہے جس میں خیر و رحمت کی بدلیاں چھپی ہوی ہیں۔

خدا کرے کہ اہلِ ملک مانگا تانگی کے اس دور سے جلد گزر جائیں اور تحقیق و تخیل کے اعلیٰ ترین نمونوں سے اردو ادب کو مالا مال کردیں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اقبال کے اس پیغام آزادی کے ساتھ اکبر مرحوم کا وہ پر لطف شعر بھی بے اختیار یاد آجاتا ہے جس میں موجودہ تعلیم کا بھرم کھولا گیا ہے۔

کہاں وہ فطرتی جوشِ طبیعت
کہاں ٹھوسی ہوی چیزوں کا آماس

جامعۂ عثمانیہ کا قیام اصل میں اسی "آماس" کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ہمارا رسالہ بھی زیادہ تر اسی مقصد کا حامل ہے۔ جس کی جھلک اس اشاعت کے بعض مضامین میں نظر آئے گی۔

سلسلۂ سخن میں اردو کے اس محسن کی یاد تازہ ہوگئی جو ابھی ابھی رنگر آئے عالم بقا ہوا ہے۔ شرر مرحوم نے اپنی اعلیٰ دماغی قوتوں اور لطیف طرزِ انشا سے اردو ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ اردو میں جلی عنوان سے لکھی جائے گی۔ اسی خیال نے مجبور کیا کہ اس شہیدِ اردو کی تربت پر بھی کچھ پھول چڑھا دئے جائیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ عالیجناب محمد عبدالرحمٰن خانصاحب صدر کلیہ نے جس عنایت و فراخدلی سے طلبہ کی خواہشات کو پورا کیا وہ ہر طرح قابل سپاس گزاری ہے۔ جس توقع کے ساتھ رسالہ کی عنانِ ادارت طلبہ کے ہاتھوں میں دی گئی ہے وہ انشاءاللہ پوری ہوگی۔

پروفیسر اسپیٹ اور ڈاکٹر محمّد نظام الدّین صاحب کے ہم بہت ممنون ہیں کہ رسالہ کے معاملات میں پوری دلچسپی کے ساتھ ہماری مدد فرمائی۔ خاصکر ڈاکٹر محمّد نظام الدّین صاحب نے شعبۂ اُردو کی ترتیب و تہذیب اور رسالہ کے عام انتظام میں جس غیر معمولی انہماک اور گرمجوشی سے ہمارا ہاتھ بٹایا اس کا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے دوست مسٹر سید فضل حق مدیر شعبۂ انگریزی بھی قابل مبارکباد ہیں۔ جن کی سرگرمی سے شعبۂ انگریزی بہت قلیل عرصہ میں تیار ہوگیا۔

چلتے ہوئے کلیہ کے یارانِ قدیم سے بھی دو دو باتیں کرنی ضروری ہیں۔ اُن سے ہمیں پوری اُمید ہے کہ وہ رسالہ کو ہر ممکن طریقے سے کامیاب بنائیں گے۔ مادرعلمی کی یاد کوئی پچھلے پہر کا خواب تو نہیں ہے جو اس قدر جلد اُن کے ذہنوں سے نکل جائے۔

اے مطلع عثمانیہ کالج کے ستارو!

از مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

مولانا نے یہ نظم اس وقت طلبہ کو سنائی تھی جبکہ اقامت خانہ قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس مباحثہ کے لئے نئے قواعد بنائے گئے تھے اور جدید نظام پر عمل شروع کرنے کیلئے مجلس مباحثہ کا افتتاح از سر نو ہوا تھا۔

"مجلہ"

آتی ہے نظر آج مسرت سے بھری شام
جلوہ سے مسرت کے منور ہیں در و بام
عثمانیہ کالج کے یہاں جمع ہیں فرزند
تقریب کچھ ایسی ہے کہ دل سب کے ہیں خورسند
کہتے ہیں کہ ہے بحث کی مجلس کا پھر آغاز
قالب ہے نیا اس کا، نئی اسکی ہے پرداز

سچ یہ ہے کہ مجلس ہے جوانوں کی یہ ہادی
مجلس یہ بتاتی ہے اخوت کے مبادی
الفت کا سبق ہے یہ عزیزوں کو سکھاتی
مجلس یہی وحشی کو ہے انسان بناتی
جولانگہ اظہار لیاقت اسے کہیئے
گہوارہ تعلیم فصاحت اسے کہیئے
ذہنوں کی ترقی کا جو میداں ہے تو یہ ہے
آداب تمدن کا دبستاں ہے تو یہ ہے
سانچے میں ہیں اخلاق اسی تعلیم سے ڈھلتے
تہذیب کے چشمے ہیں اسی جا سے ابلتے
سمجھو کہ غنیمت ہے یہ مجلس مری جانو
گزرے جو یہاں وقت غنیمت اسے جانو
بھائی ہو تم آپس میں۔ نہ بھولو یہ سبق تم
گویا کہ ہو بس ایک صحیفہ کے ورق تم

اقرارِ وفا کر کے مکرنا نہ خبردار!!
تسبیح کے دانے ہو۔ بکھرنا نہ خبردار!!
تقریر جو کرنا تو دِل آزار نہ کرنا
تلوار کا بھائی پہ کبھی وار نہ کرنا
آدابِ شرافت سے گزرنا نہ جوانو!
غصّہ بھی گر آئے تو بپھرنا نہ جوانو!
ایسا نہ ہو۔ اغیار کریں شور یہ برپا
یاروں میں نظر آتا ہے اغیار کا نقشا
عثمانیہ کالج کے جگر بند ہیں کیسے
اس مادرِ علمی کے یہ فرزند ہیں کیسے
ہاں دیکھنا عزّت پہ نہ داغ آئے تمھاری
ہو جاؤ نہ تم زیورِ اخلاق سے عاری
تیزی سے قدم علم کے میداں میں بڑھاؤ
سرگرمی و ہمّت سے نہ جی اپنا چُراؤ

قوموں میں اُسی قوم کا روشن ہے ستارا
جس نے کہ قدم علم کے میداں میں ہے مارا
ملکوں میں اُسی ملک کی عظمت ہے مسلم
جس ملک کے سر پر ہے اُڑا علم کا پرچم
گر چاہتے ہو گر کے تنزل سے اُبھرنا
لازم ہے تمھیں علم کے ڈنگل میں اُترنا
اے مطلع عثمانیہ کالج کے ستارو!
ہمّت نہ کبھی علم کی تحصیل میں ہارو
تھے علم میں مشہور جو اسلاف تمھارے
وہ عالمِ بالا سے یہ کرتے ہیں اشارے
چمکیگی اسی علم سے تقدیر تمھاری
یہ ملک تمھاری ہے۔ یہ جاگیر تمھاری
آخر میں دُعا ہے کہ خداوند دو عالم
ہمّت کو تمھاری کرے اس راہ میں محکم

شاعری اور شاعر

از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی۔ پروفیسر فلسفہ کلیہ جامعۂ عثمانیہ

علمی تحریر و تقریر کے لئے غالباً سب سے پہلے سقراط نے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ موضوع زیر بحث کی تعریف و تحدید کی جائے۔ پیشتر اس کے کہ اس کی صحت و سقم یا حسن و قبح یا روا و ناروا ہونے پر استدلال شروع ہو اس طریقے سے ہیولانی بحثوں میں بھی حقیقت کے خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سقراط کے بعد ارسطو نے تعریف و تحدید کے قواعد مقرر کئے جو دو ہزار برس سے منطقیوں کی زبان پر ہیں لیکن اس عالم تنوع و کثرت میں کتنے مظاہر اور اشیاء ہیں جن کی تعریف ہو سکتی ہے کتنے حدود ہیں جن میں جنس پر فصل کے اضافہ سے ایک معین تصور ذہن میں آسکتا ہے۔ ادنےٰ سے ادنےٰ احساس سے لیکر گہرے سے گہرے وجدان تک محسوسات حیات کا تمام خزانہ مفتاح منطق سے نہیں کھلتا۔ مٹھاس کیا ہے۔ درد کیا ہے۔ زندگی کیا ہے۔ عشق کیا ہے۔ کوئی ہے جو ان تصورات کی منطقی تعریف کر سکے۔ یہ کہنا کہ مٹھاس وہ احساس ہے جو میٹھی چیز کھانے سے پیدا ہوتا ہے، درد وہ ہے جو لذت نہیں یا زندگی وہ شئے ہے جو زندہ ہستیاں محسوس کرتی ہیں یا عشق وہ کیفیت ہے جو عاشق کے دل میں موجود ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں نطق و منطق کے لئے اظہار عجز اور سپر اندا ختن ہے یہی کیفیت شاعری کی ہے۔ ارسطو سے لیکر بیسویں صدی عیسوی کے نقادان فن تک مختلف کوششیں اس فن کے تعین خصوصیات کے لئے کی گئیں لیکن اس کی اصلیت زندگی کے دیگر اساسی وجدانات کی طرح محسوس کرنے والے کے لئے سب سے زیادہ بدیہی ہونے کے باوجود خانۂ منطق کے لئے

حلقۂ بیرون در ہے۔ بعض لوگ شاید خیال کریں کہ اس میں بڑی دقت کیا ہے۔ قریبًا ہر پڑھا لکھا آدمی خواہ وہ خود شاعر نہو شعر سے واقف ہے کہ وہ کس قسم کے کلام کا نام ہے۔ کلام میں وزن اور قافیہ ہو تو شعر بن جاتا ہے اور وزن و قافیہ کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو نثر ہے۔ لیکن کون شخص ہے جو ذرا سے غور کے بعد اس تعریف کے نقص سے واقف نہیں ہو جاتا۔ بعض زبانوں میں عظیم الشّان نظمیں قافیہ سے معرا ہیں اور بعض نثریں ایسی ہیں جن کو شاعرانہ نثریں کہتے ہیں بعض لوگ جنہوں نے کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا شاعر مزاج ہوتے ہیں اور بعض شاعر یا متشاعر ایسے بھی گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنہوں نے عمر کا بیشتر حصّہ سخن سنجی یعنی الفاظ کو وزن و قافیہ کی میزان میں تولنے میں بسر کیا ہے لیکن اہل ذوق کے نزدیک وہ شاعری سے معصوم ہیں۔ اس پر بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر قسم کا کلام محض صوتی موزونیت سے شعر نہیں بن جاتا جس خیال یا جذبے کا اظہار اس کلام موزوں میں کیا گیا ہے اس میں حقیقت بھی ہونی چاہئے تو اس اضافہ سے یوں کہینگے کہ شاعری اس خیال یا جذبے کا موزوں کلام میں اظہار ہے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ لیکن یہ تعریف بھی ناقص اور غیر واضح ہوگی کیونکہ خود اس امر کا تعین نہایت مشکل ہے کہ حقیقت سے کیا مراد ہے۔ اگر حقیقت سے مراد مظاہر وجود یا مظاہر نفس کا نقلی بیان ہو تو سائنس اور فلسفہ اس کام کو نثر میں بطریقِ احسن انجام دیتا ہے بعضوں کے نزدیک شاعری تلاشِ حسن اور افزینشِ حُسن ہے۔ گو ایک قسم کی شاعری کے لئے یہ صحیح ہے لیکن شعر کے تمام اصناف کیلئے یہ تعریف جامع نہیں۔ غالب نے اسی خیال سے دیدہ ور کی جو تعریف کی ہے۔

دیدہ ور آں کہ تانہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

وہ اکثر شاعروں کی فطرت اور بصیرت کا جزوِ اعظم ہونے کے باوجود شعر اور تخلیقِ شعر کی پوری ماہیت پر حاوی نہیں کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شاعر زندگی کے صرف تاریک پہلوؤں کو دیکھتا اور اپنے کلام میں صرف اپنے نالوں کو موزوں کرتا رہتا ہے۔ کون کہ سکتا ہے کہ یہ موزوں نالے حُسن و عشق کا واسوخت ہونے کے باوجود شاعری نہیں۔ بعضوں کے نزدیک جذبہ شعر کی ایک غیر منفک خصوصیت ہے اُن کے نزدیک

شعر پُر جذبہ اور موزوں کلام ہے۔ یہ تعریف مذکورۂ صدر تعریفوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع ہونے کے باوجود مُبہم ہے جذبات کے انداز بے شمار ہیں سب کے سب کلام موزوں میں داخل ہو کر اس کو شعر نہیں بنا سکتے خود غرضی غصہ ظلم وغیرہ بھی جذبات ہیں۔ اگر کوئی شخص رذیلانہ اور بہیمانہ غصے میں کسی کو پُر جوش الفاظ اور کلام موزوں میں صلواتیں سنائے تو کیا اسکا یہ کلام شاعری کے معیار کے مطابق ہوگا؟ اگر نہیں تو ہم کو اس امر کا اور زیادہ تعین کرنا پڑیگا کہ انسان کی جذباتی اور وجدانی زندگی کے وہ کیا انداز ہیں جن کے ملاپ سے موزوں اظہار حقیقت شاعری ہو جاتا ہے۔ اقبال نے محض اظہار حقیقت او شعر میں جو فرق ہے اس کو نہایت خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت
بوعلی اندر غبار ناقہ ماند
دست رومی پردۂ محمل گرفت

تمام فنونِ لطیفہ انسان کے لطیف اور ناقابل تعین جذبات کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں یہ مانا کہ شاعر کے لئے سوز اور درد کی ضرورت ہے اور بقول غالب۔ دل گداختہ ہی شمع سخن کا حُسن فروغ ہے۔ لیکن سوز کیا چیز ہے، درد کیا ہے۔ اگر سوز غم زدگی ہے تو کیا زندگی کو سراپا بہار محسوس کر کے منظر عشرت میں بھی گلہائے انبساط کھلانے والی طبیعت لازماً شعر سے معرا ہوتی ہے۔ غالب نے اپنی ایک نہایت پُر جوش اور بلند فارسی غزل کے مقطع میں اپنی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو شعر کہتے ہوئے اس پر طاری ہوتی ہے۔

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

مگر یہ گدازِ دل اور سوز دروں بھی انسانی طبیعت کا ایک گوہر بے بہا ہونے کے باوجود شعر اور شاعری کی پوری ماہیت بیان نہیں کرتا۔ اگر یہ کہیں کہ وہ جذبات اور وہ سوز و گداز جو انسان اور انسان میں

اور انسان اور خدا میں لطیف تعلقات اور گہری کیفیات کا اظہار کریں جنہیں عشق کہتے ہیں یا اس عمل میں سرزد ہوں جسے نیکی کہتے ہیں تو شاعری اخلاقی اور مذہبی تلقین و تعلیم ہو جاتی ہے جو وہ حقیقت میں نہیں اکثر نقادانِ فن نے ناصحانہ شاعری کو شاعری سے خارج کر دیا ہے۔ سعدی کی پند و نصائح کی شاعری مثلاً

آدمی را عقل باید در بدن — ورنہ جاں در کالبد دارد حمار

با بداں بد باش و با نیکاں نکو — جائے گل گل باش و جائے خار خار

حقیقت میں نرا تلاوعظ ہے شاعری نہیں۔ ابھی تک ہماری تلاش تعریف کا نتیجہ محض سلبی ہے ہم دیکھ چکے کہ محض موزوں کلام شعر نہیں، محض اظہار حقیقت شعر نہیں، محض سوز و گداز شعر نہیں، محض پند و نصائح اور اعلیٰ جذبات کا اظہار یا ان کی ترغیب شعر نہیں۔ پر جوش موزوں کلام شعر نہیں اور ان سب کی ترکیب سے بھی لازماً شاعری کا موضوع ادا نہیں ہوتا۔ ہم آیندہ کسی قدر ایجابی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

فیوضاتِ شاد

از راجہ راجایان سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت پیشکار صدر اعظم و مدیر جامعہ عثمانیہ دام اقبالہ

ہر اک کے دل میں ہے دلنشیں تو کہوں میں کیونکر نہاں نہیں ہے
ہر ایک ذرّے میں جلوہ تیرا ہی جلوہ فرما کہاں نہیں ہے

سنی ہے فریاد قمریوں کی سنی عنادل کی داستاں بھی
ہمارا رنگ بیاں نہیں ہے ہمارا طرز فغاں نہیں ہے

ہے کون مندر میں اور مسجد میں میرے پیارے بغیر تیرے
انہیں مکانوں کا تو مکیں ہے تری تجلی کہاں نہیں ہے

بتِ ستمگر! یہ بیوفائی یہ ظلم یہ دعوئے خدائی
خدا کے بندے خدا خدا کر خدا کی قدرت کہاں نہیں ہے

تو ہی نے مجھ کو بشر بنایا تو میری صورت میں بن کے آیا
مرے تو قالب میں تو ہی تو ہے مرا کہیں بھی نشاں نہیں ہے

یہ فخر ہے مجھکو عاجزی پر یہ ناز ہے مجھکو بندگی پر
نہیں کوئی ایسا آستانہ نشان سجدہ جہاں نہیں ہے

تو ہی ہے اوّل تو ہی ہے آخر تو ہی ہے ظاہر تو ہی ہے باطن
ترا ہی جلوہ ہے چار سو میں کہیں کسی کا نشاں نہیں ہے

اگر کوئی ہے تو بس وہی ہے جو وہ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے
ہماری بود و نمود بیش از خیال و وہم و گماں نہیں ہے

ہے میرا ایماں کہ تو ہے واحد اسی لیے ہوں میں تیرا ساجد
یقیں ہے مجھکو کہ تو ہی شاہد کہ شک و وہم و گماں نہیں ہے

یہ تیری ہستی ہے سبکی ہستی جو تو نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا ۔ کہ یار تو جان ہی جہاں کی جو جاں نہیں ہے جہاں نہیں ہے

یہ کیوں کدورت جہاں میں پھیلی یہ کیوں زمانے کا رنگ بدلا ۔ یہ چرخ نیلی جو پیشتر تھا وہی یہ کیا آسماں نہیں ہے

رواج ہی وضع مغربی کا مٹا چلن طرز مشرقی کا ۔ تم اسکو ہندوستاں سمجھتے ہو اب یہ ہندوستاں نہیں ہے

اس آستاں سے کہاں یہ جاویں جہاں نہیں کیونکر امان پاویں ۔ بجز ترے در کے عاصیوں کو کہیں بھی بار اماں نہیں ہے

رقیب ہر دم ہے ساتھ اسکے کشیدہ خاطر ہے یار مجھسے ۔ مجھے یہ کیونکر یقین آوے کہ مجھسے وہ بدگماں نہیں ہے

نہ ہے وہ ساقی نہ جام و مینا نہ ہے وہ محفل نہ وہ قرینہ ۔ پڑا ہے رندوں پہ وقت تجھکو خبر بھی پیر مغاں نہیں ہے

گلے سے ملجا تو میرے جاناں کہ دل ہی میرا بہت پریشاں ۔ اٹھاؤں فرقت کے اب میں صدمے یہ مجھ میں تاب و تواں نہیں ہے

خطا ہی اے شاد کیا تھی اُس میں دیا جو میں نے دل اپنا اسکو

الٰہی ایسا ستم ہوا کیا کہ مجھ پر وہ مہرباں نہیں ہے

اُردو قصائد

از جناب حبیب اللہ صاحب رشدی متعلم ایم۔ اے۔

اُردو کی بدنصیبی کہئے یا خوش قسمتی، اس کو فارسی زبان کی طرح کثرت سے قصیدہ گو شعرا نہیں ملے۔ سنا گیا کہ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان قلی قطب شاہ کے دیوان میں قصیدے بھی موجود ہیں۔ اُن کو پہلا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ ولی کے دیوان مطبوعہ پیرس میں پانچ قصیدے ہیں۔ مختلف قلمی نسخوں میں سے کسی ایک میں یہ پانچ قصیدے ایک جگہ نہیں ملتے میر کے کلیات میں چھ قصیدے ہیں۔ سودا نے سب سے زیادہ قصائد لکھے اُن کے قصائد کی تعداد چالیس بیالیس ہے اور قصائد کے جملہ اشعار ساڑھے تین ہزار سے زائد ہیں۔ انشا کے کلیات میں اُردو قصائد کی تعداد سات ہے۔ شاہ نصیر کے مطبوعہ دیوان میں کوئی قصیدہ نہیں ایک قلمی نسخہ میں صرف ایک قصیدہ نظر آیا۔ آخری دور میں ذوق کے دیوان میں تیئیس۲۳ مومن کے ہاں نو۹ اور غالب کے دیوان میں چار قصیدے ہیں۔ جرأت، آتش، ناسخ کی خودداری نے کسی کی مدح لکھنا گوارا نہ کیا، یا شاید زمانہ کو اُن کے قصائد کا باقی رکھنا پسند نہ آیا۔

اُردو میں غزل گوئی کی طرح قصیدہ گوئی بھی فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی۔ فارسی شاعری میں قصیدہ استادی کے کمال کا معیار تھا۔ اس کی زبان اعلیٰ قرار پائی اور اس میں خیالات کی انتہائی پرواز دکھائی گئی۔ اسی میدان میں علم بیان اور بدیع کے جوہر دکھائے گئے۔ اور مبالغہ کے انتہائی مدارج طے کئے گئے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

ہمیں شک نہیں کہ شاندار زبان اور اعلیٰ خیالات کے اشعار کا اکثر حصہ قصیدوں ہی میں ملیگا

غزلوں میں یہ عنصر کم ہے۔ غزل درد، اثر اور سلیس زبان کے لئے مخصوص ہے۔ فارسی اور اردو میں قصیدہ کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ یہ ایک حد تک اس کے منافی خیال کئے جاتے ہیں۔

اُردو شعرا کے لئے فارسی قصیدوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ قصیدے بھی مختلف رنگ کے۔ خاقانی نے ادق قصیدے لکھے، انوری نے سادگی اور مضمون بندی اختیار کی، معزی اور عبدالواسع جبلی نے لفظی صنائع بدائع سے کام لیا، ظہیر فاریابی نے خیال بندی اور مضمون آفرینی پر زور صرف کیا، قدسی اور کمال اسمٰعیل کے حصہ میں زبان کی شیرینی اور خیال کی لطافت آئی۔ فیضی نے فلسفیانہ انداز قبول کیا اور عرفی نے زور بیان کے ساتھ خیال کی وہ جولانیاں دکھائیں کہ کوئی اس کا ہمسر نہ نکلا۔ نہ صرف یہی بلکہ مغربی طرز انتقاد کی نظر سے اگر ہم دیکھیں کہ فارسی میں کس کس شاعر نے اپنا خاص پیغام دنیا کو سنایا تو ان چند شعرا میں ہمیں عرفی بھی نظر آئے گا۔ یہ بات بدیہی ہے کہ ان تمام شعرا میں سے اُردو شعرا نے انہیں سے زیادہ فائدہ اٹھایا جو ہندوستان آچکے تھے یا غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ اس لئے ہمارے قصیدہ گو شعرا پر سب سے زیادہ عرفی کا اور اس سے کم انوری اور خاقانی کا اثر پڑا۔ فیضی اگرچہ ہندوستانی تھا مگر اس کے رنگ کو اختیار کرنا آسان کام نہ تھا۔ ہر شاعر فلسفی دماغ یا فلسفہ پسند نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظہیر فاریابی کا اثر بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ غالباً فارسی کے دوسرے شعرا بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔

۲

ولی کے پانچ قصیدوں میں پہلا قصیدہ لامیہ سب سے بڑا ہے اس کے (۱۲۳) اشعار ہیں۔ ایس میں اتنی مختلف چیزیں بیان کی گئی ہیں کہ ممدوح اور مدح دونوں صاف طور پر نظر نہیں آتے۔ ممدوح خود معشوق ہے۔ اگرچہ معشوق کی مدح کے لئے غزل کا میدان کھلا ہوا تھا مگر ولی کو معشوق کی شان میں علٰحدہ قصیدہ لکھنا زیادہ پسند آیا۔ دوسرے قصیدوں سے اس میں زیادہ زور صرف کیا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خاص اشتیاق کے عالم میں یہ قصیدہ کہا گیا چنانچہ کہتے ہیں:-

دل کوں شادی ہے کیوں نہ باجیں آج ہر طرف جگ میں تال اور مندل

کوں = کو، باجیں = بجائیں، جگ = دنیا

قصیدہ خاصا ہے۔ گو تمام اشعار قابل تحسین نہیں مگر جگہ جگہ ایسے شعر بھی ملتے ہیں جو ولی کے کمال کو ظاہر کرتے ہیں۔ نعت میں کہتے ہیں:۔

اس کی مجلس میں آ ہوا ہے کھڑا
صفِ آخر میں جو ہر اوّل

یونانی حکما پیدائش کائنات میں جوہر اول کو پہلی مخلوق مانتے ہیں۔ بہت سے مسلمان آنحضرتؐ کے نور کو مخلوق اوّل مانتے ہیں۔

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدہ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ

پس ایک مسلمان کی حیثیت سے ولی کا تخیل جوہر اول کو آنحضرت کی مجلس کی صف آخر میں سمجھتا ہے۔ "اول" کے قافیہ کی لفظی رعایت "آخر" سے پیدا کی ہے۔

حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے لئے کیا اچھی تشبیہ نکالی ہے۔

ایک کا تن ہوا ہے سبز اطلس
ایک خوں سوں زمیں کیا مخمل

ایک کا تن سبز اطلس ہوا (زہر سے)
ایک نے (اپنے) خون سے زمین کو مخمل کیا

دونوں بھائی تھے اس لئے تشبیہ میں بھی اس کی رعایت پیدا کی ہے۔

فراق کی زاری میں آنسو کی تشبیہ کتنی لطیف ہے:۔

جیوں ستارے ٹوٹیں فلک اوپر
یوں انجھو مکھ اوپر پڑیں ڈھل ڈھل

جس طرح فلک پر ستارے ٹوٹتے ہیں
اُسی طرح آنسو منہ پر ڈھل ڈھل پڑتے ہیں

آنکھ سے آنسو جاری ہوں تو رخساروں پر اُن کی دھاریں ظاہر ہوتی ہیں اس کو شہاب ثاقب سے تشبیہ دی ہے۔

معشوق کی مدح میں کہتے ہیں۔

اے شفا بخش تجھ قدم کی خاک
درد کے دردِ سر کا ہے صندل

تجھ قدم میں جو کچھ ہے رنگ صفا
نہیں دیکھا اسکو خواب میں مخمل

دل جو تجھ زلف پیچ بند ہوا   کون کھولے یو عقدۂ لاحل

تجھ زلف = تیری زلف، یو = یہ،

یہ شعر بہت مزے کا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا دل تمھاری زلفوں میں پھنس گیا۔ یعنی میں عاشق ہوگیا۔ عقدۂ لاحل سے مراد زلف سے ہوسکتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ تمھاری زلف کو کون کھولے گا کہ میرا دل نکل آئے۔ دوسری لطافت اس شعر میں یہ ہے کہ میرے دل کا تمھاری زلفوں میں پھنسنا ایک عقدۂ لاحل ہے اِس کو کون شخص حل کریگا۔ یعنی دردِ عشق سے چھوٹنے کی کیا سبیل نکل سکتی ہے۔

پھر کہتے ہیں:—

اے عدیم المثال دو نہ دیکھے   گر مکرر تجھے دیکھے احول

تو وہ یکتا ہے کہ احول بھی دیکھے تو دو نہ دکھائی دے۔

دیکھ تیری نین میں پتلی کوں   عالماں میں پڑیا ہے جنگ و جدل

نین = آنکھ، عالماں = جمع عالم، پڑیا = پڑا،

ایک کہتی ہے مکھ یو کعبہ ہے   اس میں پتلی نے کیوں کیا ہے محل

مکھ = منہ،

چہرے کو کعبہ کہنا اور آنکھ کی پتلی کو بت سے تشبیہ دینی بہت لطیف خیال ہے۔

اس قصیدہ کے پہلے چھ شعر حمد میں ہیں۔ نو شعر نعت میں ہیں دو شعر خلیفہ اوّل کی مدح میں ہیں اور ایک ایک شعر خلیفہ دوم اور سوم کی مدح میں خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی شان میں چھ شعر تصنیف کئے ہیں۔ پھر چاروں خلفا کی تعریف متحدہ طور پر پانچ اشعار میں کی ہے۔ چھ شعر حسنینؑ کی تعریف میں ہیں۔ اس کے بعد دنیا کی مذمّت شروع کر دی ہے جو سات شعروں میں ختم ہوئی ہے اس کے بعد تین شعر مال کی مذمت میں ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ سب کو ترک کر اور میری بات سن جو دودھ اور شہد سے میٹھی ہے وہ یہ کہ عشق بازوں کا مرتبہ پہچان کہ یہ ملک وفا کے رئیس ہیں۔ میں نے اکثر عالموں سے پوچھا، عقدۂ دل کو کسی نے حل نہ کیا۔ لیکن جب میں نے حال دل عشق کو سنایا اس نے مجھے

مرحبا کہہ کے پاس بلایا اور "عقدۂ راز" کا گر بتایا۔ کہا، قلبی اور منہل کا سبق چھوڑ شاہد راز کا "درس دیکھ"
اس کے بعد حضرتِ عشق نے شاہد راز کی خوب ہی تعریف و توصیف کی۔ فرماتے ہیں " مرشد عشق کی یہ باتیں
سُن کر میرا شوق اس معشوق کو گلے لگانے چلا۔ لیکن اس دلبر کو برقع میں دیکھا تو مضطر ہو کر کہا۔ اپنے
منہ پر سے نقاب ہٹا ہم پاکباز ہیں۔ پاکبازوں سے کیا پردہ۔ اے ظالم میں تجھکو روزِ ازل سے جانتا
ہوں۔ تجھکو خدا کا خوف نہیں ورنہ تو مجھ پر ایسا ستم روا نہ رکھتا، یہ سنکر شاید معشوق کو رحم آیا۔ یہ لذت
دیدار سے شاد کام ہوئے اور اس کے چہرے اور حُسن کی تعریف کرنے لگے۔ پانچ شعر حُسن کی مدح میں کہنے
کے بعد معشوق سے اس کے تغافل کا گلہ کرنا شروع کیا۔ گلہ کے بعد پھر چار پانچ شعر اور ایک غزل معشوق
کی مدح میں کہی ہے غزل کا مطلع کچھ اچھا نہیں۔ غزل میں معشوق سے التجا کی ہے کہ تو گھر سے نکل آ میری آہ
تیری رہبری کریگی۔ تین شعر رقیب کی شکایت میں ہیں۔ غزل کا مقطع ہے:-

اے ولی ترک کر یو حرف دراز　　　　کہ ہے خیر الکلام قل و دل

قصیدہ کے اختتام میں تین اشعار میں معشوق کو دعا دی ہے:-

عمر تیری دراز ہو جگ میں　　　　جب تلک ہے مطول او راطول

مطول اور اطول کو دراز کی رعایت سے لائے ہیں۔ اس کے بعد تین آخری شعروں میں اس
قصیدے کے لاجواب ہونے پر فخر کیا ہے۔

دوسرا قصیدہ آنحضرتؐ کی نعت میں ہے۔ یہ پہلے قصیدے سے چھوٹا ہے اور قصیدہ کے اصول
کے مطابق ہے۔ پہلے پندرہ شعر تشبیبہ کے ہیں جس میں عشق کی تعریف کی ہے۔ زمین بہت شگفتہ اختیار
کی ہے اور اس میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ مطلع ہے:-

عشق کوں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے　　　　ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے

عشق کے لئے لازم ہے کہ عاشق پہلے اپنی خودی کو فنا کرے۔ یزدان کی یاد ایسی دائمی ہو کہ
خود کو اس میں فنا کر دے۔

جوش دے یکبارگی دل کے دریاکوں لہوتی — گوہر انجھواں کوں رورو رنگ مرجانی کرے

سوں ستی = سے، — انجھو = آنسو، لوہو = لہو

سرخرو ہو آبرو دو جگ میں پاوے اے عزیز — دل کو لوہو کر اول لوہو سوں جو پانی کرے

دل کے دریا کو خون سے ایسا جوش دے کہ آنسو کے گوہر مرجان بن جائیں" خون کے دریا سے جو موتی نکلینگے وہ یقیناً سرخ رنگ کے ہوں گے۔ دوسرے شعر میں یہ تلقین کرتے ہیں کہ دل کو پہلے خون کر، پھر اس لہو کو پانی بنا۔ یعنی دل کو پانی بنا کر بہادے جب عشق میں اتنی تکلیف اٹھائے گا تب دو جہاں میں سرخرو ہوگا اور آبرو پائیگا" "سرخرو، آبرو" "لہو اور پانی" کی رعایت کے الفاظ ہیں۔ اس قسم کی رعایت اس وقت مبتذل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لکھنو اودھ کا پایہ تخت نہیں بنا تھا۔ ضلع جگت کا ابتذال اس عہد کے بہت بعد پیدا ہوا۔

تشبیب کے بعد ایک گریز سے آنحضرتؐ کی مدح شروع کی ہے کہ یا محمدؐ آپ کی ذات سے دو جہاں کی عید ہے خلق کو لازم ہے کہ اپنے جی کو آپ پر قربان کرے یہاں عید قربان سے بہت اچھی تلمیح لی ہے۔

یا محمدؐ دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں — خلق کو لازم ہے جیو کوں تجھ پہ قربانی کرے

سوں = سے، — جیو = جی، جان، دل۔

پھر فرماتے ہیں

وو اچھے آزاد جو بازار میں تجھ حسن کے — بندگی میں آپ کوں جوں ماہ کنعانی کرے

آزاد وہی شخص ہے جو تمھارے حسن کے بازار میں اپنے آپ کو حضرت یوسفؑ کی طرح بیچ دے۔ یعنی آپ کی بندگی اختیار کرے۔ داؤدؑ اگر تریتو الحانکم کی خوش خبری سنے تو آپ کے دربار میں خوش ہوکر خوش الحانی کرے اگر آپ کے غضب کا سمندر طوفان میں ہو تو نوحؑ آپ کی رحمت کی کشتی کے سوا کوئی پناہ نہ پاوے۔ اگر کلیمؑ آپ کی ثنا خوانی کریں تو اپنے کلام کو "رتبہ عالی" میں دیکھیں اگر تیری امت مہمانی کرے تو خلیل اللہ اتنے مشتاق ہوجائینگے کہ اپنے جسم کو پھینک کر صرف روح سے آجائیں گے۔

جسم کوں سٹ روح سوں آوے بہت مشتاق ہو — گر تری امت خلیل اللہ کی مہمانی کرے

یہ بہت اچھا شعر کہا ہے۔ اشتیاق میں انسان بے خود ہو کر نکلتا ہے اور ہر وہ چیز جو اشتیاق میں کاوٹ پیدا کرتی ہے اس کو ترک کرتا جاتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم بھی، جنکی مہمان نوازی مشہور ہے ایسے مشتاق ہو کر نکلینگے کہ وہ اپنے جسم تک کی پروا نہ کریں گے۔

مسیحا اگر تیرے پاس آکر اپنی پیشانی کو لوح بنائے اور "فقر" کی مشق کرے تب کہیں "فقر" کے خط کو آپ کے ہاں سیکھ سکینگے۔ یعنی حضرت عیسیٰ باوجود فقر و عجز میں مشہور رہونے کے آپ کے فقر کے مقابلہ میں طفل مکتب کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کس زور کا شعر کہا ہے۔

جس مکاں میں ہے تمھاری فکر روشن جلوہ گر عقل اوّل آ کے واں اقرار نادانی کرے

نہ صرف یہی کہ اس شعر میں ایک لفظ بھی قدیم زبان کا نہیں بلکہ خیال کے لحاظ سے بھی یہ مدح کا عمدہ نمونہ ہے۔ شعر اتنا صاف ہے کہ نثر کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر افلاطون آپکے مکتب میں سبق خوانی کرے تو حکمت کی سب کتابیں دھو ڈالے۔ اسی سلسلہ میں اور تین شعر مدح کے ہیں۔ مقطع میں فرماتے ہیں کہ جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے تو عارف جان و دل سے لاکھوں آفریں کہیں۔

تیسرا قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔ ابتدا میں (۱۸) اشعار کی تشبیب ہے جسمیں زمانہ کی شکایت کی ہے۔ مطلع ہے:۔

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

ہر رنگ میں میں نے چرخ کے نیرنگ دیکھے اس لئے دنیا کے باغ میں غنچہ کی طرح دل تنگ ہوا۔ جہان کے گلبدن جب جلوہ گر ہوئے، اُن کی تجلی سے عاشقوں کا رنگ اُڑ گیا۔ یہ عاشقوں کے جلانے کو ہمیشہ مستعد ہیں۔ مثال کے طور پر شمع اور پروانہ کی حالت دیکھ لو۔

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل ورائے خونِ جگر نہیں دیا مجھے گلرنگ

میں نے باغ میں سوائے داغ کے کوئی پھول نہ دیکھا اور مجھے اپنے خون جگر کے سوا گلرنگ نہیں دکھائی دیا۔ اس شعر میں پھول کو داغ کہنے کے بعد اسی کی رعایت سے پھول کے رنگ کو کہتے ہیں

کہ وہ مجھے صرف خون جگر میں دکھائی دیا۔ گلِ بے وفا میں وفا کا رنگ نظر نہیں آتا اس لئے بلبل شور کرتے ہیں۔ فلک کی خشک مزاجی دیکھکر دنیا بے دم ہوگئی ہے۔ فوارے کے دل میں اب امنگ باقی نہیں رہی۔

اگرچہ سرد ہے دل لیک پُر ہے آتش سوں لیا ہے منہ پہ اپس کے اگن نے پردۂ سنگ

'اپس کے = اپنے' اگن = آگ'

میرا دل اگرچہ سرد ہے لیکن آگ سے پُر ہے۔ اس آگ نے پتھر کے پردہ میں منہ چھپا لیا ہے۔ مجلس (یعنی دنیا) کا یہ حال دیکھکر رباب کی رگیں خشک اور اس کی ہڈیاں کھوکھلی (بے مغز) ہوگئیں اور مردنگ دنگ ہے۔ آجکل مفلسی کا ایسا غلبہ ہے کہ اس کو طنبورے پر بھی ہاتھ مارنے سے دریغ نہوا جس کی وجہ طنبورے کے تار بھی گنتی کے رہ گئے۔ فلک ایسا بے مروّت ہے کہ اس نے سورج کو بھی برہنہ سر کردیا۔ ناتوانی آج کل اتنی بڑھ گئی ہے کہ جنگل میں شیر اور چیتے لومڑی سے عاجز ہوگئے ہیں۔ آسمان کی کمان سے جتنے تیر چھوٹے ان سب نے قابل لوگوں ہی کے دلوں کو آماج گاہ بنایا۔

یگانگت کوں اوّل کی تمام بسرے خلق رکھے اپس میں عداوت مثال شیشہ و سنگ

لوگ پہلے کی دوستی اور یگانگت کو بھول گئے۔ اب آپس میں شیشہ اور پتھر کی سی عداوت رکھتے ہیں۔ ایک نئی تشبیہ ملاحظہ ہو:-

ظلم پہ دل ہے رکھے موں میں حیف سوں انگلی لیا ہے خلق نے خاصیت تمام تفنگ

خلق کے دلوں میں ظلم بھرا ہوا ہے اور بظاہر افسوس ظاہر کرنے کے لئے منہ میں انگلی رکھی ہے گویا بندوق کی پوری خاصیت پیدا کی ہے۔ ستمگر آسمان کی سرکشی دیکھو کہ خود اکیلا ہو کر تمام خلق سے لڑتا ہے (ایسی حالت میں) جو قدم سیم و زر کی فکر میں گھسے گا وہ یقیناً پھنس جائیگا۔ کیونکہ پاؤں گھس کر لنگڑا ہو جائے گا اور لنگڑا منزلِ مقصود کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ اپنے دشمن سے بچنے کی کوشش کر خواہ وہ دشمن بے دست و پا ہی کیوں نہو دیکھ جھینگر اگرچہ خاک نشیں ہوتا ہے مگر کاٹنے میں کمی نہیں کرتا۔ دنیا کے ان لاعلاج حالات دیکھکر اہل دانش گوشہ نشین ہوگئے ہیں۔ یا علیؓ (ایسے وقت میں) آپ میری دستگیری کریں کہ مجھے اس فلک نے بہت تنگ کر دیا ہے۔

ہو دستگیر مجھے یا علی ولی اللہ   کہ اس فلک نے کیا ہے کمال مجھ کوں تنگ

دنیا کی شکایت کے بعد یہ گریز اچھا کیا ہے۔ اس کے بعد چھ سات شعر مدح کے ہیں۔ دو شعر حضرت کے غلام قنبر کی تعریف میں ہیں۔ تین شعر حضرت کے مرکب دُلدُل کی تعریف میں ہیں۔ مقطع میں کہتے ہیں کہ ولی اُسی کی آل پر سے تصدق کی ہوئی چیز ہے اور اُس نے (یعنی ولی نے) اُس کے (حضرت علیؓ) چراغ پر اپنے دل کو ہمیشہ پروانہ بنایا۔

چوتھا اور پانچواں دونوں قصیدے ایک ہی زمین میں ہیں۔ چوتھا قصیدہ حضرت میراں محی الدّین قدس سرہٗ کی شان میں ہے۔ اور پانچواں حضرت شاہ وجیہ الدّین قدس سرہٗ کی مدح میں۔ چوتھے قصیدے میں ابتدا ہی سے حسن کی تعریف شروع کی ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرت میراں محی الدینؒ کی مدح ہے یا معشوق کے حُسن کی۔ بیسویں شعر میں البتہ صاف طور پر حضرت کو خطاب کیا ہے، اور اخیر تک مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ مقطع کا شعر ہے۔

یقیں ہے مجھ کوں اگر یو قصیدۂ رنگیں   سُنیں تو وجد کریں انوری و خاقانی

اس میں شک نہیں، پرانی زبان کے قطع نظر، قصیدہ بہت اعلیٰ درجہ کا ہے مگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ انوری یا خاقانی کے جواب میں یہ قصیدہ لکھا ہے۔ اِن دونوں کے کلیات میں اس زمین میں کوئی قصیدہ نظر نہ آیا۔ خاقانی نے اس قافیہ میں ایک قصیدہ کہا ہے۔ لیکن بحر بدلی ہوئی ہے۔

نثارِ اشکِ من ہر شب شکر ریزست پنہانی   کہ ہمّت راز ناشوئی ست بازانو و پیشانی

انوری و خاقانی کا ذکر شاید اس لحاظ سے کیا ہو کہ قصیدہ میں یہی دونوں سب سے بڑھے ہوئے مانے جاتے ہیں۔

پانچویں قصیدے میں حضرت شاہ وجیہ الدّین قدس سرہٗ کی مدح کی ہے، جنکی مزار مبارک احمد آباد گجرات میں ہے۔ صفر کے مہینے میں حضرت کا عرس ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ عرس ہی کے زمانہ میں کہا گیا ہے۔ چودہ اشعار میں بہاریہ تشبیب ہے۔ پندرھواں شعر گریز کا ہے کہ ایسی بہار میں

حضرت کا عرس آیا ہے۔

سو اس بہار میں آیا ہے عرس حضرت کا　　ہوئی ہے پھر کہ عیاں حشمت سلیمانی

گریز کے بعد عرس کی تعریف کی ہے۔ پھر حضرت کی مدح ہے۔ ایک ایک شعر آستان، صحن، حوض، کنواں، مسجد، گنبد اور مدرسہ کی تعریف میں ہے۔ مقطع میں فرماتے ہیں۔

لکھا ہوں دل کو ولی کے یو مصرع عرفی　　کہ ایں قصیدہ بیاضی بود نہ دیوانی

دوسرا مصرعہ عرفی کے ایک قصیدہ کا ہے جو اسی زمین میں ہے۔ یقین ہے کہ یہ اور غالباً اس سے پہلے کا قصیدہ بھی عرفی کے اس قصیدے کے ملاحظہ کے بعد لکھا گیا۔ چند ہم قافیہ شعر ملاحظہ ہوں:۔

عرفی　　بوصف رایش اگر خامہ زن شوم گردد　　انا ملم ہمگی چوں ہلال نورانی

ولی　　چراغ گرد یو روضہ کے جب ہوئے روشن　　ہر اک چراغ ہے جیوں آفتاب نورانی

جیوں = جوں، جیسے

ولی روضہ کے چراغوں کو آفتاب کی طرح نورانی بتاتے ہیں۔ اور عرفی کہتا ہے کہ اس کی رائے کی تعریف کروں تو میری انگلیاں چاند کی طرح نورانی ہو جائیں۔ اگرچہ عرفی کا خیال بہت نازک ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے مگر ولی کے چراغ کو آفتاب سے تشبیہ دینے میں جو سادگی اور فطری انداز ہے اس کا لطف ہی دوسرا ہے۔

عرفی　　فلک بروئکش آفتاب گردیدے　　بروز عدل تو حُسن زمانہ فانی

ق

بماندے از حرکت آفتاب در مطلع　　مثال دیدۂ عاشق بگاہ حیرانی

ولی　　ترے جمال کی یو آرسی جو کوئی دیکھے　　تو حاصل اُس کوں ہوئے سوا حیرانی

عرفی کہتا ہے کہ آسمان اگر آفتاب کی آنکھ سے تیرے عدل کے روز حُسن زمانہ کو دیکھے تو دیدۂ عاشق کی طرح حیران رہ جائے۔ ولی کہتے ہیں کہ تیرا جمال آئینہ جیسا مصفا ہے۔ پس جو کوئی اسے دیکھے گا سوائے حیرانی کے اُس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ممدوح کے چہرے کی چمک دمک کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

آئینہ کے ساتھ حیرانی کا خیال وابستہ ہے۔ کمال کی انتہا کا اثر حیرانی ہے پس حسن کے کمال سے حیرانی کا پیدا ہونا لازمی ہوا۔ اس لئے ممدوح کے چہرے میں کمال حسن کو دیکھ کر حیران ہونا گویا آئینہ کو دیکھ کر حیران ہونا ہوا۔

عرفی — بعہدِ او شعرا در صفاتِ زلفِ بتاں — کنند نقل جمعیت از پریشانی

ولی — جنوں ہے یو کہ اچھے جیو کو اسکی جمعیت — تری زلف ہے جسے باعث پریشانی

اچھے = ہو، ہے'

عرفی کہتا ہے کہ اس کے عہد میں شعرا زلفِ بتاں' کی صفت "پریشانی" کی جگہ "جمعیت" بیان کرتے ہیں۔ یعنی تیرے عہد میں اتنا امن اور آسایش ہے کہ 'زلفِ بتاں' کو بھی پریشان نہیں کہہ سکتے۔ ولی کہتے ہیں جس شخص کو تیری زلف پریشانی کا باعث ہے اس کے لئے جمعیت گویا جنون ہے۔ یعنی تری زلف کا سودا ایسا بے قدر نہیں کہ اس کو کھو دیا جائے اور اسکی جگہ خاطر جمعی قبول کی جائے۔ عرفی کا شعر بہت ہی عمدہ ہے مگر مضمون پورا مبالغہ پر مبنی ہے۔ ولی نے مبالغہ نہیں کیا وہ محبوب کی زلف کی خوبی ثابت کرتے ہیں کہ ایسی پیاری زلف سے چھٹکارا حاصل کرنا جنون ہے۔

عرفی — ز شوقِ بو قلموں حلۂ عبارت من — مدام شاہد معنی نمود عریانی

ولی — ترے فراق نے عشاق کو کیا امداد — غذائے خونِ جگر ہور لباس عریانی

ہور = اور'

اس قافیہ میں عرفی ہی کا شعر اچھا ہے۔

عرفی — بنوش و باک مدار ایں شرابِ خامہ رسا — کہ نیست خوردنِ ایں بادہ را پشیمانی

نوائے لاف وگزافے کہ سنتِ شعراست — زدم چناں کہ ولم خوں شد از پشیمانی

ولی — تری برہ میں جو دانش کی آرسی کوں رکھیا — عیاں دسے ہے اسے صورتِ پشیمانی

برہ = محبت' عشق' رکھیا = رکھا' — دسے ہے = دکھائی دیتی ہے'

اگر تیرے عشق میں کوئی شخص عقل کے آئینہ کو دیکھے تو اسے صرف پشیمانی کی صورت دکھائی دیگی۔

کیونکہ عشق، اور تیرے عشق کی حالت میں عقل کی طرف رجوع کرنا ایک نادانی ہے۔ عرفی کے دونوں شعر اس کو نہیں پہنچتے

عرفی　دلیر زانش برہمتم کہ از لیاقتِ او　گرفتہ برہمنی صورتِ مسلمانی

ولی　تری زلف سوں لئے کافراں سرِ رشتۂ کفر　ترے جمال سوں ہے رونقِ مسلمانی

"مسلمانی" کا قافیہ دونوں کے ہاں بہت عمدگی سے بندھا ہے۔ عرفی کا یہ شعر حکیم ابوالفتح کی مدح میں ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی لیاقت سے برہمن مسلمان نظر آتا ہے۔ ولی کا شعر عرفی سے بہت بڑھا چڑھا ہے۔ زلف سیاہ ہوتی ہے اس لئے اس کو شعرا ہندو بولتے ہیں ؎

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے گیسو بڑھے　حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

پھر زلف اور زنار میں تشبیہ ہے اسلئے کہتے ہیں کہ کافروں نے کفر کا سر رشتہ تیری زلف سے حاصل کیا اور تیرے پرجمال چہرے سے مسلمانی کی رونق ہے۔ اس قافیہ میں عرفی نے دو لاجواب مطلع نکالے ہیں۔

بیا کہ با دلم آں می کند پریشانی　کہ غمزہ تو نہ کرد ست با مسلمانی

زہے وفائے تو ہمسایۂ پشیمانی　نگاہِ گرم تو تکلیف نا مسلمانی

ولی کے ہاں اس قافیہ میں کوئی مطلع نہیں صرف ایک شعر اور ہے۔

ہے ملکِ دیں میں تری ذات کوں شہنشاہی　ہے نقدِ علم ترا سکۂ مسلمانی

عرفی　کسیکہ تشنہ لب ناز تست میداند　کہ موج آب حیات است چیں پیشانی

ہماں کہ فرق فلک را بہ تیغ بشگافد　گرت زحادثہ چینے فتد بہ پیشانی

ولی　وو آفتاب نمط جگ منیں ہوا روشن　ترے جو نقشِ قدم پر گھسا ہے پیشانی

نمط = طرح، منیں = میں،

تجھ آستان پہ سورج تا کہ آکرے سجدہ　ہوا ہے سر سوں قدم لگ تمام پیشانی

تجھ آستان = تیرے آستاں،　لگ = تک،

عرفی کہتا ہے کہ جو شخص تیرے ناز کا کشتہ ہے وہ تیری چینِ پیشانی کو آبِ حیات کی موج سمجھتا ہے۔ دوسرے شعر میں کہتا ہے اگر کسی حادثہ سے تیری پیشانی پر بل پڑ گیا تو آسمان کا سر تلوار سے کاٹ دیا جائے گا۔ ولی کے شعر صاف ہیں۔ عرفی کے دونوں شعر ولی سے بڑھے ہوئے ہیں۔

عرفی
نہ نفس کلی و دریائے گوہرِ دانش — نہ عقلِ اوّل و استاد جوہرِ ثانی
ز سایہ تاج دہ فرقِ بختِ عرفی باد — ہمائے دولتِ مخدومِ اول و ثانی

ولی
یو ممکنات میں تمکیں تری پہ ہوئی ہے ختم — اِتا جہاں نہیں ہے ممتنع ترا ثانی
یو دینِ پاک میں بے شک ہے توں وجیہہ الدین — عدم ہے آج زمیں کے اوپر ترا ثانی
وو فیض بخش ہے مسجد مکاں برجستہ — کہ جس کی وصف میں بولیا ہوں کعبۂ ثانی

توں = تو، وو = وہ، بولیا ہوں = بولا ہوں،

"ثانی" کا قافیہ ولی کے پہلے شعر میں بہت ہی عمدگی سے بندھا ہے۔ باقی دو شعر عرفی سے بہتر نہیں۔

عرفی نے اس قصیدے میں انوری، خاقانی اور کمال اسمٰعیل تینوں سے اپنے کو افضل ظاہر کیا ہے مگر ان کا ذکر بے ادبی سے کرتا ہے۔ انوری کے متعلق کہتا ہے۔

مفرّح جگہ من از بہرِ روح سازد ہم — نہ انوری نہ فلانی دہد نہ بہمانی

خاقانی پر کئی جگہ طعن کیا ہے:۔

ببیں کہ تافتہ ابریشمش چہ خامی یافت — ز تابِ اطلسِ من شعربافِ شروانی
زمانہ بیں کہ مرا جلوہ داد تا از رشک — بداغہائے پس از مرگ سوخت خاقانی
ز بہمعانی شعرم بشاعرِ شروان — بعہد کودکیم ذہن کردہ کشروانی

کمال اسمٰعیل اصفہانی کے متعلق کہتا ہے:۔

بعہدِ جلوۂ حسنِ کلامِ من اندوخت — قبولِ شاہدِ نظمِ کمال نقصانی
کنوں کہ یافت چو من سرمہ سائے در شیراز — خرد ز دیدہ کشد سرمۂ صفاہانی

مدہ بہ راوی ناجنس نامہ ام کہ مرا — دریں قصیدہ بروز کمال ننشانی
مراز نسبت ہمدردی کمال غم است — وگرنہ شعر چہ غم دارداز غلط خوانی

ولی نے اپنے کمال کو اس طرح اوروں کی تنقیص کر کے نہیں ثابت کیا۔

یقیں ہے مجکوں اگر یو قصیدہ رنگیں — سنیں تو وجد کریں انوری و خاقانی

انوری اور خاقانی کے کمال پر حرف نہیں رکھا بلکہ ان کے کمال کو مانتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بھی اس قصیدہ کو سنینگے تو وجد کرینگے۔

عرفی اور ولی کے ہم قافیہ اشعار کے مقابلہ سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ ولی قصیدہ میں عرفی سے بہتر تھے۔ عرفی علاوہ اس کے کہ وہ ولی سے پہلے کا شاعر ہے، ولی سے قصیدے میں بڑھا ہوا ہے۔ تو دو یہ قصیدہ ولی کے دونوں قصیدوں سے بہتر ہے اگر چہ اتفاق سے ہم قافیہ اشعار میں ولی کے بعض شعر اچھے نکلے ہیں لیکن اسی قصیدہ میں عرفی نے دوسرے قافیوں میں بہت بلند پایہ شعر کہے ہیں۔

ترحمے نہ کند حسن بر دلم گوئی — کہ در زمانۂ یوسف نہ بود زندانی
متاع حسن تو سرمایۂ تہی دستی — خیال زلف تو مجموعۂ پریشانی
لب تو جرعہ دہ بادۂ دل آشوبی — غم تو شانہ کش طرۂ تن آسانی
ذخیرہ نہد از من کہ مانی از صورت — تمتعے برم از وے کہ صورت از مانی

....

عداوتش بہ گہر سیمیائے مصلحتے — عنایتش بہ اثر کیمیائے رحمانی
زمانہ راو فلک را بوے خطا بے بود — نہ دوش ودی دم اشراق صبح امکانی

ہم قافیہ اشعار کے علاوہ ولی کے ہاں بھی اچھے اشعار موجود ہیں مگر وہ عرفی کے بہترین اشعار کی ٹکر کے نہیں۔

تجھ اشتیاق کی آتش سوں سرفراز ہے دل — کہ سر پہ آگ کے شعلہ ہے تاج سلطانی

تیرے اشتیاق (شوق) کی آگ سے دل سرفراز ہے — آگ کے سر پہ شعلہ تاج سلطانی ہے۔

جگت میں تجھ خسم ابرو کی کج نگاہی دیکھ
ڈوبے ہیں آب میں سر تا قدم ایمانی

ترے چمن کی صبا اگر کرے چراغ کوں گل
گل چراغ دسے جیوں گل گلستانی

ہوا ہے خلق اوپر بھر کہ فضل سبحانی
کیا ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی

بو آب صاف کوں گوہر نے دیکھ خجلت سوں
صدف کے بیت میں گل کر ہوا ہے جو پانی

قطار قطرۂ شبنم سوں آج سبزۂ خضر
لے سجہ ہاتھ میں کرتا ہے ادعیہ خوانی

ہر ایک قطرۂ شبنم ہے غیرت گوہر
ہر ایک پات پہ برسیا جو ابر نیسانی

جو اس کے بھید کے پیاسے تھے بو پانی دیکھ
پیے ہیں آب نمط راز ہائے پنہانی

ولی نے اگرچہ زیادہ تعداد میں قصیدے نہیں کہے مگر انھیں چار پانچ قصیدوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس صنف میں زیادہ کوشش کرتے تو یقیناً فارسی کے بہترین قصیدہ گو شعرا کے برابر ثابت ہوتے۔ ولی نے قصیدہ کے تقریباً تمام لوازمات کا خیال رکھا۔ ان کے بعض مطلعے بہت زوردار ہیں۔ گریز کے اشعار بھی برے نہیں اور خاتمہ بھی قصیدے کے شایان شان ہوتا ہے بلندیِ خیال کی مثالیں او پر پیش کی گئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں وہ پیچھے نہیں۔ انکے قصیدوں میں صرف ایک کمی نظر آتی ہے وہ یہ کہ قصائد کی زبان شاندار نہیں۔ فارسی زبان میں اور اُردو میں بعد کے قصیدہ گو شعرا نے غزل اور قصیدے کی زبان میں خاصا فرق پیدا کیا ہے۔ ولی کے قصیدے غزل ہی کی زبان میں ہیں۔ وہی ترکیبیں، وہی الفاظ اور اکثر وہی خیالات اور طرزِ بیان۔

ماقیٔ آمدہ

نورتن رنگین

ڈاکٹر نیر نگ کے گل چھرّے

رنگین کی کہانی انشاء کی زبانی

جس لطافت سے میر انشاء اللہ خاں انشاء نے اپنے لنگوٹی آشنا میرزا سعادت یار خاں رنگین کا تعارف کرایا ہے، ریختہ نویسوں کا خاکا اڑایا ہے اور ریختی کی ایجاد پر گل افشانی کی ہے، وہ مزے لینے ہی کے لائق نہیں بلکہ چٹخارے بھرتے رہنے کے قابل ہے۔
انشاء نے اپنی اس بڑ میں کسی چھوٹے بڑے کو نہیں چھوڑا۔ ولی ریختہ کے آدم سے لیکر اپنے ہمجولی رنگین تک سب کو خوب صلواتیں سنائی ہیں اور بی نورن اور غفر غبنی کی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ کہ خود پر اور اپنے یار غار پر مزے مزے کی پھبتیاں کسی ہیں۔

فرماتے ہیں "میر انشاء[1] اللہ خاں بیچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پیرزادے تھے۔ ہم بھی گھورنے کو جایا کرتے تھے۔ اب شاعر بن گئے۔ مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرّہ کو نام رکھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا نوری ریختہ آپکو جانتا ہے۔

---

[1] اصل غفر غبنی کے کلام کے لئے دریائے لطافت مطبوعہ مرشد آباد ۱۸۵۰ء کے صفحات ۸۹ - ۹۰ اور دریائے لطافت مطبوعہ لکھنو (انجمن ترقی اردو) کے صفحات ۵۱ - ۵۳ ملاحظہ ہوں۔ یہ اقتباس مرحوم محمد حسین آزاد کی آبحیات سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۹ - ۱۱۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۰ء

رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اسیں باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہئے۔ سارے لوگ دلی کے لکھنو کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں۔[1]

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی   کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اس بیچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم۔ لیکن بیچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا۔ تیغے کا چلانے والا تھا۔ تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور شہدپن[2] جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے۔ تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اسواسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھکر مشتاق ہوں .... بھلا یہ کلام کیا ہے:۔

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو   یہاں لنسے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

[3][ور نچوڑی انگیا اور نگوڑی انگیا اور مڑوڑی انگیا اور] مرد ہو کر یوں کہتا ہے[4]۔ ع

کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں

اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جیسیں اوپر والیاں (چیلیں) اوپر والا (چاند)، اجلی (دھوبن)[اندر والا (دل) اور دوگانا، سہ گانا، یگانا، زناخی، الائچی، (دوست)]"[5]

انشاء کی اس ستم ظریفی کے صدقے، رنگین کا کچا چٹھا کھل گیا۔ ان کے دل کی بھڑاس نکلی ہمارا کام نکلا۔ گو انشاء نے ریختہ کو بعد میں خوب چمکایا، مگر رنگین کی ریختی کے مقابل میں فی الوقت ہار مان لی۔

---

[1] اصل میں وہاں "نکھنے" یعنے رکھنے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ تصحیح آزاد مرحوم نے کی ہے۔ [2] "گھنائی پن" اصل میں۔ .... [3] قلابون میں کی عبارت اصل سے اضافہ کی گئی ہے۔ [4] "کہے" اصل میں۔

[5] ان زنانی اصطلاحات اور بیگماتی محاورات کی تشریح و تفصیل کے لئے مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون رسالہ اردو میں ملاحظہ ہو۔ جلد دوم حصہ ہفتم بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء صفحات ۶۳۰ - ۶۴۲۔

اسکے علاوہ رنگین کی رنگینی اور شگفتگی کا راز ہمارے ہاتھ لگ گیا اور ریختی کی ٹوہ لگ گئی۔ اردوئے معلّےٰ یا محلات کی زبان بے پردہ ہمارے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور رنگین کی بدولت صنف نازک کے نفسیات لسانی کا پتہ بھی چل گیا۔

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ بانو نہیں انشاؔ ہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

رنگین کی رنگرلیاں اس تمہید کے بعد ہم حیات رنگین کی بوقلمونیوں کے جلوے دکھائیں گے۔ اور اصلی واقعات جو خود رنگین نے اپنے فارسی دیباچۂ دیوان ریختہ' اردو دیباچۂ دیوان بیختہ اور دیگر تصانیف میں لکھے ہیں ہدیہ ناظرین کریں گے۔ رنگین کے والد طہماسپ بیگ خاں انگنے سے ایک سال پہلے نادر شاہ درانی کی فوج میں لپٹے لپیٹے توران سے ہندوستان ۱۱۵۲ھ میں جھپٹے۔ بقول "گل رعنا"[1] چندروز لاہور میں نواب حسین الملک میر منور خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اسکے بعد دلّی میں نواب ضابطہ خاں اور نواب نجف خاں وغیرہ امرائے دربار کے ساتھ نوبت بنوبت آسودگی سے زندگی بسر کی" اس طرح مغلیہ دربار میں ہفت ہزاری منصب اور محکم الدّولہ اعتقاد جنگ کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

اس عالم میں سب سے پہلی شوخی جو رنگین نے دکھائی وہ سرہند میں ۱۱۶۹ھ میں شکم مادر سے سر نکالنا تھا۔ ان کے ایک اور بھائی آلہ یار بیگ خاں بھی تھے۔ باپ نے ان دونوں ہونہاروں کو بڑے چاؤ چوچلے سے تعلیم دی۔ شہسواری' تیراندازی غرض ہر ایک فوجی کمال میں ان کو چاق و چوبند کیا۔ سعادت یار خاں کی تربیت تو رزم آرائی کے لئے ہوئی تھی مگر فطرت کو کیا کریں کہ وہ سخت بزم آرا واقع ہوی تھی۔ دست و بازو تو سپاہگری کے مشتاق تھے مگر دہیان شعر و سخن میں لگا ہوا تھا۔ غرض یہ رنگیلا پندرہ سال کی عمر سے گل کھلانے لگا۔ اور ظہور علی شاہ حاتم کے آگے دلی میں زانوادب تہ کیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو دیوان ہند کے ہندوستانی قلمی نسخوں کی فہرست مرتبہ جے۔ اف۔ بلوم ہارڈٹ ۱۹۲۶ء صفحات ۹۴-۱۱۴۔

[2] مصنفہ حکیم سید عبدالحی مرحوم مطبوعہ اعظم گڈہ ۱۳۶۳ھ صفحات ۲۶۴-۲۶۹۔

مشق سخن کی۔ اور وہ رنگ چڑھا کہ چند ہی دنوں میں رنگینی طبع، نازک خیالی، طرز آفرینی میں اپنے زبردست ہمعصر بھی بیرنگ نظر آنے لگے۔ یہ سترہ سال کی کاوش اس طرح رنگ لائی۔ کہ ۱۲۰۲ھ میں دیوان ریختہ ہو کر ٹپکی۔

اس عرصہ میں صرف رنگین کا قلم ہی رنگ آمیزی نہیں کرتا تھا بلکہ عہدہ کی خاطر گاہے ماہے ان کی تیغ کو بھی خونریزی پر آمادہ ہو جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ جس وقت شاہان مغلیہ اور مادھوجی سندھیا کے درمیان چھڑی نواب مرزا اسمٰعیل بیگ خاں مقابلہ کے لئے میدان میں اترے۔ ہمراہ رکاب رنگین بھی تھے۔ پٹن پر لڑائی ٹھنی۔ مرہٹوں نے رنگ بھنگ کر دیا۔ مغلیہ فوج تتر بتر ہوگئی رنگین کا سرمایہ ہنر "دیوان ریختہ" بھی نذر عدو ہوا۔ رنگین فوت ہوگئے۔ اپنے "جنگ نامہ" کو اپنے زخموں سے رنگ دیا ہے۔ نواب نے گجرات میں پناہ لی۔ یہ دو سال تک گوالیار کے دربار میں رنگ جمائے رہے۔ مگر لکھنو کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ شہزادہ میرزا سلیمان شکوہ شہنشاہ شاہ عالم کے بیٹے کے دربار کا رنگ دیکھنا تھا سو دیکھ لیا۔ "اخبار رنگین" میں انہی واقعات سے رنگ نکھرا ہے۔ ان کی زندگی کے یہ نو سال گویا نورتن تھے۔ شاہی خزانہ پر ان کا ہاتھ پڑا اور اس بیچارے کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر یہ خوب رنگ رلیاں مناتے رہے۔ گھوڑے اڑاتے رہے۔ ابھی تک ان کا "فرس نامہ" (۱۲۱۰ھ) گواہی کے لئے موجود ہے۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۲۱۲ھ میں رنگین مرشدآباد پہنچے۔ یہاں انکا رنگ نکھرنے نہ پایا۔ گوالیار لوٹے اور کھنڈوجی مرہٹہ سردار کی فوج میں کمان حاصل کی۔ اور یہاں بھی تحصیلات اراضی سے ان کے ہاتھ رنگین رہے۔

نورتن رنگین رنگین کی شاعری یہاں رنگ پر آئی اور "نورتن" کو یہیں مرصع ہونا تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں پہلا رتن "دیوان ریختہ" "نورتن" میں جڑا گیا۔ ایک سال بعد ہی دوسرے نگ کی تلاش میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ اس کا نام "دیوان بیختہ" رکھکر انھوں نے اسکو اپنے نورتن میں ۱۲۲۰ھ میں جما ہی دیا۔ اسطرح رنگین کی عمر کے چھ شہپارے گوالیار میں گذر چکے تھے۔ اب انھیں ترک ملازمت

اور سیر و سیاحت کی سوجھی۔ شاعری کا رنگ پکا ہوتا گیا۔ میر افضل علی خاں نیاز کے ہمراہ کلکتہ پہنچے۔ اور تیسرا جواہر پارہ یہیں ان کے ہاتھ لگا۔ اس کو "دیوان آمیختہ" سے نامزد کر کے جھٹ سے اپنے نورتن میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک اور دُرِّ یتیم خاص طور پر ان کے نصیب میں آیا۔ وہ ان کی غزلیات کا دیوان تھا۔ "دیوان انگیختہ" یا "دیوان ریختی" جس کی کہانی آپ نے انشاء کی زبانی سنی ہے، وہ یہی ہے۔ یہ "نورتن" کا چوتھا رتن بنا۔ اور ان چار دیوانوں کو رنگین نے "چہار عنصر رنگین" کا لقب بخشا۔ دلی و لکھنو کے سوا رنگین ایران سے بھی کچھ تارے توڑ لائے تھے سنہ ۱۲۳۱ھ میں ان کو جوڑ کر "حدیقۂ رنگین" بنا دیا۔ یہ نورتن کا پانچواں نگینہ تھا۔ جوں جوں یہ جواہر ریزے رنگین کے کلام کے خزانے میں بھرتے جاتے تھے ان کی امنگیں بڑھتی جاتی تھیں۔ طبیعت پر رنگینی چھاتی جاتی تھی۔ انہوں نے اس مجموعہ کو "خمسہ رنگین" کا خطاب دیا۔ پھر اپنے نو لکھے ہار کو پورا کرنے کی دھن میں لگ گئے ان کی بلبل قلم سترہ زبانوں میں بولیاں بولنے لگی۔ سنہ ۱۲۳۵ھ میں اس رنگا رنگ کی بولیوں کے گلدستہ کا نام رنگین نے "مجموعہ رنگین" رکھا۔ اور اسکو بھی اپنے نورتن میں پچی کر دیا۔ ان چھ دیوانوں کو چھوڑ کر سیانوں کے ساتھ دل لگایا۔ اپنے دستار بدل بھائیوں کی پرانی فرمائشوں کو پورا کیا۔ جو صحبتیں شعرا اور امراء کی اٹھائی تھیں ان کو نثر میں قلمبند کیا۔ دلی، سہارنپور، فیروزپور، لکھنو، الہ آباد، کلکتہ، ڈھاکہ کی مجلسوں کی یاد تازہ کی۔ اور مجالس رنگین قائم کیں۔ اس کے بعد کچھ آپ بیتی بھی کہنی تھی، کچھ زمانہ کی طوطا چشمی بھی دکھانی تھی اس لئے اخبار رنگین بھی سینہ کے داغ کی صورت میں نمایاں ہو گئے۔ "مجالس رنگین" کو "اخبار رنگین" کی نثر کی لڑی میں پرو کر "ہشت بہشت رنگین" کا ہار بنایا۔ اور پھر جو جوش جنوں ہوا اور فن دانی کی سر میں سمائی تو خود کو شاعری کی کسوٹی پر کس کے "امتحان رنگین" کا نتیجہ دکھلایا۔ یہیں شاعر، استاد، ملک الشعرا اور علامہ سب کو نوازا۔ اور وہ خود سرائی کی کہ آسمان شاعری کی نظم پروین بکھر گئی۔ مگر انہوں نے سب کو اپنے نورتن کے سر چیپ دیا۔ "قلمبند شد نورتن" ہاتف نے تاریخ کہی۔

(باقی عند التلاقی)

ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی

(از جناب شیخ چاند صاحب۔ متعلم سینئر بی۔ اے)

دکن کا مشہور جید مصنف اور علم پرور فرمانروا سالباہن آٹھ سو سال قبل ابدیت کی گہری نیند سو رہا تھا۔ مشہور مدبر اور فاضل انشا پرداز ہمیر ٹپت تین سو سال قبل اس جہان ناپائدار سے کوچ کرچکا تھا عوام کو اُبھارنے والا مرہٹی کا جد اعلیٰ ویدانتی مصنف دانیشور سو سال پہلے جسم بدلنے چل بسا تھا۔ غرض دکن میں علم و کمال کی شمع ٹمٹما رہی تھی۔ اور اندیشہ تھا کہ اسکے خاموش ہونے پر کہیں ظلمت نہ چھا جائے کہ اتنے میں حضرت برہان الدین غریب اپنے مرشد کامل حضرت سلطان الاولیا، کے حکم سے سات سو اولوالعزم بزرگوں کے ہمراہ دولت آباد (روضہ) تشریف لائے اور سلطان تغلق نے اپنی مصلحتوں کی بنا، پر دلی کو بے چراغ کرکے دیوگڑھ کو آباد کیا۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا وہ آفتاب جسکی ضیا پاشیوں سے تمام شمالی ہند منور ہو رہا تھا اب ظلمت کدۂ دکن میں انوار گستر ہوا۔ درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کے چشمے دکن کی "سرزمین" میں ابل پڑے[1]۔

اسکے چند ہی دنوں بعد دیوگڑھ حقیقی معنوں میں دولت آباد اور روضہ جنت کا نمونہ ہوگیا تھا۔ شاہی سرپرستی اور امرا، کی قدردانی میں اسکی آبادی، رونق اور چہل پہل بڑھانے میں گوناگوں کوششیں کی گئیں وسیع خوشنما سڑکیں بنائی گئیں۔ فلک رس محلات تعمیر کئے گئے۔ باغات کی بنیاد ڈالی گئی۔ آب رسانی کے لئے تالاب بنوائے گئے۔ میووں کے درخت دور دور سے منگوائے گئے۔ صنعت و حرفت کے کارخانے کھولے گئے۔ صناعوں نے بھی خوب خوب جدتیں کیں۔ اہل قلم نے علم کے دریا بہادئے۔ اور اپنی خامہ فرسائی سے وہ گراں بہا موتی اُگلے کہ علمی دنیا محو حیرت

---

[1] ماخوذ از اورنگ آباد گزیٹیر اور روضتہ الاولیا، تالیف علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ ۱۲

ہوگئی ۔ غرض نہایت ہی قلیل عرصہ میں دولت آباد بام عزت پر جلوہ گر بلند رتبہ پر فائز اور مشہور بلاد اسلامیہ کا ہمسر ہوگیا اور شاید اسی لئے قدسی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ؂

زمین دکن سر بیار د فرود ز فیروزہ زنگی بچرخ کبود[1]

جن محترم و مقدس مآب ہستیوں کی کوشش کی بدولت دکن کا نام زندہ و روشن ہے ان کے احسان سے سبکدوش ہونا ممکن نہیں ۔ ہم ان کے نام اور کام سے خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں ۔ لیکن ہم ان حضرات کا ذکر زیب قرطاس کرتے رہینگے جو سرسوتی کے گود میں پلے جنہوں نے اسکے سایۂ عاطفت میں قلم کے کھلونے سے اپنا دل بہلایا اوروں کو خوش کیا ۔ فائدہ پہنچایا اور اسکے سپوتوں میں عزت پائی ۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے دل و دماغ سے کیا کیا پیدا ہوا ۔ جس قدر معلوم ہے اس پر نازاں ہیں اور تفاخر و خود پسندی کے مزے لوٹنے میں باک نہیں کرتے ۔ لیکن ہم میں سے شاید ہی کوئی اس تلخی خیز تاسف کو محسوس کرے کہ ہماری نااہلی کی وجہ کیا کیا گردش ایام کی نذر ہوگیا ۔

جن ہستیوں نے علم کی جولانگاہ میں اپنے قلم اور دل و دماغ کی قوت صرف کردی ان کی فہرست سے آج ہم ملک العلما ، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا نام انتخاب کرتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ان کے ذکر سے ہمارا خون حمیت جوش زن ہو اور ہم اپنے اسلاف کے نام اور کام باقی رکھنے کی کوشش کریں ؂

نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت یادگار

شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر ، ان کی اصل غزنین سے ہے یہ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی ، ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی ۔ شوق علم میں انہوں نے دلی کا سفر کیا دلی اس وقت منتخب بلاد میں شمار ہوتی تھی ۔ ہر فن کے باکمال لوگ یہاں جمع تھے ۔ سید شرف الدین کیتھلی مولانا تاج الدین بہادر مولانا خواجگی حضرت قاضی عبدالمقتدر ۔ قاضی شہاب الدین کے ہموطن سید گیسو دراز جیسے جید علماء کا جمگھٹا تھا ۔ تحصیل علم کمال کی تشنگی یہیں بجھ سکتی تھی ۔ قاضی شہاب کو علم کی سچی لگن تھی وہ دھن کے پکے تھے ۔ وہ دلی پہونچے اور وہاں مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے ۔ ان کی شاگردی میں علوم رسمی حاصل کئے ۔

---

[1] ماخوذ از روضۃ الاولیاء ۔ ۱۲

اور اس انہماک اور تندہی سے تحصیل کی کہ چند ہی دنوں میں اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔ قاضی عبدالمقتدر قاضی شہاب کے اس غیر معمولی طلب اور شوق پر فرمایا کرتے تھے "بیش من طالب علمی آید کہ پوست او علم است و استخوان او علم است" اس جملہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ کس شان کے طالب علم تھے۔ قاضی شہاب کو دلی کے بلند پایہ علماء کی صحبت نصیب ہوئی وہ وہاں عرصہ تک رہے اور کبھی راہ طلب سے قدم نہیں ہٹایا۔ ان کے ارادے اور ولولے وہاں بار ور ہوئے۔ اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب ان کو اپنے علم و فضل کی داد ملتی ہے[1]۔

جس وقت یہ خبریں (رویائے حضرت گیسو دراز) نہایت گرمی کے ساتھ گشت کر رہی تھیں کہ صاحبقران امیر تیمور دلی پر لشکر آرا ہونے والا ہے اور اس کی فوجیں شہر کو خراب و برباد کرنیوالی ہیں تو مولانا خواجگی نے بہ سنگر دلی کو خیرباد کہا۔ قاضی شہاب بھی اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمرکاب ہوئے مولانا نے کالپی میں اقامت کی اور یہ جونپور رسد ہارے۔ (۸۰۱ھ)[2]۔ جونپور اس وقت ایک حکومت کے صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ محمود شاہ تغلق کی مسند آرائی کے وقت (۷۹۶ھ ۱۳۹۴ء) ایک خواجہ سرا کو "ملک المشرق" کا لقب دیکر جونپور بھیجا گیا کہ دوآبہ کو شورشوں کا انسداد کرے۔ اس نے صدر حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور خودمختار حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً سو برس تک قائم رہی۔ اس سلسلہ کے بادشاہ شرقی کہلاتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو صرف وہاں کے آثار قدیمہ تک محدود کرنا کوتاہ نظری ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کو دیکھکر سلاطین شرقیہ کی عظمت و جلالت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ "لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اودھ سے جونپور تک سارے ملک کو ارباب علم و فضل سے معمور کردیا۔ تعلیم کا سب سے بڑا مرکز خاص شہر جونپور رہتا۔ لیکن صدہا علماء اور مشائخ کو دیہات بطریق جاگیر دیدیے گئے تھے کہ وہ اور ان کے شاگرد اطمینان سے وہاں رہکر علمی مشاغل میں اپنی زندگی بسر کریں۔ اہل علم کی بستیاں اور نوآبادیاں تھیں کہ جسکی وجہ سے شاہجہاں جیسا عالی نظر بادشاہ ان علاقوں پر فخر کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ "پورب شیراز ماست"۔

---

[1] فرشتہ، مآثر الکرام، ریاض الاولیاء تالیف بختاور خاں عالمگیری مصنف مرأۃ العالم (متوفی ۱۰۹۶ھ ہجری مدفون احمدنگر) ۱۲

[2] مآثر الکرام۔ ۱۲

اور آج بھی جبکہ مشرقی علوم کی کساد بازاری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور علماء کے قدیم خاندان کس مپرسی کی بدولت تباہ و شکستہ حال ہیں "پورب یعنی قدیم سلطنت مشرقی" قصبات مردم خیزی میں ضرب المثل ہے۔ جہاں اس دور رفتہ میں اسلامی علماء آکر آباد ہوئے تھے" [1]

القصہ اس وقت شرقی خاندان کے مشہور علم پرور اور ہر دلعزیز حکمران سلطان ابراہیم کے ہاتھ میں عنان حکومت تھی۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سُنکر فرط مسرت سے بیخود ہو گیا۔ آپ کی تعظیم و توقیر کی۔ ہر وقت آپ کی رضا جوئی میں سرگرم رہتا تھا۔ متبرک ایام میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان میں وہ خلوص دل سے شریک ہوتا۔ ایک مرتبہ قاضی شہاب بیمار ہو گئے۔ سلطان انکی عیادت کو گیا اور محبت آمیز لہجہ میں حال پوچھنے کے بعد ایک قدح کو پانی سے لبریز کر دیا اور سر سے وار کے نوش کیا اور دُعا کی "کوئی ایسا لطیفۂ غیبی ہو کہ قاضی شہاب کی بری قسمت میری اچھی قسمت سے بدل جائے اور جو مصیبت ان کو برداشت کرنی پڑرہی ہے وہ مجھے بھگتنی پڑے" [2]

سلطان ابراہیم کے دربار میں اور کئی علماء تھے لیکن قاضی شہاب کے علم و فضل کے آگے پیش نہیں گئی۔ سلطان نے ان کو ملک العلماء کا خطاب دیا۔ اس قدر دانی کو دیکھکر حاسدوں کے سینوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ قاضی موصوف نے مولانا خواجگی سے ایک خط میں اس معاملہ کو آشکار کیا۔ مولانا نے سعدی کے یہ دو شعر جواب میں لکھ بھیجے ؎

اے پیش کہ آید در قلم ثنائے تو ‏ ‏ واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے در بقاء عمر تو نفع جہانیاں ‏ ‏ باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو

کہتے ہیں کہ حاسدوں کی ایک خاصی جماعت ہو گئی تھی جو ان کے اخیر دم تک رہی [3]

انہوں نے ہمیشہ طالب علمانہ گذاری اور اخیر دم تک یہی شغل رکھا۔ وہ شہید علم ہندوستان کے مشہور اور بلند پایہ عالموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تصانیف کی بدولت شہرت کے پروں پر اڑے۔ انکی شہرت

---

[1] تاریخ ہند جلد دوم سلسلۂ جامعۂ عثمانیہ۔ ۱۲

[2] فرشتہ۔ ۱۲

[3] مآثر الکرام۔ ۱۲

نہ صرف ہندوستان کی چار دیواری تک محدود رہی بلکہ بلاد عرب و عجم کا ہر پڑھا لکھا شخص ان کے نام سے آشنا تھا۔ اس زمانہ میں ممالک اسلامیہ عالی رتبہ علماء و فضلاء کے طفیل میں منور و تجلی یافتہ تھے۔ لیکن جو شہرت و ناموری انہوں نے حاصل کی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی[1] جو کچھ وہ اپنے قلم سے دنیا میں چھوڑ گئے ہیں نہ صرف ان کے نام کو برقرار رکھنے کیلئے کافی ہے بلکہ اس سے ان کے وطن کا نام اسیطرح تاایں ناک رہیگا جس طرح کوہ و نفار قلعہ نے دولت آباد کے نام کو زندہ رکھا۔

ان کے قلم سے مختلف مضامین کی کئی کتابیں نکلیں چند مشہور کتابوں کا ھم ذکر کرتے ہیں۔

(۱) حواشئ کافیہ۔ المعروف بحاشیہ ہندی۔ عربی علم نحو کی مشہور و معروف کتاب پر حواشی ہے۔ اس کا لطیف و متین پیرایہ اپنا عدیل نہیں رکھتا۔ یہ انکے حین حیات ہی میں شہرت عام حاصل کر چکی تھی۔

(۲) ارشاد النحو۔ علم نحو میں ایک رسالہ اسمیں تعبیر کے ضمن میں تمثیل کا التزام رکھا ہے اور بالکل نئے طریقے پر مرتب کیا ہے۔ (اس کا ایک قلمی نسخہ محررہ ۶۸۹ھ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے)

(۳) غایۃ التحقیق۔ شرح کافیہ۔ (کتبخانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے)

(۴) بدیع البیان۔ فن بلاغت پر مسجع عبارت میں لکھی ہے۔

(۵) تیسیر۔ احکام دین و مسائل شرع عام مسلمانوں کے لئے سلیس اور پاکیزہ فارسی میں جمع کئے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے سنہری کاغذ اور چھوٹی تقطیع ہے[2]

(۶) بحر مواج۔ یہ کلام پاک کی تفسیر ہے۔ فارسی زبان میں۔ اسکی کئی جلدیں ہیں قاضی شہاب نے اسکے دیباچہ میں اس جگر کاوی اور دماغ سوزی کا ذکر کیا ہے جس سے ان کو اس مہتم بالشان تفسیر کی تکمیل میں کام لینا پڑا۔ کئی مستند تفسیروں اور مشہور کتابوں کے گہرے مطالعہ اور ان پر ناقدانہ اور مبصرانہ نظر ڈالنے کے بعد پوری کیگئی[3] اس تفسیر کو تذکرہ نویس ان کا "شہ پارہ" سمجھتے ہیں (کتبخانہ آصفیہ میں اسکی قلمی جلدیں موجود ہیں)

---

[1] ماثر الکرام۔ ۱۲

[2] فقہ حنفی نمبر (۳۴۴) کتبخانہ آصفیہ۔ ۱۲

[3] ربع اول کتب خانہ آصفیہ ۱۲

(۷) رسالہ در تقسیم علوم و ضائع۔

(۸) فتاویٰ ابراہیم شاہی۔

(۹) مناقب السادات (کتبخانہ آصفیہ)

(۱۰) قصیدہ بانت سعاد پر ایک طویل شرح، یہ شرح دائرۃ المعارف نظامیہ حیدرآباد دکن کے مطبع میں چھپ چکی ہے۔

ان کے علاوہ عربی و فارسی کے مختلف رسالے اور کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔

نواب بختاور خاں عالمگیری اپنی ریاض الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ قاضی شہاب فکر شعر بھی فرماتے تھے لیکن کسی دیوان وغیرہ کی نسبت دیکھا یا سنا نہیں۔ البتہ تیسیر الاحکام میں قاضی شہاب نے جابجا قطعے اور اشعار لکھے ہیں۔ ہم کچھ یہاں نقل کرنے کی اجازت چاہتے ہیں ممکن ہے کہ ارباب نظر انہی چند شعروں میں کوئی نکتہ پائیں:۔

ق

ہر کہ در رہِ ادب طلب نکند ... بر بساط شرف طرب نکند

ادب آموز کہ ہمیں خواہی ... تا زمانہ ترا ادب نکند

ق

کارے ز ہر کار گزینی علم ست ... [illegible] کہ زوال آں نہ بینی علم ست

صدرے کہ در و شاد نشینی علم ست ... فخرے کہ بود فخر یقینی علم ست

ق

گر خاک کند گہر کہ گوید کہ مکن ... در آب کند بسکر کہ گوید کہ مکن

و نتواں گفت ازیں باب سخن ... شاید کہ کند بنر کہ گوید کہ مکن[1]

---

[1] تیسیر الاحکام۔ فقہ حنفی نمبر (۴۴۴) کتب خانہ آصفیہ ۱۲

سلطان ابراہیم نے ۸۴۴ھ میں انتقال کیا۔ اسکی وفاتِ حسرت آیات سے عام رعایا کو سخت ملال ہوا۔ اسکے جنازہ کے ساتھ مرد و زن شریک تھے۔

دریغ آں شہنشاہِ صاحبقراں　　جم تاج بخش و مالک ستاں
دریغ آں دگر نیار د زمیں　　بصد قرن شاہی باں دار زمیں

اسکے انتقال سے قاضی شہاب کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے بھی بقول فرشتہ سلطان کا حقِ رفاقت ادا کیا۔ اور اسی سنہ میں جنت سدھارے۔ بعض کہتے ہیں دو سال بعد۔ مآثر الکرام میں علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

"در تاریخ بست و پنجم رجب المرجب سنہ تسع واربعین[۸۴۹] وثمانمایہ بگل گشت فردوس اعلیٰ شتافت"۔

جون پور میں سلطان ابراہیم شرقی کی مسجد (مسجد اٹالہ) کے جنوب میں آپکا مرقد منور ہے۔

بہار کی رات

(از جناب محمد حبیب اللہ صاحب رُشدی - متعلم ایم۔اے)

سفید ابروں کی چلمنوں میں چھپا لیا ہے قمر نے چہرا
نقاب سیمیں کسی نے گویا فضائے عالم پہ ڈال دی ہے
جہاں میں چاروں طرف یہ پھیلا ہوا ہے اک نور کا دھندلکا
بہار کی ابتدا کے دن ہیں ہوا ابھی اٹھلا کے چل رہی ہے
زمانہ سرشار ہو گیا ہے بھری ہے پھولوں کی مے ہوا میں
چھڑا ہے ایسا خموش نغمہ کہ ذرّہ ذرّہ کو وجد آئے
ہے روح کی التجائے مضطر کہ سارے عالم میں پھیل جائے

جو جلوہ افروز بزم نوروز ہے کوئی یہ اُسے سُنا دے
کہ دیکھ باہر ذرا نکل کر عجب ہے پُر کیف تیرا گلشن
سحاب سا ایک بن گیا ہے بکھل گئے ہیں فلک پہ تارے
ترے لئے آج یاسمن نے ستارے اپنے کئے ہیں روشن
زمیں پر موجِ لالہ و گل، فلک پہ ہے موجِ نور ظاہر
فضا میں اک حسن کا سمندر لطیف ہلکورے لے رہا ہے
تو جلد ڈال اس میں اپنی کشتی کہ وقت کتنا گزر گیا ہے

جامع دمشق

از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔اے، ال ال۔بی (عثمانیہ)

مددگار پروفیسر تاریخ۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ

خاندان بنی امیہ میں ولید کا دورِ خلافت نہ صرف وسعت سلطنت کے لحاظ سے بلکہ از روئے ترقیات عامہ بھی تاریخ اسلام کا ایک سنہری زمانہ ہے، یوں تو ترقیات عامہ کی شق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ بہت سی مسجدیں ہیں شفاخانے ہیں نہریں اور کنوئیں ہیں۔ لیکن جامع دمشق اسقدر عظیم الشان چیز ہے کہ اسکی جسقدر تحقیق کیجائے کم ہے موجودہ مستشرقین کا بیان ہے کہ دنیا کے عجائبات میں جامع دمشق کا تیسرا نمبر ہے تمام مسلمان مورخ اسلامی دنیا کی مشہور مساجد خصوصاً مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور بیت المقدس کی مسجدوں میں جامع دمشق کو پہلی جگہ دیتے ہیں اور اسکو فنِ عمارت کا کرشمہ سمجھتے ہیں یعقوبی جسنے اپنی تاریخ ۸۹۱ء میں لکھی ہے کہتا ہے کہ جامع دمشق مسلمانوں کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ اور اسیطرح اصطخری اور مقدسی جنکی تاریخیں ۹۵۱ء اور ۹۸۵ء کی ہیں جامع دمشق کو بہت سراہتے ہیں۔ مقریزی لکھتا ہے کہ جامع دمشق جنت کا ایک محل ہے۔ خلیفہ مہدی اور مامون عباسی نے اس مسجد کو دیکھکر یہ کہا تھا کہ یہ عمارت دنیا میں بالکل انوکھی اور حیرت انگیز ہے۔ عباسی حکمرانوں کی یہ داد جامع دمشق کے لئے ایک سند ہے۔ عباسی حکمران امویوں سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ان سے کسی داد کی امید نہ تھی۔ تاہم انہوں نے اس عمارت کی دل کھول کر داد دی۔ مسعودی اور ابن فقیہ کے بیان کے مطابق آٹھ سال کی لگاتار عرق ریزی کے بعد یہ مسجد پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ چنانچہ ۷۰۶ء میں اسکی داغ بیل ڈالی گئی اور ۷۱۴ء میں یہ کام پورا ہوا۔ مصارف کی نسبت ایک روایت ہے کہ تمام سلطنت کا سات سال کا لگان اسمیں صرف ہوا لیکن دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف خلیفہ کی ذاتی آمدنی اس پر صرف لگگئی۔ جب اسکی تعمیر سے عوام میں بےچینی پھیلنے لگی کہ ملک کا روپیہ آرائش میں رائگاں جارہا ہے تو خلیفہ نے اسکی تردید کی

اور ثابت کیا کہ سب کچھ اسکی ذاتی آمدنی ہے۔ جسیں ملک کی آمدنی بالکل داخل نہیں۔ تاہم اس پہلی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ضرور ایک ان گنت رقم لگائی گئی ہے کیونکہ اس روایت کے غالبًا یہ معنی ہوں گے کہ گو کل کی کل لاگت خلیفہ کی ذاتی آمدنی تھی لیکن یہ سلطنت کے سات سال کے لگان کے برابر تھی۔ حالانکہ جیسا بعد کو معلوم ہوگا اسکی تعمیر کیلئے بہت سا مسالہ باہر سے منگوایا گیا اور بہت سا بطور تحفہ حاصل ہوا تھا اور اسکے سوا قدیم عمارت کے بھی بہت کچھ حصے جوں کے توں چھوڑ دئے گئے۔ جب اسکے باوجود اسقدر روپیہ صرف ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ تمام کی تمام لاگت آرائش اور زیبائش کے نذر ہوئی۔ چنانچہ سونا اور قیمتی پتھر اس کثرت سے استعمال کیا گیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ عرب مورخ کہتے ہیں کہ چند رومی سیاح اسکے دیکھنے کیلئے آئے اور اسکو دیکھکر مبہوت ہو گئے۔

جن معماروں کا اس تعمیر میں حصہ تھا وہ مختلف مقامات سے بلائے گئے تھے۔ اگرچہ ان معماروں کے متعلق تحقیق ذرا مشکل ہے تاہم مقدسی کہتا ہے کہ یہ معمار ایران۔ ہندوستان۔ مشرقی افریقہ یعنے حبشہ۔ تونس۔ الجزائر سے بلائے گئے تھے۔ بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ مصر کے قبطی معمار کیوں نہیں بلائے گئے حالانکہ یہ لوگ قدیم زمانہ سے فن تعمیر کے استاد مانے گئے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ امیر معاویہ نے مسجد حرام کی تعمیر میں اور عبد الملک نے مسجد اقصٰی کی تعمیر میں ان لوگوں سے کوئی مدد نہیں لی جس سے پتہ چلتا ہے کہ قبطیوں کی معماری کے صرف افسانے ہی افسانے رہ گئے تھے لیکن ایران اور ہندوستان کے معماروں کا ذکر بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بلکہ اس سے بیشتر ہی یہاں کی معماری دھندلی پڑ گئی تھی اور اہل کمال باقی نہیں رہے تھے۔ ابن جبیر۔ ابن بطوطہ۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ سے (۱۲۰۰) معمار بلائے گئے تھے۔ اس بیان کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ اصل میں سیاسی دباو اور زبردستی کا نتیجہ تھا۔ ولید کے دور میں مسلمانوں کی زبردست پھیلنے والی طاقت اپنے ہمسایہ سلطنتوں پر ضرور اثر رکھتی ہوگی اور عجب نہیں کہ بزنطینی حکمراں کی جانب سے جو خاطر خواہ سربراہی ہوئی وہ اسی دباؤ سے ہوئی ہو۔ اسنے نہ صرف قسطنطنیہ کے بلکہ اپنی تمام ماتحت قلمرو یعنے فلسطین اور اطالیہ کے معمار بھی روانہ کئے تھے۔ اسقدر غیر معمولی کوشش اور گرمجوشی کے ساتھ دنیا کی یہ عجیب و غریب عمارت کھڑی کر دی گئی۔ اور ولید کے دور میں جسطرح اندلس۔ ترکستان اور سندہ کی فتوحات کی داستانیں زبان زد عوام تھیں اس سے زیادہ جامع دمشق کا ذکر بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ اسکی رونق اسکی گلکاری اور چمک دمک

ہر طرف چرچے تھے لیکن افسوس ہے کہ ایسی بے نظیر عمارت جس سے مسلمانوں کو طغرائے امتیاز حاصل تھا کئی دفعہ آگ کے نذر ہوئی چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۳ء کی آگ نے اسکو بالکل تباہ کر ڈالا۔ اسکے بعد ہمیشہ اسکی ترمیمیں ہوتی رہیں لیکن اسکی تعمیری اور تاریخی دلچسپی باقی نہ رہ سکی۔

جامع دمشق کیلئے کوئی نئی اور الگ تھلگ جگہ نہیں اختیار کی گئی۔ بلکہ اسکی بنیاد ایک تاریخی مقام پر ڈالی گئی جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ رومیوں کے زمانے سے پہلے یہاں ایک مندر بنا ہوا تھا جو سورج یا مشتری کے دیوتا سے منسوب تھا۔ یہ ضروری ہے کہ اسکا تعلق سائیزیکس (Cyzicus) کے انطیوکس (Antiochus) کی سلطنت سے ہوگا۔ یا اگر رومیوں کے زمانہ میں اسکی بنا مانی جائے تو یہ مندر پہلی یا دوسری صدی عیسوی سے متعلق ہوگا تھیوڈوسس نے (۳۷۰ - ۳۹۵) یا آرکیڈیس نے (۳۹۵ - ۴۰۸) یا تھیوڈوسس ثانی نے (۴۰۸ - ۴۵۰) اس مندر کو کلیسا میں بدل دیا۔ جب مسلمانوں نے ۶۳۶ء میں دمشق فتح کیا تو انہوں نے اس کلیسا کے دو حصے کر دئے آدھا کلیسا رہا اور آدھا مسجد میں بدل دیا گیا۔ لیکن ۸۸ھ یا ۷۰۶ء میں اسکی بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ اسی سنہ میں ولید کے حکم سے جامع دمشق کے ساتھ ترقیات عامہ کی ایک برقی رو تمام ملک میں دوڑ گئی۔ چونکہ دمشق میں ایک مرکزی مسجد کی ضرورت تھی اور اسکے لئے شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے یہی الگ جگہ موزوں تھی جس پر قدیم زمانے سے کلیسا قائم تھا۔ اسلئے مسلمانوں نے عیسائیوں سے باقی آدھا حصہ بھی لے لیا۔ اور اس کل عمارت کو ڈھاکر ولید نے اسکی جگہ پر عظیم الشان جامع دمشق کی بنیاد رکھی۔

اسکا مختصر خاکہ یہ ہے یہ ایک مستطیل شکل کے رقبہ میں واقع ہے اور یہ رقبہ ۵۳۰ فٹ طول اور ۳۲۰ فٹ عرض کی وسعت رکھتا ہے اور چار دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور چاروں طرف ہر گوشہ پر چار برج ہیں اس رقبہ کے نصف حصہ پر مسجد کی عمارت ہے جس میں نماز ہوتی ہے اور باقی نصف صحن میں داخل ہے۔ صحن میں آمد و رفت کے جو راستے ہیں انپر سائبان ہے اور نماز گاہ کا رقبہ تین ۳ ہمعرض مشرقی اور جنوبی سمت والے منطقوں پر منقسم ہے۔ اور ان کو ایک کھڑا منطقہ دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور ہر آدھا حصہ گیارہ کمانوں پر منقسم ہے۔ یہ کمان ایسے ستونوں پر قائم ہیں جن کا قیام استوانوں پر ہے۔ لیکن انکے اوپر ایک اور طبقہ کمانوں کا ہے جو پست ستونوں پر قائم ہیں اور یہی ستون چھت کو بھی سہارتے ہیں۔ قبلہ رو درمیانی حصہ میں چار محراب دار ستون ہیں جو مرکزی

گنبد کو تھامے ہوئے ہیں۔ یہ قبہ ہشت پہلو ہے اور چاروں طرف سے دریچوں کے ذریعے اسمیں روشنی آتی ہے اس قبہ کے دونوں پہلوؤں پر جو سقف ہیں وہ مسطح ہیں۔ ۱۸۹۳ء کی آتش زدگی کے بعد اسمیں تبدیلی ہوئی ہے۔ قبلہ رو حصے تو پہلے کی طرح بنا دئے گئے ہیں لیکن باقی اندرونی حصوں کی صرف ترمیم کر دی گئی۔ قبہ کیبقدر بلند کر دیا گیا۔ تین مینار ہیں دو قبلہ رو دیوار کے گوشوں پر ہیں جو مینار عیسیٰ اور مینار غربیہ کہلاتے ہیں اور ایک مینار العروس مشرقی دروازہ باب العمارہ سے متصل ہے۔ دو اور دروازے شمال اور جنوب پر ہیں۔

جہانتک بیرونی آرائش کا تعلق ہے اسکا اظہار الفاظ سے ناممکن ہے بلکہ دیکھنے والے صرف دیکھکر لطف اٹھا سکتے ہیں تاہم صرف اس قدر لکھا جا سکتا ہے کہ نماز گاہ کی دیواروں پر اندر اور باہر دونوں طرف نہ صرف سنگ مرمر چسپاں ہے بلکہ مختلف رنگ اور سنہری پچہ کاری ہے جسمیں نباتات کی شکلیں دکھلائی گئی ہیں۔ عمارت کے اوپری حصہ پر بھی پچہ کاری تھی جو اب غائب ہے۔ سنہری چھت کے نیچے جسمیں چونے کی آرائش بھی تھی آئینوں کا ایک منطقہ تھا جو سنہری زمین پر تھا۔ محراب دار ستون اور کمان جنکی درمیانی چھت سنہری ہے سب پچہ کاری سے آراستہ تھی۔ قبہ کا اندرونی حصہ سب کا سب سونے سے جگمگاتا ہے اور بیرونی حصہ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سنہری نارنگی رکھی ہوئی ہے اور اس پر ایک سونے کا انار ہے۔ صدر محراب سنہری کام سے جگمگاتا ہے اسکے اطراف سنگ سلیمانی اور دوسرے پتھر جڑے ہوئے ہیں اور اس محراب کے اوپر ایک سونے کی بیل جڑی ہے فرش پر تمام پچہ کاری ہے۔ شمالی دیوار کے تمام دریچے اور کمانیں سنہری جال اور رنگ برنگ کے شیشوں سے آراستہ ہیں۔ صحن کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ دیواریں۔ کمانیں دروازے سب کے سب پچہ کاری سے آراستہ ہیں۔ چھت اور محراب پر نفیس رنگ ہے اور چونے کا پاکیزہ کام ہے۔ دروازوں پر سونے کا کام ہے۔ اور دروازے خاص طور قابل دید ہیں۔ جو آرائش کے بہترین نمونے ہیں۔ اسکا سامنا سنگ مرمر کا اور شکل ہندسی ہے۔ یہاں نہ صرف چونے کا کام ہے بلکہ جالدار دریچے ہیں جن میں رنگین شیشے اور پچہ کاری ہے جسمیں درختوں اور پھولوں کی مختلف شکلیں دکھلائی گئی ہیں۔ مزید براں قبلہ رو حصہ کے شمالی رخ کی پچہ کاری اب بھی باقی رکھی ہے جس میں فن کا کمال دکھلایا گیا ہے صدر محراب جسکو ابن جبیر نے بیان کیا ہے وہ اصلی اور ولید کے زمانہ کا نہیں ہے ۱۸۰۲ء میں جب مسجد کے مختلف حصوں کی ترمیم ہوئی تو محراب کی اصلی حالت میں فرق آگیا۔

چونکہ یہ قدیم عمارت کی قائم مقام ہے اسلئے جامع دمشق کے متعلق ہمیشہ الجھنیں رہتی ہیں کہ آیا اسکی از سر نو بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور اسمیں قدیم عمارت کا کوئی جزو شریک نہیں۔ یا چند ضروری تبدیلیاں کرکے پرانی عمارت نئی کردی گئی۔ یا پرانی عمارت کے ڈھیر کو قائم رکھکر صرف بیرونی آرایش پر اکتفا کیا گیا۔ اس مسئلہ پر شد و مد سے بحثیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ امر ہنوز تشنہ اور بحث طلب ہے۔ مشکل یہ ہے کہ زمانے کے انقلابات اور آتش زدگیوں سے اس مسجد کی صورت اسقدر بدل گئی ہے اور اسمیں وقتاً فوقتاً اتنی ترمیمیں کی گئی ہیں کہ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ مسجد کا کونسا حصہ ولید کے دور میں بنایا گیا اور کونسا حصہ بعد کی ترمیموں کا نتیجہ ہے۔ اس خصوص میں جس قدر بحث و تحقیق ہوتی ہے وہ بیشتر قیاسات کا ایک طومار ہوتا ہے تاہم اسوقت بہت سے ثبوت ایسے موجود ہیں جن سے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جامع دمشق ولید کے دور کی جدید عمارت ہے قدیم عمارت سے اسکو کوئی تعلق نہیں اس قدر ضرور ہے کہ جگہ قدیم ہے اور احاطہ وہی اور اتنا ہی ہے جو مندر اور کلیسا سے گھرا ہوا تھا۔ احاطہ کی شکل بھی مستطیل ہے اور اسکے ساتھ یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ قدیم عمارت کا بہت کچھ مسالہ جدید عمارت میں استعمال کیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ احاطہ کی بیرونی دیواروں کے کچھ ضروری حصّے بھی قدیم عمارت کے ہیں جو جوں کے توں چھوڑ دئے گئے۔ لیکن یہ نظریہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے کہ جامع دمشق اصل میں قدیم کلیسا ہے جس کا ڈھیر تو وہی ہے مگر باہر سے کچھ آرایش کردی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ولید نے اس بات کا بیڑا اٹھایا تھا کہ ایک ایسی عجیب و غریب عمارت کھڑی کرے جو اس زمانہ کے آس پاس کے عظیم الشان کلیساؤں سے کہیں برتر ہو۔ ظاہر ہے کہ کلیسا کو برقرار رکھنے سے یہ آرزو پوری نہیں ہوسکتی تھی اسکے ساتھ مامون عباسی کا قول بھی اس امر کے ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ یہ بالکل انوکھی اور جدید عمارت ہے۔ اگر کلیسا اپنی اصلی حالت میں قائم رکھا جاتا تو وہ کبھی بے نظیر عمارت نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اسکی حالت دیگر مندروں اور کلیساؤں سے بہتر نہیں ہوسکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ مسجد بننے سے پیشتر یہاں ایک کلیسا تھا جو اپنے پیشرو مندروں کا جانشین تھا۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مندر بغیر ترمیم اور تجدید کے کلیسا میں بدل دیا گیا۔ مندر کے متعلق یہ بات بدیہی ہے کہ اسکا رُخ شمال سے جنوب کو ہوگا کبھی اسکے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اسکی ایک نظیر ابتک موجود ہے۔ چنانچہ پامیرا (Pamyra) میں سورج کا مندر ابتک موجود ہے جس کا رُخ شمال سے جنوب کو ہے۔ یعنے صدر عمارت تو شمال کیجانب اور صحن جنوب کیطرف ہے کلیسا میں یہی صورت برقرار رہی کیونکہ کلیسا کیلئے

اس زمانہ میں یہ رُخ نامناسب نہ تھا گو بعد کو عیسائی دنیا میں یہ جدّت ہوئی کہ کلیساؤں کا رُخ مغرب کیطرف پھیرنے لگے لیکن اِس مندر کے متعلّق تو اسکا یقین ہے کہ یہ جوں کا توں رکھا گیا تھا اور تبدیلی کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جہاں تک مسجد کا تعلّق ہے وہ اُسی رُخ پر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ مسجد کا رُخ تو لازمی طور پر جنوب مغرب کی جانب ہونا چاہیئے تاکہ قبلہ کی سمت کا پوری طرح لحاظ رہے۔ اگر قدیم عمارت برقرار رکھی جاتی تو ظاہر ہے کہ وہ مسجد نہیں ہوتی بلکہ کلیسا ہوتا۔ محض ایک رُخ کا سوال ثابت کر دیتا ہے کہ اسکے بدلنے کے لئے از سرِ نو تبدیلی کی ضرورت تھی یا دوسرے الفاظ میں جدید عمارت بنانے کی ضرورت تھی۔ پہلی عمارت کا ڈھیر جدید عمارت میں کام نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ جب کلیسا کے دو حصے ہو گئے تھے یعنے ایک حصہ مسجد بنالیا گیا تو اس وقت اکثر مقامات سے پتہ چلتا تھا کہ یہ دونوں عمارتیں الگ تھیں۔ ضروری ترمیم کے ساتھ مسلمانوں نے رُخ بدلکر کام لیا تھا لیکن جامع دمشق کی سی عظیم الشّان عمارت کے لئے محض ضروری تبدیلی اور ترمیم کافی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ واقعہ بتلاتا ہے کہ مندر کے احاطہ کی جنوبی دیوار میں تین دروازے تھے جو آمد و رفت کا کام دیتے تھے۔ لیکن مسجد بننے کے بعد دروازے مشرقی دیوار میں نصب کئے گئے تاکہ مشرقی دروازے سے سیدھے صحن اور اس کے بعد مسجد میں داخل ہو سکے۔

اس مسجد کے ممتاز اور جدید عنصروں کو سامنے رکھنے سے اسکی جدّت معلوم ہو جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ پہلی عمارت سے بالکل بے نیاز ہے۔ بنانے والے نے اپنے نئے منصوبہ کے مطابق نماز گاہ کے اندر پیہم منطقے بنائے اور اسکے اوپر بیچ میں ایک قبہ بلند کیا۔ اسکے علاوہ نہ صرف نماز گاہ بلکہ تمام صحن کے گرد دو منزلہ محراب دار دیواریں بنائیں جو بالکل نئی ہیں۔ لیکن سب سے بڑھکر نعل نما کمان سب سے پہلے اسی مسجد میں ایجاد کی گئی اور یہ مسجد میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اسکے ساتھ محراب بھی قابل غور ہے۔ اگرچہ محراب کی ابتدا امیر معاویہ نے کی تاہم ولید نے اسکو ترقی دی چنانچہ ولید کے محراب کا ایک نیا انداز ہے۔ نعل نما کمان کے متعلّق فنِ عمارت کے محققین نے شد و مد سے بحثیں کی ہیں اور زمانہ قدیم کی عمارتوں کو سامنے رکھکر اس بات کی تحقیق کی کہ آیا ایسی کمان کا پہلے بھی کوئی وجود تھا۔ اکثروں نے ہندوستان کی عمارتوں میں اسکا سراغ لگانے کی کوشش کی اور بعضوں نے ایران کی قدیم

لہ (Revira's Muslim Architecture)

عمارتوں میں اسکا پتہ چلایا۔ بعضوں نے مصر کی پرانی عمارتوں میں اسکی ٹوہ لگائی۔ مگر موجودہ نظریہ یہ ہے کہ نعل نما کمان اصل میں وزی گاتھی بادشاہوں کی میراث ہے اور سب سے پہلے ہسپانیہ میں ایجاد کیگئی جسے بعد کو سب قوموں سے نے اپنے ہاں لیا۔ لیکن اس تمام تحقیق و جد و جہد کے باوجود، ہیں یہ ماننا پڑیگا کہ اگر یہ کمان یہاں ایجاد نہیں کیگئی تو کم از کم ولید نے یا اُسکے انجنیر زید بن واقد نے جسکے زیر نگرانی مسجد تیار ہوئی سب سے پیشتر نعل نما کمان کو فنِ تعمیر کا ایک جزُ قرار دیا۔

درمیانی قبہ کے متعلّق یہ بھی ثابت ہے کہ یہ بھی ایک نئی چیز ہے جسکی اسی عمارت میں سب سے پہلے ابتدا ہوئی۔ اسکے پیشتر کی جتنی عمارتیں ہیں خواہ وہ مصریوں کی ہوں یا رومیوں کی ان میں ایسا قبہ بالکل نہیں ہے۔ رومی فتح سے پہلے فراعنہ مصر کی عمارتوں کے تمام سقف سپاٹ اور سطح ہیں اور کہیں کہیں کوئی گولائی آگئی ہے تو وہ محض اتفاق سے جو بعض معمولی عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ رومی تقریبًا اس سے ناآشنا تھے ورنہ یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر رومی اس نئی چیز سے واقف ہوتے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور ان کا پایۂ تخت قسطنطنیہ میں منتقل ہونیکے بعد اس نمونہ کو تمام سلطنت میں پھیلا دیتے۔ لیکن اسکی کوئی مثال موجود نہیں۔ ہاں بعد کو قبہ کی ہر جگہ تقلید کیگئی ہے یہی حال اندرونی تین پیہم منطقوں کا ہے۔ اسکی نظیر ضرور ملتی ہے تاہم اس خوبی کے ساتھ سب سے پیشتر یہیں اسکی ابتدا کی گئی۔ محراب کے متعلّق بھی یہ شبہ ہے کہ اسکی کلیسا سے تقلید کیگئی لیکن غور کرلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور ہر مسجد کا ضروری عنصر ہے۔ بہرحال اس مختصر بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جامع دمشق کو قدیم مندر یا کلیسا کا جانشین یا خوشہ چین سمجھنا ایک بے بنیاد خیال ہے۔ بلکہ خود یہ مسلمانوں کی ساخت و ایجاد ہے۔

اُردو زبان اور افسانے

(از جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری متعلم ایم۔ اے' ال ال۔ بی)

جناب سروری صاحب نے فن افسانہ نویسی پر ایک مستقل اور مبسوط کتاب تحریر فرمائی ہے جو زیر طبع ہے۔ یہ مضمون اُس کتاب کا ایک حصّہ ہے۔

(مجلہ)

"قصّہ گوئی مشرق کا خاص فن ہے[1]" رچرڈ برٹن کہتا ہے کہ:۔

"اگر انجیل مقدس کی بعض روایات کو' جن میں تاریخی واقعات ادبی اور تخیلی نزاکتوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں' قصّہ کہہ سکتے ہیں' تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ مشرق کے ریگستانوں میں قصّہ گوئی اُسی وقت باضابطہ شکل اختیار کر چکی تھی' جس وقت دنیا ابھی تحریر سے واقف بھی نہیں تھی......... نثریہ روایات' جن میں رزم و بزم کے واقعات یا مقامی حالات کا ذکر ہوتا تھا' نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آتی تھیں۔ اور حافظے کی مدد سے محفوظ کرلی جاتی تھیں جس قابلیت سے یہ روایات گھڑی جاتی تھیں وہ حقیقت میں ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے[2]"

بہر حال جتنی تحقیقات آجتک ہوئی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ تقدم بلحاظ زمانہ مشرقی افسانوں ہی کو حاصل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ افسانے کی وہ صنف بھی' جسکو ناول کہتے ہیں' اور جو موجودہ یوروپی ادب کی بہترین پیداوار

---

[1] "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" آرٹیکل "ناول" ۱۲

[2] "ماسٹرس آف' دی انگلش ناول" صفحہ ۳۔ اڈیشن (۱۹۰۰) ۱۲۔

بنتی ہے، سب سے پہلے مشرق میں نمودار ہوئی۔ جاپانی ادبیات میں نثریہ افسانوں کا آغاز دسویں صدی کے اوائل میں ہو چکا تھا۔ جاپانی ناول کی موجد ایک قابل عورت مُراساکی نوشکیبن تسلیم کیجاتی ہے۔ جس کا پہلا ناول "گنجی مانو گاتری" "۱۰۰۴ء" میں تصنیف کیا گیا۔ یہ ناول جاپان کے "ادبیات العالیہ" میں شمار کیا جاتا ہے۔ چین کے متعلق یہ معلوم نہو سکا کہ افسانہ نگاری کی ابتداء وہاں کب سے ہوئی؟ لیکن چینی ناول کا وجود تیرہویں صدی میں مسلم ہے۔ لی کوان چینگ' سب سے پہلا چینی ناول نگار ہے۔ جسکے قصے' خونریز جنگوں اور سیاحوں کی مہمات پر مشتمل ہیں۔ چین کے اخلاقی ناولوں کا بہترین نمونہ "دی ٹوائس فلاورنگ پلم ٹری" ہے جسکا سال تصنیف سولہویں یا سترہویں صدی بتلایا جاتا ہے۔ پروفیسر جیلس کہتا ہے کہ چینی ناول نگاری کا معراج کمال "دی ڈریم آف دی ریڈ چیمبر" ہے جو سترہویں صدی کے آخر میں مکمل ہو چکا تھا۔ اسکے مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ چینی معاشرت کے ایسے بے نظیر مرقعے اس میں دستیاب ہوتے ہیں کہ' اس خاص حیثیت سے یہ ناول انگلستان کے مشہور ناول نگار' فیلڈنگ کے ناولوں کا ہم رتبہ تصور کیا جاتا ہے۔

ہندوستان قدیم زمانہ سے' افسانہ نگاری میں' اپنی آپ نظیر ہے۔ اُم الالسنہ یعنے سنسکرت کے ادب کا بیش بہا حصہ منظوم قصوں اور نثریہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اسکے زندہ جاوید کارناموں میں سے "رامائن" مہابھارت کے نیم تاریخی افسانے "ہت اپدیش" (کلیلہ دمنہ) اور "شکنتلا" کے فنی علمی اور اخلاقی قصے آجتک الہامی ادب کے انمول خزانے تصور کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ ہندوستان کی دیگر جدید اور زیادہ تر قدیم زبانوں میں افسانوں کی کثرت ہے۔ اس کثرت کی ایک بڑی وجہ ہندوستان کی ضرب المثل ثروت اور مرفہ الحالی ہے۔ پلاسیو والڈیس نے کسی ملک کے ادب میں افسانوں کی زیادتی کی یہی وجہ بتلائی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک میں فنون لطیفہ کی پیدائش کیطرف اُسیوقت توجہ کیجاتی ہے۔ جب وہاں خوش حالی عام ہوجاتی ہے۔ اور اس ملک کے باشندے اپنی تمام مخالف قوتوں پر غلبہ پاکر' زندگی باطمینان گذارنی شروع کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] مقدمہ دی انٹرنیشنل لائبریری آف فیمس لٹریچر جلد (۲۰) ۱۲

ہندوستان کی قدیم دولت، جو دیگر ممالک کیلئے افسانوں کا مواد فراہم کرتی رہی ہے، خود اہل ملک کو افسانہ گوئی میں محو کئے بغیر نہ رہ سکی۔ قدما ضروریات زندگی سے بے فکر ہوکر، اپنی تمام ذہنی اور دماغی قوتوں کو تخیلی علوم وفنون پر صرف کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں سائنس اور دیگر علوم عملیہ کے بجائے نظری فنون، شاعری، اور افسانہ نگاری کو بے حد ترقی نصیب ہوئی۔ لیکن یہ ترقی بھی ایک حد پر پہنچکر رک گئی۔ اسکے کئی وجوہ ہیں۔ جنکے منجملہ ایک بڑی وجہ وہ تاریخی حالات ہیں۔ جو ہندوستان کیلئے نہایت مضر ثابت ہوئے۔

تاریخ اقوام کا ایک سرسری مطالعہ ہم کو جن حالات کا پتہ دیتا ہے وہ یہ ہیں کہ یونان کے سطح ارض پر ابھرنے تک مشرق اور مغرب راہ ترقی میں دوش بدوش گامزنی کرتے رہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مشرق مغرب کیلئے چراغ ہدایت بنا رہا۔ لیکن مصر اور بابل کے تباہ ہو جانے کے بعد، جب یونانیوں نے مہذب دنیا پر اپنی عظمت کا سکہ جمایا، تو مشرق اپنے ہمقدم سے کوسوں پیچھے رہ گیا تھا مشرق کے ہمت ہارنے کا سبب یہ تھا کہ قدامت پرستی کے احساس نے، مشرقی اقوام کو "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے نمائشی دھوکے میں رکھا۔ انہوں نے اسلاف کے نقش قدم سے سرمو تجاوز کرنے کو نہ صرف غلط راہ روی بلکہ گناہ خیال کیا۔ اسکے برخلاف مغربی اقوام نے اسلاف کے کارناموں پر تنقیدی نظر ڈالی۔ اور انکے متروکے میں سے "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرتے ہوئے، اچھی باتوں کو اخذ کیا۔ اس قسم کی اندھی تقلید کی وجہ سے ہم میں ابن سینا، غزالی، سعدی، کالیداس، میر، اور میر امن جیسے باکمال پھر نہ پیدا ہوسکے۔ اسی لئے مشرقی علوم وفنون میں، بجائے ارتقا اور گوناگونی کے پستی اور ایک قسم کی یکسانیت نظر آتی ہے۔

اردو زبان سے پہلے ہندوستان کی جتنی زبانوں میں بھی افسانے لکھے گئے، ان میں باضابطہ ارتقا کا پتہ نہیں چلتا۔ اسمیں شک نہیں کہ انفرادی کوششوں نے کہیں کہیں ایک آدھ مایہ نازشہ کار پیش کر دیا، لیکن عام طور سے قدیم افسانوی ادب کے سرمایہ کی ترقی منتشر نظر آتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً روس، فرانس خصوصاً انگلستان میں قصہ گوئی کے جذبہ کا اظہار، جو روایت اور کہانیوں کی شکل میں ہوا تھا، منظوم قصوں، حکایتوں، نثریہ افسانوں، اور ڈراما کے مدارج علی التسلسل طے کرتا ہوا، موجودہ ناول کے قالب میں عروج کمال کو پہونچ چکا ہے۔ مغربی ممالک میں ناول نگاری کے فن کے ساتھ، اسکے اصول اور قواعد بھی مدون کرئے گئے ہیں۔ اب

ناول نہ صرف تفریح طبع ۔ بلکہ تہذیب نفس اور تعلیم اخلاق کا بہترین ذریعہ بن گیا ہے ۔ ناول کے ادب کو وہاں اسقدر اہمیت دیجاتی ہے کہ بعض لوگ اسکو ہر قسم کے اہم مسائل علوم و فنون کے سکھانے کا بہترین آسان ترین اور نہایت موثر ذریعہ تصوّر کرتے ہیں ۔ میری کوریلی کے "اکثر ناول مسائل مابعد طبیعات سے بھرے ہوئے ہیں[1] ۔ خارج ایلیٹ نے نہایت فنکارانہ طریقہ سے فرقہ افادیہ کے اعتقادات کی ترجمانی اپنے ناولوں میں کی ہے[2] ۔ روسو' ناولوں کے توسط سے معاشرتی قیود کے خلاف تلقین کرتا ہے[3] ۔ ڈکنز نے ناول ہی کے ذریعہ' فرانس کے ادنیٰ طبقوں کی ناگفتہ بہ حالت کے دکھانے اور لوگوں کو ہمدردی پر اُبھارنے کی کوشش کی ہے[4] ۔

اسمیں شک نہیں کہ اُردو زبان کا نہایت مختصر سرمایہ انگریزی زبان کے وسیع ترین ادب کا مقابلہ تو نہیں کرسکتا ۔ تاہم نہایت سرسری طور پر' اردو افسانوی ادب میں بھی وہ تمام خصوصیات کم و بیش موجود ہیں' جو انگریزی زبان کے افسانوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں ۔ اس سے ہماری مُراد یہ ہے کہ اردو افسانوی ادب بھی تاریخی انقلابات کے انہیں مراحل سے گذرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جن سے انگریزی افسانے گذر چکے ہیں ۔ تحریر میں مقید ہونے کے بعد افسانوں پر سب سے پہلا دور عموماً منظوم قصّوں کا گذرتا ہے ۔ دوسرے دور میں قصّہ گوئی کا جذبہ فوق الفطرت افسانوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ تیسرے دور میں قصّہ' ڈراما کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ۔ چوتھے اور پانچویں دور میں قصّہ علی الترتیب خلاف قیاسی ناول اور فطری اور فنی ناول کی پوشاک میں جلوہ گر ہوتا ہے ۔ قدیم ہندی اُردو قصّہ دار مثنویاں اور خالص اُردو مثنویاں حقیقت میں افسانہ نگاری کے باب کا افتتاح کرتی ہیں ۔ دوسرے دَور میں ہم "باغ و بہار" "آرایش محفل" ۔ "بوستان خیال" ۔ "داستان امیر حمزہ" وغیرہ جیسے فوق الفطرت قصّوں کو شمار کر سکتے ہیں ۔ اُردو افسانوں پر تیسرا دور نہ آسکا وجہ اسکی یہ ہے کہ اُردو زبان زیادہ تر مسلمانوں کی گودی میں پلی تھی ۔ جن کے پاس

---

[1] ملاحظہ ہوں "دو جہاں کی سیر" (ترجمہ) ۱۲

[2] "سیلاس مارنر" ۱۲

[3] ایمیل ۔ ۱۲

[4] "اے ٹیل آف ٹو سیٹیز" ۱۲

نقل وسوانگ مذہباً ممنوع ہیں۔ صرف " اندر سبھا" ہی ایک ایسا قصہ ہے جسکو اردو کی خالص ڈرامائی پیداوار کہہ سکتے ہیں لیکن یہ بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے تنزلی دور کی یادگار ہے۔ آخری دو نو دوروں میں موجودہ مبالغہ آمیز ناول اور فطری وفنی ناول داخل کئے جاسکتے ہیں۔ جو نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔

ابتدائی دور کے افسانے

انگریزی ناول کے عروج کا خاکہ کھینچتے ہوئے' جارج سینٹس بری نے' افسانوں کا آغاز ان قدیم ترین تحریری نظموں سے کیا ہے[1]' جن میں کوئی نہ کوئی قصہ نما واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسکے قول کے مطابق' انگلستان میں' نارمنوں کی فتح انگلستان کے بعد سے پندرھویں صدی تک منظوم افسانوں کا دور دورہ رہا ہے۔ شاہ آرتھر اور اسکے نائٹس[2] (Knights) کے منظوم قصوں اور دیگر اسی صنف کی نظموں کو وہ افسانے کے دور اول میں شمار کرتا ہے۔ اور یہی مناسب بھی ہے جسکی وجوہات ہم ناول کی پیدائش" کے باب میں بیان کرچکے ہیں۔

اسی نظریہ کی رو سے' اگر ہم اردو افسانوں میں تمام منظوم حصّوں کو شامل کرنا مناسب سمجھیں تو اردو شاعری کی کل قصہ دار مثنویاں بھی افسانوی ادب کے دائرہ میں آجائینگی۔ اور اسی اعتبار سے اردو افسانے کی پیدائش اسی تاریخ سے تصور کیجائیگی' جب کہ ہندی کی پہلی قصہ دار مثنوی فارسی بحر میں لکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ اردو شاعری کی ابتدا اسی وقت سے شمار کیجاتی ہے' جبکہ پہلا ہندی شعر فارسی بحر میں موزوں کیا گیا تھا۔ اور یہ سولھویں صدی کا آخری زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ میر تقی میر کی اکثر مثنویاں مثلاً "شعلۂ عشق"۔ "دریائے عشق"۔ "تعریف عشق"۔۔۔ "معاملات عشق" "شوق افغان پسر" وغیرہ درحقیقت منظوم افسانے ہیں۔ جو اردو افسانوں کی تاریخ کا پہلا ورق تصور کئے جاسکتے ہیں "خواب خیال" اور "شعلہ عشق" سے انکی ارتقائی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور مثنوی "سحرالبیان" منظوم افسانہ نگاری کی انتہائے کمال ہے۔

---

[1] "دی انگلش ناول" ۲

[2] آرتھر اگرچہ ایک فسانوی شخصیت ہے لیکن شعرا خصوصاً لارڈ ٹینی سن نے اس کے کردار اور ماحول کی تخلیق کے ذریعے سے سولھویں صدی عیسوی کا نقشہ پیش کردیا ہے۔

اُردو نثر کے آثار یوں تو پانچویں صدی ہجری سے نمودار ہیں۔ لیکن اگر مسلم الثبوت اور مستند تحقیق (یعنے شیخ عین الدین گنج العلم کے زمانے) کی رو سے دیکھا جائے تو اُردو کے نثری افسانے زبان کی حقیقی ابتدا سے بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ اُردو زبان میں سب سے پہلے مذہبی مباحث پر قلم اٹھایا گیا۔ اور آگے چلکر افسانوں کی ابتدا ہوئی تھا تو اس عام اور فطری طور پر نہیں ہوئی' جیسی کہ دوسری زبانوں میں دیکھی جاتی ہے۔ اسکی وجہ ظاہر ہے کہ دنیا کی اکثر زبانیں ایک خاص ملک و قوم کی پیداوار ہیں۔ جیسے جیسے قومیں ترقی کرتی گئیں انکی زبانیں بھی بنتی اور ترقی کرتی گئیں۔ اور جیسے جیسے کسی ملک کے حالات اور مناظر اسکے باشندوں کے دل و دماغ پر مسلط ہوتے گئے افسانے بھی پیدا ہوتے رہے۔ وہی قصے اور کہانیاں جو قوم کے ایام جہالت میں اسکے عام افراد کی زبان پر ہوتی ہیں۔ اصول تحریر سے واقف ہونے کے بعد لکھے جانے شروع ہوئی ہیں اور اسطرح افسانوں کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔

اردو کی ابتدا جس قوم اور جس ملک میں ہوئی وہ دونوں ارتقا کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اسی لئے اُردو افسانوں کی پیدائش اور ارتقا میں وہ عام فطریت اور تسلسل نظر نہیں آتا جسکا نشان دوسری زبانوں میں ملتا ہے۔

جس زمانے میں اُردو زبان پیدا ہو رہی تھی' اسکے پیدا کرنے والوں (یعنے ہندو اور مسلمانوں) کی ذہنیتیں کافی طور پر ترقی کر چکی تھیں اور ارتقا کا وہ اسٹیج گزر چکا تھا' جسمیں افسانے تخلیق پاتے ہیں۔ یہ زمانہ مذہبی اور معاشرتی کشمکش کا تھا۔ ہندوستان کے رہنے والے' مسلمان نوواردوں کی زبان' لباس' اور انکے اکثر رسم و رواج کی دلکشیوں میں محو ہو رہے تھے۔ اور فطرتاً انکی طبیعتیں ان نوواردوں کی طرف بڑھتی تھیں۔ دوسری طرف مسلمان' اس نئے ملک کے رہنے والوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور آپس کی اجنبیت کو دور کرنے میں کوشاں تھے۔ ان دونوں کے ربط اور اتحاد کا نتیجہ ضرور تھا کہ سب سے پہلے ایک مخلوط زبان کی شکل میں پیدا ہوتا چنانچہ یہی ہوا۔ زبان کے بعد جو کام ضروری تھا وہ یہ تھا کہ اسلام اور اسکے متعلقہ خوبیوں سے' ہندوستانی واقف کئے جائیں۔ اسی لئے دسویں صدی ہجری تک جس قدر کارنامے پیش ہوئے ان سب کا موضوع مذہب تھا شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین"۔ "ہدایت نامہ"۔ "ہفت اسرار"

خواجہ صاحب، سید محمد عبداللہ حسینی کا ترجمہ "نشاط العشق" (مصنفہ حضرت محبوب سبحانی) وغیرہ سب کتابیں مذہب ہی سے متعلق تھیں۔ دسویں صدی کے بعد بھی مولانا عبداللہ کی "احکام الصلوٰۃ" میراں یعقوب کا ترجمہ "شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا" سید شاہ محمد قادری کے مسائل "وحدۃ الوجود" اور "قضا و قدر" سید شاہ میر کی "اسرار التوحید" وغیرہ اکثر کتابیں دینیات ہی پر مشتمل ہیں۔ غرض دکن میں پانچویں صدی ہجری سے لیکر بارہویں صدی تک جس قدر تصنیفات ہوئیں ان میں سے شاید ہی کوئی افسانہ کی حیثیت رکھتی ہو۔

شمالی ہند میں مرزا رفیع سودا، سب سے پہلے شخص نظر آتے ہیں جنہوں نے میر تقی کے قصہ "شعلہ عشق" کو نثر میں لکھا۔ اور اسطرح اردو میں نثری افسانہ کی باضابطہ ابتدا ہوئی۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار ضروری ہے، کہ شاعری کی طرح اردو افسانوں کیلئے بھی عربی، فارسی اور ہندی قصوں کے بنے بنائے سانچے مل گئے جن قصوں پر اردو زبان میں پہلے پہل قلم اٹھایا گیا وہ یا تو فارسی قصوں کے ترجمے تھے یا ہندی قصے بجنسہ یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو میں منتقل کر لئے گئے تھے۔ بعض قصے جو نئے سرے سے گھڑے گئے انکے اصلی پلاٹ سرزمین عراق اور عرب میں رکھے گئے ہیں۔ اشخاص قصہ تمام تر فارسی یا ہندی قصوں سے مستعار لئے ہوئے ہیں "باغ و بہار"۔ "آرایش محفل" "توتا کہانی" وغیرہ حقیقت میں اردو زبان میں فارسی یا ہندی قصے ہیں۔ فارسی زبان کا اثر خود ہندی پر بھی اسقدر گہرا پڑا تھا کہ ہندی میں فارسی الفاظ کی آمیزش بے دھڑک ہونے لگی تھی۔ ہندی قصوں کیلئے عربی اور ایرانی اشخاص قصہ کے انتخاب کرنے میں ارباب قلم کو پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مشاہیر بھیم، ارجن، بدھ، بکرماجیت کے بجائے رستم، بہمن، موسیٰ، جمشید، اور نل، دمن، کے بجائے لیلیٰ، مجنوں، شیریں، فرہاد، وغیرہ کے نام اردو زبان میں مرتسم ہو گئے۔ ہندی قصہ نویسوں میں ملک محمد جائسی کا افسانہ "پدماوت" (۱۵۴۰ء) زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ زبان با وجود خالص ہندی ہونے اور مصنف کے مسلمان ہونے کے، اشخاص قصہ، اور واقعات تمام اپنے ہی ملک سے لئے گئے ہیں عرب یا ایران کا کوئی واقعہ درج نہیں کیا گیا ہے۔ متذکرہ بالا حالات پر نظر کرتے، کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب ہندی اور فارسی قصے ترجمے کے ذریعہ اردو زبان میں منتقل ہوئے ہیں، تو ایرانیت کا ایک خاصہ مواد اردو زبان میں جمع ہو گیا ہو۔

اس امر کا تصفیہ بآسانی ممکن نہیں کہ غیر زبانوں کی آمیزش اور تقلید کی وجہ سے کسی زبان کو فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان؟ اور یہ کہ ہندی اور فارسی زبانوں کی تقلید میں اُردو زبان کو فائدہ پہنچا یا نقصان؟ کیونکہ جسطرح دن کے ساتھ رات لازمی ہے، اسیطرح ہر خوبی کے ساتھ اسکے فطری عیوب کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ اُردو شاعری کو جو فوائد اور نقصانات فارسی زبان کی تقلید میں پہونچے ہیں انکا ذکر حالی مرحوم نے نہایت تفصیل کے ساتھ "مقدمۂ شعر و شاعری" میں کیا ہے۔ اب بحث طلب یہ سوال ہے کہ ہندی، عربی اور خصوصاً فارسی افسانوں کی تقلید نے اُردو زبان کو کیا فائدے پہنچائے اور کیا نقصانات؟ حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان، ہندی، عربی اور فارسی کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ جو خدمات ان زبانوں نے اُردو کی، کی ہیں۔ اسکی نظیر ملنی محال ہے کسی زبان کی ترقی کیلئے اور کیا درکار ہے جب لفظیات کا ایک معتدبہ حصہ دوسری زبانوں کی بدولت جمع ہو جائے۔ اور علوم و فنون کیلئے بنے بنائے سانچے میسر آ جائیں؟ یہ کام تو خود اہل زبان کا ہے کہ وہ غیر زبانوں سے سہارا حاصل کرکے، اپنی زبان کی نہایت شاندار عمارت تیار کر دیں۔ جب ان سے یہ نہ ہو سکے بلکہ محض تقلید پر اکتفا کیا جائے اور جو کچھ حاصل ہوا ہے اسی کو غنیمت سمجھ لیا جائے۔ تو یہ چیز زبان کیلئے لامحالہ مضرت رساں ثابت ہوگی۔ دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقلید کی بدولت زبان کی فطری رفتار میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور اسکا اٹھان اسکی فطرت کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اور جب اہل زبان بھی اپج سے عاری ہوں، تو اسکے ایک ہی مرکز پر جم جانے کا خوف ہو سکتا ہے۔ اب تک اُردو زبان کی یہی حالت تھی کہ شاعری اور افسانہ نگاری کو تقلید نے ایک معتدبہ فائدہ پہنچایا۔ مگر چونکہ خود اہل زبان، اپنی طرف سے بہت کم اضافہ کر سکے تھے، اسی لئے بجز تقلید کے دیگر ذرایع مسدود ہوتے دکھائی دیرہے تھے۔ فوق الفطرت افسانے تقریباً تمام کے تمام زیادہ تر فارسی افسانوں کی طرز میں لکھے گئے۔ چونکہ ڈراما، فارسی زبان میں موجود نہ تھا، اسلئے اردو ادب کا ابتدائی حصہ بھی اس عنصر سے خالی رہا۔ ناول کیلئے انگریزی سانچے مہیا ہو گئے۔ غرض شروع سے لیکر آخر تک تقلید کا ایک سلسلہ بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ شاعری اور افسانہ نگاری پر جو مختلف انقلابی دور گذرے ہیں۔ وہ خارجی اثرات کی وجہ سے اسقدر جلد جلد گزرتے چلے گئے کہ اسکی وجہ سے افسانوں کا ارتقائی رشتہ گم بلکہ منقطع نظر آتا ہے۔

تاہم یہ تمام امور اردو افسانوں کو غیر اہم ثابت نہیں کر سکتے۔ جتنی قلیل مدت ہر دور کے افسانوں کی پیدائش پر گذری ہے، اسکے لحاظ سے اردو زبان نے جو کچھ بھی پیش کیا۔ وہ نہایت قابل قدر ہے اور اس لائق ہے کہ انگریزی زبان کے مماثل دور کے بعض اچھے افسانوں کے مقابل کھڑا کیا جائے۔ ہمیں یقین نہیں کہ کسی اردو جیسی کم عمر زبان میں کوئی قصہ "سحر البیان" جیسا فنکارانہ پیش کیا گیا ہو فوق الفطرت افسانوں میں تخیل اور الفناب کے لحاظ سے بعض انگریزی افسانے بھی "باغ و بہار"۔ "داستان امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" کے مشابہ ہیں! ناول نگاری چونکہ انگلستان کا خاص فن ہے۔ اسلئے اردو ناول کسی حال میں بھی انگریزی ناول کا مقابلہ نہیں کر سکتا تاہم اردو ناول نگاری کی رفتار جس سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے، توقع کیجا سکتی ہے کہ اردو ناول بھی انگریزی ناول سے پیچھے نہ رہیگا۔

فورٹ ولیم کالج کی کوششیں اردو زبان میں افسانہ نگاری کی مستقل کوششیں فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم کی مرہون منت ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ داروں کو اردو زبان سیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور انہوں نے اس طرف توجہ کی تو انہیں بہت کم ایسا مواد ہاتھ آیا جو زبان کے سیکھنے کیطرف انہیں شوق کے ساتھ متوجہ کرتا۔ اسوقت کی نثری کتابیں تمام تر پر تکلف اور بناوٹی اردو پر مشتمل تھیں۔ اسمیں شبہ نہیں کہ بول چال میں نہایت سلیس زبان استعمال ہوتی تھی۔ لیکن تصنیف و تالیف کا عام اسلوب پر تکلف تھا۔ جسکے بغیر کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط بھی جاتی تھی۔ سر سید کے زمانے تک یہی حال رہا۔ خود سر سید نے "آثار الصنادید" کو پہلے پہل اسی عام طرز میں لکھوایا تھا۔ اردو زبان کی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے، کمپنی کے عہدہ داروں نے جان گلکرسٹ کی سرکردگی میں دار التصنیف قائم کیا۔ اور ہندوستان سے زباندان عالموں کو جمع کر کے قصے اور کہانیاں پیش کرنیکی فرمائش کی۔ جو لوگ کام پر لگائے گئے تھے ان کو جان گلکرسٹ نے حکم دے رکھا تھا کہ تمام ترجمے اور تصانیف، سادہ اور روزمرہ کی بول چال میں لکھی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں سید محمد حید بخش حیدری نے "توتا کہانی"۔ بہادر علی حسینی نے "نثر بے نظیر"۔ میر امن نے "باغ و بہار"۔ شیر علی افسوس نے "آرائش محفل" اور مظہر علی ولا نے "قصہ مادھونل و کام کندلا" وغیرہ افسانے سادہ اور سلیس زبان میں لکھکر، نہ صرف اردو ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ بلکہ آیندہ اردو نثر

اور افسانہ نگاری کیلئے مستحکم بنیادیں قائم کر دیں۔ فورٹ ولیم کالج سے جتنے قصے پیش کئے گئے ان میں طبعزاد بہت ہی کم تھے۔ تمام قصے فارسی اور ہندی کے ترجمے تھے، یا فارسی اور ہندی قصوں پر مبنی تھے۔ اسی لئے ان زبانوں کے افسانوں کی خوبیوں کے ساتھ وہ تمام نقایص بھی اردو افسانوں میں منتقل ہو گئے، جو اصلی زبان کے افسانوں میں موجود تھے۔

اسمیں شک نہیں کہ دکن میں اردو نثر بہت پہلے مروج ہو چکی تھی۔ لیکن اسکا یقین نہیں کہ جب شمالی ہند میں اردو نثر کیطرف قلم اٹھایا گیا، اسوقت ان نثر نگاروں کے سامنے دکن کی نثر کے نمونے موجود تھے۔ اسلئے اسکو حسنِ اتفاق سمجھنا چاہیئے کہ شمالی ہند میں سلیس نثر نگاری کی مستقل کوششیں افسانوں کی شکل میں پیش ہوئیں فورٹ ولیم کالج کے علما کا اجنبیوں کو زبان سکھانے کیلئے افسانوں کا انتخاب کرنا، نہایت پرمعنی امر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ کہ ہندیوں کو زبان کے سکھانے کا بہترین ذریعہ قصے اور کہانیاں ہیں!

فورٹ ولیم کالج کی پہلی کامیاب کوششوں کے بعد سے ایک نیا باب اردو مصنفین کیلئے کھل گیا بیسیوں قلم قصہ نگاری پر اٹھنے لگے۔ چنانچہ اس دور کی ادبی پیداوار تمام تر قصوں پر مشتمل ہے۔ جو یا تو دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے گئے تھے یا طبعزاد لکھے گئے تھے۔ اس خصوص میں نولکشور کا مطبع نہایت کارآمد ثابت ہوا کہ کلکتے کے بعد عموماً تمام قصے یہیں سے شائع ہوتے رہے۔

انگریزی ناول کی ترویج کے قبل بھی بہت سے افسانے اردو زبان میں "افسانہ"۔ "فسانہ"۔ "قصہ" "کہانی"۔ "حکایت"۔ "طلسم"۔ "داستان" وغیرہ کے نام سے لکھے جا چکے تھے۔ جن میں "باغ و بہار" "فسانہ عجائب"۔ "داستان امیر حمزہ"۔ "توتا کہانی"۔ "بوستان خیال" اور "طلسم ہوشربا" قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام فوق فطری افسانے ہیں۔ ان کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ انکے اشخاص قصہ باستثنائے چند سب کے سب عربی یا ایرانی نژاد ہیں۔ تقریباً تمام پلاٹ بھی سرزمین عرب یا ایران میں رکھے گئے ہیں۔

اردو زبان کے قدیم افسانے، بالکل خیالی اور انسانیات سے عاری ہونیکی وجہ سے ممکن ہے کہ آج لغو نظر آئیں لیکن جو مہتم بالشان خدمت انہوں نے اردو زبان کی انجام دی ہے اسکی قدر آج بھی وہی ہے، جو اس وقت خود

افسانوں کی بھی ان سے نہ صرف زبان کی وسعت میں بیش بہا اضافہ ہوا' بلکہ ان پوشیدہ قابلیتوں کا بھی پتہ چل گیا جو اُردو زبان میں ہر چیز کو ادا کرنے کیلئے موجود تھیں۔

جن تخیلات نے اِن کو پیدا کیا انکا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا پیش کرتے ہیں جو حقائق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ ایک ایسی کائنات ہوتی ہے جس میں پریاں' دیو اور عجیب الخلقت ہستیاں اشخاص قصہ کا کام دیتی ہیں۔ اشخاص قصہ کے خیالی ہونے سے یہ قدیم افسانے کبھی سنجیدہ مذاق کے درجے سے گر نہیں جاتے کیونکہ اگر ایسا ہو تو شکسپیر کے بعض بہترین کارنامے بھی' جن میں فوق الفطرت اشخاص قصہ داخل کئے گئے ہیں' پایۂ اعتبار سے گر جائینگے۔ ان قدیم اُردو افسانوں میں سُقم اسوجہ سے نہیں پیدا کیا جاتا کہ وہ فوق الفطرت ہیں۔ بلکہ اِسلئے کہ وہ خوشی' رنج اور غم اور دیگر احساسات انسانی کو تحریک میں لانیکے قطعی ناقابل ہیں قاری ایں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن یہ دلچسپی اس قسم کی نہیں ہوتی جو ایک انسان کی زندگی کے واقعات میں ہوسکتی ہے۔ انہیں خیالی اشخاص' ایک ایسی فضا میں آزاد چھوڑ دئے گئے ہیں' جس میں صداقت حیات کے قیود کا پتہ تک بھی نہیں ملتا۔ مصنفین نے اپنے توسنِ طبع کی جولانیاں دکھانے کیلئے ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا ہے جسکی ہر ایک شئے ایک طلسمات نظر آتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ایسے تخیلات خوش کن اور بعض وقت دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اسی وقت جبکہ وہ ایک محدود تعداد میں نہایت سلیقہ کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں لیکن جب کہ وہ ہر افسانہ نگار کا مطمح نظر اور مرکز سعی بن جائیں اور اگر ہر افسانہ نگار انکی کورانہ تقلید شروع کردے' تو طبیعت ان سے بیزار ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں آئندہ نسلوں کیلئے افسانہ نگاری کے بے شمار راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص جو ان کو پڑھتا ہے' اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اُردو کے افسانہ نگار' اپنے فن کی خصوصیات اور اصول سے بے بہرہ ہیں۔

اُردو زبان کے ابتدائی دور میں ضخیم نثریہ افسانوں کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد سے مغل بادشاہوں اور شہزادوں پر جو تباہی انکی عیش پرستیوں کی وجہ سے نازل ہوئی' اُس نے اُن کو افسانوں میں محو ہو جانا سکھایا۔ داستان گوئی ایک باضابطہ فن ہو گیا تھا' جسکے پرجوش ماہر ہر امیر کبیر کے دربار میں موجود رہتے تھے۔

داستان گوئی ایک نہایت قدیم فن ہے۔ عربوں اور ایرانیوں میں بھی اسکا رواج تھا۔ عرب داستان کو "سمر" کہتے تھے اور داستان گو سامر کہلاتے تھے۔ کیونکہ چاندنی راتوں میں لوگ جمع ہو کر قصے اور کہانیاں بیان کرتے تھے یہ فن ایرانیوں کے ذریعے ہند میں پہونچا۔ اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں اسکی ترقی عروج کمال کو پہنچ گئی۔ عیش پرست امرا اور بادشاہوں کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ سونے سے پہلے داستان گو قصہ شروع کرتا تاکہ ان کو نیند آجائے۔ داستان گو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور بہت انعام واکرام پاتے رہتے تھے۔ اردو زبان کے ابتدائی دور میں داستان گوئی کے رواج اور اسکی اہمیت نے، اسمیں چند اہم خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔

داستان گوئی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جب داستان گو، کسی منظر کا بیان کرتا ہے، تو اپنی معلومات کے اظہار کی غرض سے، ایک چیز کے سارے متعلقات کا ذکر کر دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ ایک چور کا ذکر کرتا ہے تو چوروں کے تمام اقسام بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اسیطرح خدمت گاروں کے بیان میں ماما، اردا بیگنی، مغلانی، غرض جتنی قسمیں انکی ہو سکتی ہیں۔ سب بیان کر دی جاتی ہیں۔

دوسری خصوصیت داستان گوئی کی، قصہ در قصہ کہنا ہے۔ اسکی غایت یہ نہیں کہ واقعات منظرہ کثرت سے پیدا کر دئے جائیں۔ تاکہ سننے والے کی دلچسپی قائم رہے۔" باغ و بہار" میں مرکزی قصہ خواجہ سگ پرست کا ہے۔ لیکن اسمیں چار درویشوں کے قصے پھر، ملکۂ زیر باد، ملکہ سراندیب، آذر بائیجان کے سوداگر کا قصہ در قصہ بیان ہوتا چلا جاتا ہے۔

تیسری خصوصیت داستان گوئی کی وہ ہے جو افسانہ کو یا تو غیر معمولی یا فوق الفطرت بنا دیتی ہے۔ جب کسی واقعہ کے حل کرنے میں، قصہ گو کو کوئی مشکل پیش آتی ہے۔ تو فطری ذرائع سے کام لینے کے بجائے وہ غیر معمولی اور اتفاقی واقعات سے کام لیتا ہے۔ مثلاً خواجہ سگ پرست جب سولی پر چڑھایا جا رہا تھا۔ تو افسانہ نگار قصہ کو آگے بڑھانے کیلئے اسکو بچانا چاہتا تھا۔ اور یہ کام وہ اسطرح انجام دیتا ہے کہ بادشاہ کے پیٹ میں درد قولنج پیدا ہوتا ہے۔ جسکا علاج خیرات اور اسیروں کی رہائی بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں خواجہ سگ پرست بھی آزاد کر دیا جاتا ہے۔ چاروں درویش جب خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو ایک شخص

غیبؔ سے آکر ان کو بچاتا اور تسلی دیتا ہے۔

قدیم قصوں کا ایک اہم عنصر عشق ہے۔ جو قصے کی دلچسپی کی جان ہے۔ چونکہ ایشیا میں یورپ کیطرح عشق کا اظہار علی الاعلان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسلئے ان قصہ نگاروں نے اسکے اظہار کے تین طریقے نکال لئے (۱) کسی غیر قوم کی عورت پر ہیرو عاشق بنا دیا جاتا ہے۔ (۲) آوارہ عورتوں سے یہ چیز متعلق کر دیجاتی یا (۳) کسی عورت کے حسن کا شہرہ سنکر یا تصویر دیکھکر ہیرو اسپر عاشق ہو جاتا تھا مگر یہ تمام طریقے اظہار عشق کے یا تو ناموزوں ہیں یا خلاف اخلاق و عادت۔ صرف ایک طریقۂ اظہار عشق کا مناسب تھا۔ وہ یہ کہ اعلیٰ طبقہ میں چونکہ پردہ کی رسم نہیں تھی۔ اسلئے ان میں فطرت اور رسم و رواج سے تجاوز کرنے کے بغیر بھی عشق کا اظہار ہو سکتا تھا۔

جب ہیرو کو عاشق بنا دیا جائے اور عاشق و معشوق میں ملاپ ہو جائے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کیلئے ان افسانہ نگاروں نے یہ ترکیب کی کہ معشوق ہمیشہ ایک اہم سوال پیش کرتا تھا۔ جسکے حل کئے بغیر عاشق کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کئی لوگ اس پیش کردہ سوال کی مشکلات کا خیال کرکے واپس ہو جائیں۔ اور صرف ایک آدھ من چلا کامیاب۔ اس سے قصہ کی دلچسپی میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب قصہ کا ہیرو، معشوق کے پیش کردہ سوال کو پورا کرنے کیلئے روانہ ہوتا ہے تو اسکے راستے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہوتی تھیں۔ انہیں کو دور کرنے میں ہیرو کو بہت سی مہمات سر کرنی پڑتی تھیں۔ جو قصہ کا اصل مواد ہوتا ہے۔

آخری خصوصیت داستان گوئی کی یہ ہے کہ قصوں کا مقصد صرف دلچسپی پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ کچھ اخلاقی تعلیم دینا بھی ہوتا ہے۔ "آرائش محفل" میں جس مثالی ایثار کیطرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو مبتلائے نظیر آلام دیکھو۔ اور اسکی تکلیف تمہاری تکلیف سے زیادہ سخت ہو، تو تمہارا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ پہلے اسکی تکلیف کو دور کرنے میں مصروف ہو جاؤ۔" "باغ و بہار" کے ذریعہ شاہزادوں اور بادشاہوں کو انصاف اور رحم کی تلقین کیگئی ہے۔ امرا کو تجارت کا شوق دلایا گیا ہے تاکہ ملک ملک پھرنے سے عجائبات عالم کا مطالعہ ہو سکے۔

انتظارِ تبسم

از مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوش۔ ملیح آبادی۔ ناظر ادبی۔ دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ

جس طرح اے حسنِ خود بیں نبض کاہ و روح کوہ
روز و شب اک لرزشِ پیہم سے رہتی ہے دوچار
کاہ کے دِل میں چمکتا ہے لبفکرِ رنگ و بو
کاوشِ خورشید و سعیٔ باد و باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ نمو سے ناتراشیدہ صنم
بت تراشوں کی نظر کو ڈھونڈھتے ہیں بار بار
یونہی میرے جوہرِ خوابیدہ اے رازِ حیات
تیرے ہلکے سے تبسم کے لئے ہیں بیقرار

ہیوم اور مبداءِ علم

(از جناب میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال۔ بی (عثمانیہ)

ہیومؔ کو تاریخ فلسفہ میں جو خاص اہمیت حاصل ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اسنے فلسفیانہ مباحث پر اپنے پیشرؤوں سے زیادہ دقیق النظری سے غور و خوض کیا ہے۔ اسی لئے اسکی تصانیف یورپ میں وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ انگلستان میں سب سے پہلے بیکن نے تجربی فلسفہ کی بنیاد رکھی لیکن اسکی تکمیل ہیوم کے ہاتوں سے ہوئی۔ ہیوم کے فلسفہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے یہ ناگزیر ہے کہ فلسفہ یورپ کے آغاز و ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے اور یہ دکھایا جائے کہ ہیوم کے زمانہ میں فلسفہ کی کیا حالت تھی۔

فلسفہ قدیم کی کوشش اسی حدتک تھی کہ کائنات کی توجیہ خارجی نقطۂ نظر سے کیجائے۔ اُسنے مبداءِ عالم اور ہستی کی علت و ماہیت کو کسی ایسی شئی میں تلاش کیا جو نفس مدرک سے باہر موجود ہے۔ ایونیا کے مفکرین نے فطرت کے بعض عناصر کو، فیثاغورسیوں نے عدد و توافق کو، ہرقلیطوس نے حرکت کو اور دمیقراطیس نے سالمات کو مبداءِ عالم قرار دیا۔ اس قسم کی فلسفیانہ کوششوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام مذاہب نے اشیاء کی علت اولیٰ کو عالم خارجی میں تلاش کیا۔ لیکن سقراط اور رواقیین (Stoics) نے خارج سے ہٹ کر عالم باطنی پر غور کرنے کی تعلیم دی۔ تاہم یونان اور اطالیہ میں غور و فکر کا میلان عالم خارجی کی طرف ہی رہا۔ فلسفۂ قدیم میں

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لیگئی ہے۔ تاریخ فلسفہ از ڈیبر۔ تاریخ فلسفہ از لیوس۔ تاریخ فلسفہ از ارڈمین لیکن اسکا بیشتر مواد پروفیسر ہکسلے کی کتاب "ہیوم" سے ماخوذ ہے ۱۲

انا وغیری یا ذات وخارج کے باہمی اختلاف پر بحث نہیں کیگئی۔ اس زمانہ کے مفکرین کے پیش نظر ظواہر اور "شئی بذات خود" (Thing in itself) یا اعراض وجوہر کا تعلق تھا۔

فلسفۂ قرون وسطیٰ کی جو مدرسیت (Scholasticism) کے نام سے مشہور ہے عجیب وغریب حالت تھی۔ اس زمانہ میں فلسفہ قدیم کے ساتھ سامی ومسیحی مذاہب کا اتصال ہوا جس سے دینیات وجود میں آئی۔ مدرسیت کی تمام فلسفیانہ کوششوں کا نتیجہ بس یہی نکلا کہ ذہن انسانی دینیات کے پیش کردہ تصورات کو صدیوں تک مسلمات سمجھتا رہا۔ اور انسان پر روایات کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ عقل کی آزادی مفقود ہوگئی۔ اس عہد میں عقل انسانی غلامی کی زنجیروں میں رہنے کے باوجود یہ کوشش کرتی رہی کہ جن باتوں کو وہ روایات کی بنا پر صحیح تسلیم کرتی ہے انکو عقل کے مطابق ثابت کرے۔

برخلاف قدما کی خارجیت یا قرون متوسطہ کی ماورائیت کے فلسفۂ جدید کا نقطہ آغاز بالکل باطنی یا نفسی ہے۔ فلسفۂ قدیم میں جوہر واعراض کے باہمی تعلق پر اور قرون متوسطہ میں محدود ولامحدود کے تعلق پر بحث کیجاتی تھی لیکن فلسفہ جدید کے پیش نظر ذات وخارج یا موضوع (Subject) ومعروض (Object) کا باہمی تعلق ہے۔ اس تحریک کا بانی اول فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ گزرا ہے۔ اگرچہ انگلستان میں بیکن کی تصانیف ڈیکارٹ سے پہلے شائع ہوچکی تھیں پھر بھی تاریخ فلسفہ میں ڈیکارٹ کی حیثیت بیکن سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور ڈیکارٹ کا فلسفہ ہی فلسفۂ جدید کا نقطہ آغاز ہے۔ ڈیکارٹ نے اپنے فلسفہ کی عمارت کو شعور کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب کوئی شئے بلا کسی شک وشبہ کے واضح طور پر شعور میں موجود ہو تو اسپر صداقت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اسکے نزدیک حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ایک امتداد دوسرے فکر۔ یہ نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ متضاد بھی ہیں۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں پائی جاتی۔ نہ تو مادہ نفس کا آفرید ہے نہ نفس مادہ کا۔ ان دونوں میں ایک وسیع خلیج حائل ہے اور عقل اس خلیج کو عبور نہیں کرسکتی۔ اسلئے یہ لازم آتا ہے کہ عالم خارجی اور شعور باطنی میں اتحاد واتصال پیدا کرنے کیلئے ایک ایسے جوہر کا وجود ضروری ہے جو لامحدود اور ازلی ہو۔ جسکو عام زبان میں خدا کہتے ہیں۔

ڈیکارٹ کے بعد مالبرانش وغیرہ گذرے ہیں لیکن ان سب میں اسپینوزا کا فلسفہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے

اسنے اپنے نظام فلسفہ میں ڈیکارٹ کی ثنویت (Dualism) کو رفع کر کے وحدیت کا نظریہ پیش کیا۔ اسپنوزا مادہ و نفس کی ثنویت کا سخت مخالف تھا۔ اسنے ان دو محدود جواہر کو ایک لامحدود جوہر کے شئون (Modes) واحوال قرار دیا۔ اسکے نزدیک ایک انتہائی جوہر اپنے آپ کو ان مظاہر میں آشکار کرتا ہے یعنے کل کائنات معہ نفس و مادہ کے ایک واحد و قائم بالذات جوہر کا مظہر ہے۔ اگر عالم میں دو ایسے محدود جواہر ہوں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان میں باہمی تعامل و تاثر ہو سکے۔ فی الحقیقت جوہر تو صرف ایک ہی ہے اور مادہ و نفس اسکے دو اعراض ہیں جو ہم کو مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔

گسنڈی نے دیمقراطیس کا مسلک اختیار کیا۔ ڈیکارٹ کا فلسفہ اسکو متاثر نہ کرسکا۔ اس نے بھی دیمقراطیس کی طرح یہ تسلیم کیا کہ سالمات (Atoms) کے انتصال و انفصال سے اجسام پیدا و فنا ہوتے ہیں ہابس بھی گسنڈی کا ہم خیال تھا۔ ہابس برخلاف اسپنوزا کے مادہ کو انتہائی اور قائم بالذات جوہر مانتا تھا عہد حاضر میں اس نے مادیت کی تجدید کی۔ اسی نے تجربی نفسیات (Empirical pshychology) کی بنیاد رکھی انگلستان میں فلسفہ کا رخ زیادہ تر خارج کی طرف تھا لیکن کیمبرج یونیورسٹی میں چند لوگ ایسے پیدا ہو گئے تھے جو افلاطون کی پیروی کرتے تھے۔ ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد پھر انگریزی فلسفہ کا رخ باطن سے ہٹ کر خارج کیطرف پھر گیا۔ گسنڈی اور ہابس کے بعد نیوٹن وغیرہ نے علوم طبعی کو ترقی دی۔

انگلستان میں سب سے پہلے لاک نے اپنے معاصرین کی توجہ مطالعہ نفس کی طرف مبذول کرائی۔ اسکو یہ واضح طور پر نظر آتا تھا کہ ہمارا علم تمام تر عالم کی فطرت پر مبنی ہے اور علم انسان کی وسعت و حدود کا تعین ملکات انسانی (Human faculties) کی تجربی تحقیق سے ہو سکتا ہے۔ اسکی تمام تحقیقات کی بنیاد تجربہ ہے۔ اسنے سب سے پہلے عناصر شعور کی تحلیل کی اس میں بہت سے نقائص باقی رہ گئے ہیں۔ لاک نے حضوری تصورات (Innate ideas) کے نظریہ پر سخت اعتراضات کئے اور شعور کی تدریجی نشو و نما کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہتا ہے کہ بسیط (Simple) تصورات کو جو بذریعہ حواس حاصل ہوتے ہیں ہم ترتیب دیکر ملتف (Complex) تصورات وضع کر لیتے ہیں۔ اسکا یہ قول بہت مشہور ہے کہ حقیقت میں نفس ایک سفید کاغذ کے مانند ہے جس پر ارتسامات (Impressions) خارج سے بذریعہ حواس منقوش

ہوتے ہیں۔ انہی سے ہمارا علم ماخوذ ہے۔ عالم خارجی میں کثرت ہی کثرت نظر آتی ہے۔ نفس کا یہ کام ہے کہ اس کثرت کو تحلیل کرکے مختلف اصناف میں ترتیب دے۔ اس قسم کی ترتیب سے علم تشکیل پاتا ہے لہٰذا ہمارے علم کا مواد کلیتہً خارج سے ماخوذ ہے۔ اس علم کو حاصل کرتے وقت نفس بالکل منفعل (Passive) رہتا ہے حصول علم کا واحد ذریعہ احساسات ہیں۔

لاک کے بعد انگلستان میں برکلے نے ڈیکارٹ کے نظریہ کو نمو دیا۔ برکلے پر افلاطون کے فلسفہ کا گہرا اثر پڑا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ادراک کرنے والا نفس موجود نہ ہو تو اشیاء کا بھی وجود نہیں ہو سکتا۔ یعنے اشیاء کا وجود ادراک پر مبنی ہے۔ لہٰذا علم کا ماخذ باطن ہے نہ کہ خارج۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ ہمارے ہی تصوّرات ہیں۔ برکلے کی اس تصوریت (Idealism) کا ہیوم پر زیادہ اثر نہیں پڑا البتہ لاک کا فلسفہ ہیوم کے نظریہ کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ علمیات کا بانی لاک گزرا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے مبداؤ وسعت علم کا سوال اٹھایا تھا۔ سطور ذیل میں اسبات پر غور کیا جائیگا کہ مبداء علم کے متعلق ہیوم کا کیا مسلک ہے۔

مظاہر شعور کی تحلیل

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ہیوم کے نزدیک نفس کے کیا معنے ہیں اور اسنے شعور کی تحلیل کن اجزاء میں کی ہے۔ عام زبان میں نفس کو ایک ایسی ہستی سے تعبیر کرتے ہیں جو جسم سے آزاد ہے گو یہ جسم ہی میں موجود اور اس سے متحد ہے۔ اسمیں بے شمار ملکات بھی پائے جاتے ہیں جیسے حسیت فہم، ارادہ وغیرہ۔ ان ملکات کا نفس سے وہی تعلق ہے جو اعضا کا جسم سے۔ ان کے وظائف حس، حافظہ، استدلال وغیرہ ہیں۔ ان وظائف میں سے بعض (جیسے احساسات) محض منفعل ہیں یعنے احساسات کے وقوع میں آنے کا باعث ارتسامات ہیں جن کو عالم خارجی ہمارے آلات حس پر مرتسم کرتا ہے۔ دیگر وظائف جیسے حافظہ اور استدلال جزاً فاعل اور جزاً منفعل متصور ہوتے ہیں اور ارادہ سے ایک بالقوی فعلیت مراد ہے۔

نفسیات کے ایک متعلم کا یہ فرض ہے کہ وہ مظاہر نفسی کی تحلیل وتقسیم کو نفس کے صحیح مشاہدہ اور مطالعہ پر مبنی رکھے۔ جب ہم نفس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو اسکے سوا کسی اور شئے کا علم نہیں ہوتا کہ چند حوادث،

واقعات' یا مظاہر ہمارے باطنی عالم میں سرعت کے ساتھ یکے بعد دیگرے گزرتے رہتے ہیں۔ ان تمام مظاہر نفسی یا احوال شعور کو ڈیکارٹ نے "افکار" (Thoughts) اور لاک و برکلے نے "تصوّرات" (Ideas) کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ ہیوم کے نزدیک "تصوّرات" کی اصطلاح ناموزوں ہے۔ اسنے تمام احوال شعور کے لئے "ادراکات" (Perceptions) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ نفس سے ہماری مراد خواہ کچھ ہی ہو اتنا تو قطعی اور یقینی ہے کہ یہ لفظ ایک سلسلۂ ادراکات کو متضمن ہے۔ ہیوم دیگر مفکرین سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ "جس چیز کو ہم نفس کہتے ہیں وہ ادراکات کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں"۔ ہیوم کے اس خیال میں ایک قسم کی ادعائیت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی مفکر اس خیال کی تائید میں صرف اسقدر کہہ سکتا ہے کہ میں نفس کو اس حیثیت سے جانتا ہوں کہ وہ ادراکات کا ایک سلسلہ ہے مگر خود نفس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔ آیا نفس میں کوئی ایسی شئے موجود ہے جو ہمارے مشاہدہ کی دسترس سے بالاتر ہے یا خود ہمارے ادراکات کسی ایسی شئے کے آفریدہ ہیں جو خارج از نفس ہے' جسکا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب براہِ راست مشاہدہ و تجربہ سے نہیں دیا جاسکتا۔

اگر ہم فی الحال نفس کی ایک جامع تعریف دریافت کرنے کی بجائے ادراکات یا احوال شعور کا ایک سرسری معائینہ کریں تو ہم کو نظر آئیگا کہ ان کی تقسیم مختلف اصناف میں ہوتی ہے۔ ان میں سے دو اصناف کو ہیوم نے بہت اہمیت دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام ادراکات یا تو ارتسامات ہیں یا تصورات۔ ارتسامات کے تحت اُس نے اس قسم کے اعمال کو جیسے دیکھنا' سُننا' محسوس کرنا وغیرہ بالفاظ دیگر تمام احساسات اور جذبات کو شامل کرلیا ہے۔ اسکے برخلاف تصورات خود ارتسامات ہی کی تصویریں ہیں جو ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ ادراکات کی ایک اور تقسیم بسیط اور ملتف میں بھی کیجاسکتی ہے۔ بسیط تصوّرات ناقابل تحلیل ہیں لیکن ملتف تصورات کی تحلیل کیجاسکتی ہے۔ تمام بسیط تصوّرات بسیط ارتسامات سے ماخوذ ہیں یعنے بسیط ارتسامات کو بسیط تصورات پر تقدم حاصل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تصور کی علت ارتسام ہے۔ مثلاً ایک نابینا پر روشنی کا کوئی ارتسام نہیں ہوتا اسلئے اُسکے ذہن میں روشنی کا کوئی تصور ہی نہیں۔

سُرخ یا سبز رنگ بسیط ارتسامات ہیں لیکن سُرخ یا سبز رنگ کے تصوّرات ان ارتسامات کی تصویریں یا

نقول ہیں۔ اسیطرح سُرخ گلاب ایک ملتف ارتسام ہے جسکی تحلیل سُرخ رنگ ' اور گلاب کی بو وغیرہ جیسے بسیط ارتسامات میں ہوسکتی ہے اور سُرخ گلاب کا تصور اسی ملتف ارتسام کی ایک مدہم مگر صحیح تصویر ہے۔

اگر تصورات کو محض ارتسامات کی تصویریں یا نقول تسلیم کریں تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ اگر تمام کیفیات نفسی کی انتہائی تحلیل کیجائے تو وہ بالآخر ارتسامات ہی پر آکر ٹھہرتے ہیں۔ ہیوم کے نزدیک ارتسامات کی دو قسمیں ہیں۔ یہ ارتسامات یا تو احساسات (Sensations) سے پیدا ہوتے ہیں یا تو غور و تامل سے (Reflection)۔ اول الذکر حواس ظاہری سے حاصل ہوتے ہیں جن میں احساسات لذت والم بھی شامل ہیں۔ اور آخر الذکر کے تحت جذبات کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ پس ابتدائی احوال شعور جو علم کا مواد خام ہیں یا تو احساسات پر مشتمل ہیں یا جذبات پر۔ ان ابتدائی احوال شعور کے علاوہ اگر نفس میں کوئی شئے دریافت ہوتی ہے تو اوسکو انہی ابتدائی احوال کی ترتیب و تغیر کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

ہیوم جیسے دقیق النظر مفکر سے بعض مرکبات کی نفسیاتی تحلیل میں غلطی صادر ہوئی ہے اور اُس نے بعض مرکبات کو بھی عناصر تسلیم کیا ہے۔ اگر شعور کے ابتدائی عناصر میں سے ہیوم کے "ارتسامات فکر" (Impressions of reflection) کو خارج کر دیا جائے تو سوائے اُن ارتسامات کے کچھہ باقی نہ رہیگا جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں، جن میں لذت والم بھی شامل ہیں۔ اگر عضلاتی احساس (Muscular) سے قطع نظر بھی کر لیجائے کیونکہ احساس کیطرف ہیوم کے زمانے میں کسی کا خیال نہیں گیا تھا تو پھر یہ سوال حل طلب رہجاتا ہے کہ فکر کے ناقابل تحلیل مواد بھی ارتسامات ہیں یا ان کے سوا کچھہ اور بھی مواد ہے جسکی طرف ہیوم کا خیال نہیں گیا۔ کانٹ نے اس آخری سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ ہم ذیل میں ایک مثال سے اسکو واضح کرنے کی کوشش کرینگے۔

جب کوئی سُرخ روشنی ساحت نظر (Field of vision) میں جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو نفس میں سُرخی کا ایک حسی ارتسام منقوش ہوجاتا ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرخی کوئی ایسی چیز ہے جو کسی ارتسام یا تصور سے جداگانہ یا منفصل وجود رکھتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک ایسی حساس ہستی موجود ہے جسکے پاس سوائے حاسۂ بصر کے کوئی اور حاسہ نہیں اور جسنے اپنی زندگی بالکل تاریکی میں بسر کی ہے اور عمر بھر میں جسکو پہلی مرتبہ روشنی کا یہ احساس ہوا ہے

اس عارضی سُرخ روشنی کی جھلک اوسکے نفس میں ایک ارتسام پیدا کرنے کیلئے کافی ہے۔ اسکے شعور میں سوائے اس ارتسام کے کوئی اور شئے موجود نہوگی۔ اگر وہ حافظہ بھی رکھتا ہے تو اس ارتسام کا اسکو ایک تصوّر حاصل ہوگا۔

اگر ایسے شخص کو دوسری مرتبہ سُرخ روشنی کا تجربہ ہو اور پہلا تجربہ اُسکے حافظہ میں موجود نہ ہو تو اُسکے ذہن کی وہی حالت رہیگی جو پہلے تھی یعنے اُسکے ذہن پر محض ایک دُوسرا ارتسام منقوش ہوگا۔

فرض کرو کہ اس شخص کے ذہن میں حافظہ بھی موجود ہے اور پہلے ارتسام کا تصور بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اگر یہ شخص ہمارے جیسا ہی ایک انسان ہے تو اسکے ذہن میں دو بالکل نئے ارتسامات پیدا ہونگے۔ ایک تو اُن دو ارتسامات کے مرور یا توالی (Succession) کا احساس دوسرے اون دونوں کی مماثلت۔

ایک تیسری صورت یہ فرض کیجا سکتی ہے کہ دو سُرخ روشنیاں وقت واحد میں چمکتی نظر آتی ہیں۔ اِس حالت میں توالی یا مماثلت کا احساس نہیں بلکہ ہمدم (Co-existing) وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے

اس قسم کی حسّیات اُس شئے کی بنیاد ہیں جسکو ہم نسبت (Relation) یا علاقہ کہتے ہیں۔ احساسات کیطرح ان کی بھی مزید تشریح یا بسیط عناصر میں تحلیل نہیں ہوسکتی۔ ذائقہ' بو' اور احساس لذّت والم کی طرح شعوری تجربہ کے یہ ناقابل تحلیل واقعات ہیں۔ ہیوم کی زبان میں انکو ارتسامات علایق" (Impression of relations) کہنا چاہئیے۔ ہیوم کو بھی اپنے پیشروں کی طرح ارتسامات علایق کی توجیہ و تشریح میں ناکامی ہوئی۔ علایق سے اس نے جو کچھ بحث کی ہے اُس میں بے حد تناقض پایا جاتا ہے۔

"رسالہ فطرت انسانی" میں مماثلت' مقارنت زمانی و مکانی' (Contiguity of time and space) اور علت و معلول کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ تصورات کو متصل کرنیوالے اصول یا رشتۂ اتحاد ہیں۔ ہیوم کہتا ہے کہ "یہ صفات تصورات میں تلازم یا ایتلاف (Association) پیدا کرتے ہیں۔ ایک تصوّر کے ظہور پذیر ہونے کے بعد قدرتی طور پر دوسرا تصوّر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے بسیط تصوّرات کو متحد کرنے والے اصول ہیں۔ انہیں ایسی کشش پائی جاتی ہے جو ذہنی دنیا میں عجیب و غریب اثرات پیدا کرتی ہے۔ اسکے معلولات تو ہر جگہ نمایاں ہیں لیکن ان کے علل ایک بڑی حد تک نامعلوم ہیں۔ ان کی تحلیل فطرت انسانی کے ابتدائی صفات میں کیجاتی چاہئیے۔" مُلتف تصورات کی تحلیل ہیوم نے علایق' شئون' اور جواہر میں کی ہے۔ علایق پر بحث کرتے ہوئے

وہ کہتا ہے کہ یہ ایسے صفات ہیں جن کے ذریعے سے ذہن میں تصوّرات کا اتصال ہوتا ہے۔ اس نے علایق کی سات قسمیں قرار دی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ مماثلت، عینیت، زماں و مکاں، کمیت، کیفیت، تضاد، اور علّت و معلول، لیکن ہیوم نے مماثلت کے متعلق ایک جگہ تو یہ کہا ہے کہ یہ تصوّر کی ایک صفت ہے اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ یہ ایک ملتف تصور ہے۔ اسمیں جو تناقض ہے وہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جن تصورات میں مماثلت مقارنت اور علّت و معلول کی صفات پائی جاتی ہیں اونکے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اون میں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کا میلان ہے اسلئے ان میں تلازم پیدا ہو جاتا ہے۔ ہیوم بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ تصورات میں سوائے ارتسامات کی تصویروں یا نقول کے اور کوئی چیز نہیں۔ لہذا یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ مماثلت اور مقارنت کی صفات جو تصوّرات میں پائے جاتے ہیں اونکا بھی ارتسامات میں موجود ہونا لازمی ہے۔ اسلئے یہ صفات بھی یا تو احساسات ہیں یا جذبات۔ لیکن ایک اور جگہ ہیوم نے علایق کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ موازنہ اور مقابلہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہیوم کے اصول کے مطابق یہ چاہئے تھا کہ ادراکات علایق کو بھی اُن تصوّرات میں جگہ دیجاتی جو فکر و تامل سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہیوم نے نفس کی جن اجزاء میں تحلیل کی ہے اگر اسمیں کسی قدر ترمیم کیجائے تو یہ اجزاء حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) ارتسامات۔

(ا) بو، ذائقہ، سامعت، بصر، لمس، مزاحمت (حسّ عضلاتی)

(ب) لذّت والم۔

(ج) علایق۔ ہمدم وجود، توالی یا مرور، مماثلت اور مخالفت

(۲) تصوّرات۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ما فی النفس (Contents of the mind) کے کسی حصّہ پر علم کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لاک کے نزدیک دو تصوّرات کے باہمی توافق یا اختلاف کا ادراک علم ہے۔ ہیوم نے لاک کی اس تعریف کو تسلیم کر لیا ہے گو اس نے وضاحت سے اسکو بیان نہیں کیا۔ اس سے یہ نتیجہ

لازم آتا ہے کہ محض ارتسامات اور تصورات سے علم تشکیل نہیں پاتا بلکہ جب ان ارتسامات اور تصورات میں علایق کے ارتسامات کا اضافہ کیا جاتا ہے تو علم کی تشکیل ہوتی ہے ۔

مبدا ارتسامات یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ احساسات، حسیات لذت والم اور علایق شعور کے ابتدائی اور ناقابل تحلیل احوال ہیں، تحقیقات کے دو راستے کھل جاتے ہیں ۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارتسامات کا مبدا کیا ہے ۔ دوسری بحث یہ ہے کہ یہ ارتسامات شعور کے مرکب احوال یعنے تصورات میں کسطرح منتقل ہو جاتے ہیں ۔

حس ارتسامات کے مبدا و ماخذ کے متعلق ہیوم کے بیان میں تناقض پایا جاتا ہے ۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ارتسامات اشیا سے براہ راست پیدا ہوتے ہیں یا ان کو نفس کی قوت تخلیق وجود میں لاتی ہے، یا یہ خالق عالم کے آفریدہ ہیں ۔ اس خیال میں تصوریت اور حقیقیت (Realism) دونوں کے رجحانات موجود ہیں ۔ ڈیکارٹ نے بالوضاحت بیان کیا تھا کہ احساسات کا انحصار اون ماقبل تغیرات پر ہے جو نظام عصبی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور یہ مفروضہ کہ احساسات براہ راست اشیاء خارجی سے پیدا ہوتے ہیں ناقابل قبول ہے ۔ ہیوم نے بھی ڈیکارٹ کے اس خیال کو تسلیم کیا ہے اسکے نزدیک بھی تمام ادراکات اعضا اور اعصاب پر مبنی ہیں ۔ ایک اور بحث کے ضمن میں وہ کہتا ہے کہ حواس سے تین قسم کے ارتسامات حاصل ہوتے ہیں ۔ پہلی قسم کے ارتسامات مشتمل ہیں شکل، حجم، حرکت، اور صلابت پر ۔ دوسری قسم میں رنگ، بو، ذائقہ، آواز، سردی اور گرمی کا شمار کیا جا سکتا ہے ۔ تیسری قسم میں احساسات لذت والم داخل ہیں ۔ آخرالذکر ارتسامات اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ اشیاء خارجی کا ہمارے جسم سے مماس ہوتا ہے جیسے چاقو سے جسم کا کٹ جانا وغیرہ ۔ ایک فلسفی اور ایک عامی بھی اول الذکر کے ایک منفصل اور مسلسل وجود کو تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن قسم دوم کو صرف ایک عامی قسم اول سے مشابہ سمجھتا ہے لیکن قسم سوم کے متعلق دونوں خیال کرتے ہیں کہ انکا وجود منفصل اور جداگانہ نہیں ۔ یہ بالکل واضح ہے کہ رنگ، آواز، سردی اور گرمی اوسی طرح موجود ہیں جس طرح کہ حرکت اور صلابت، اور ان کے مابین فرق قائم کرنیکا ذریعہ ادراک کو قرار دینا درست نہیں ۔ یہ ادراکات جسمی حرکات و تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کے اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ حواس کا تو یہ فیصلہ ہے

کہ تمام ادراکات کا وجود یکساں ہے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہیوم نے نفسیاتی عضویات کے اس نتیجہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ شعور کے تمام احوال و عناصر کا مبدا جسمی تغیرات ہیں جن کا مرکز دماغ ہے۔ لاک کیطرح ہیوم نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی کہ دماغی حرکت اور شعور میں کوئی علاقۂ علیت نہیں پایا جاتا۔ مخالفین تجربیت (Empiricism) کا یہ اعتراض تھا کہ مادہ محض مادہ ہے۔ مادہ اور حرکت صرف اشیاء کی وضع اور حیثیت میں ایک فرق پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک جسم کو تم جس قدر چاہو تقسیم کرو وہ جسم ہی رہیگا۔ تم اوسکی شکل بدل دو پھر بھی کوئی ایک شکل باقی رہیگی۔ تم اوسکو کسی طریقہ پر بھی حرکت دو پھر بھی حرکت یا تغیر نسبت ہی پاؤگے۔ بس یہی تغیر و تبدل ہے جس کا مادہ متحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مادہ سے فکر یا ادراک پیدا ہوتا ہے۔ اسکے جواب میں ہیوم کہتا ہے کہ بہت کم لوگوں کو اس استدلال کی ظاہری شہادت سے انکار کرنے کی جرأت ہوتی ہے پھر بھی اسکی تردید نہایت آسان ہے۔ ہیوم نے اسپر جس قدر مفصل بحث کی ہے اُسکا ماحصل یہ ہے کہ جسم کے ہر ایک تغیر کے ساتھ نفس میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے مثلاً شدید درد سر کی حالت میں نفس کی حالت بھی بدل جاتی ہے جس سے ہر ایک شخص بخوبی واقف ہے۔ حرکات ایسے معلولات ہیں جنکی علل کا پتہ مادہ میں چلتا ہے اسیطرح ادراکات بھی ایسے معلولات ہیں جنکی علل کی تلاش مادۂ دماغ کے ماقبل کے تغیرات میں کرنی چاہئیے۔ اگرچہ ہیوم کے زمانے میں عضویات کی اسقدر ترقی نہیں ہوئی تھی جسقدر کہ اب ہوئی ہے پھر بھی اس نے اس اساسی صداقت کو دریافت کر لیا تھا کہ اعمال نفسی کو بخوبی سمجھنے کے لئے عصبی آلات کے ذراتی (Molecular) تغیرات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اگرچہ متذکرۂ بالا خیال میں مادیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن اسکے ڈانڈے تصوریت سے بھی ملجاتے ہیں۔ کیونکہ ایک جگہ ہیوم بیان کرتا ہے کہ جب ہم اپنے اعضا پر غور کرتے ہیں تو ہم کو اپنے جسم کا ادراک نہیں ہوتا بلکہ چند ارتسامات ہم کو بذریعہ حواس حاصل ہوتے ہیں۔ ان ارتسامات کے ایک حقیقی اور مادی وجود کو تسلیم کرنا بہت دشوار ہے۔ لہٰذا اگر ہم اس خیال کی تحلیل کریں کہ تمام مظاہر نفسی مادی مظاہر کے معلولات یا پیداوار ہیں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جب کبھی یہ احوال شعور

جن کو ہم احساس، جذبہ یا فکر کہتے ہیں وقوع پذیر ہوتے ہیں تو کامل تحقیقات کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ان مظاہر کے وقوع سے پیشتر اور بھی مظاہر شعور وقوع پذیر ہو چکے ہیں جن کو ہم مادہ اور حرکت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام مادی تغیرات کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ حرکت ہی کی مختلف صورتیں ہیں لیکن حرکت کے متعلق ہم کو صرف اسقدر علم ہے کہ یہ ہمارے احساسات کی ترتیب و حیثیت کے ایک تغیر ہی کا نام ہے۔

لاک کی طرح ہیوم نے بھی اس سوال سے بحث کی ہے کہ آیا تمام تصوّرات تجربہ سے ماخوذ ہیں یا بعض تصورات وجدانی یا حضوری (Innate) ہیں۔ ہیوم کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے۔ حضوری تصورات سے کیا مراد ہے؟ اگر حضوری کی اصطلاح فطری کے مترادف ہے تو تمام تصوّرات یقیناً حضوری یا فطری ہیں اگر حضوری سے یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ تصورات ہماری پیدایش کے وقت سے موجود ہیں تو کل بحث بے سود نظر آتی ہے۔ ایک اور سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ آیا ان تصورات کا وجود ہماری پیدایش کے وقت سے ہے یا پیدایش کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں تصوّر کی اصطلاح بالعموم وسیع معنوں میں استعمال کیجاتی ہے۔ لاک تو تمام ادراکات، احساسات، جذبات، اور افکار کو بھی تصوّرات کے تحت رکھتا ہے۔ انہی معنوں کو پیش نظر رکھ کر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حُب ذات یا میلان جنسی سے کیا مراد ہے۔ اور ارتسامات اور تصورات کا وہی مفہوم لیا جائے جو اوپر بیان ہوا ہے اور حضوری سے یہ مراد ہو کہ ایسے تصورات جو اصلی اور ابتدائی ہیں یعنے وہ کسی ما قبل ادراک کی تصویر نہیں ہیں تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ارتسامات حضوری ہیں نہ کہ تصورات۔

حضوری تصوّرات کے مفہوم کو ڈیکارٹ نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے جس میں غلط فہمی ممکن نہیں۔ حضوری تصوّرات سے وہ یہ مفہوم لیتا ہے کہ ایسے تصوّرات جو وقوع پذیر ہونے سے پہلے ذہن میں بالقوہ موجود ہوتے ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ " میں نے نہ تو یہ خیال کیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ نفس کو ایسے حضوری تصوّرات کی ضرورت ہے جو ملکۂ فکر (Faculty of thought) سے علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ بعض افکار ایسے نظر آتے ہیں جو نہ تو خارجی اشیاء سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ انکو

میرا ارادہ پیدا کرتا ہے بلکہ یہ ملکۂ فکر کے آفریدہ ہیں۔"

اگر یہ کہا جائے کہ شعور میں جو کچھ موجود ہے وہ سب حضوری ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تجربے کے کیا معنی ہیں؟ تجربہ سے مُراد ان حضوری تصورات کا جو ذہن میں بالقوی موجود ہیں چند نامعلوم علل کے ذریعہ سے فی الواقع وجود میں آجانا ہے۔ تجربہ حاصل ہونے سے پہلے آلہ فکر کی حیثیت بالکل ایک پیانو کی سی ہوتی ہے جس میں موسیقی بالقوے موجود ہے۔ ایک پیانو بجانے والا اس موسیقی کو جو بالقوے پیانو میں موجود ہے فی الواقع وقوع میں لاتا ہے۔ موسیقی کی تمام دلکشی پیانو بجانے والے کے ہاتوں کی حرکت پر مبنی ہے۔ حضوری تصورات کے متعلق ڈیکارٹ کا قول ہے کہ ذہن کی باطنی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ جب کبھی چند تجربے ہم کو حاصل ہوتے ہیں تو ساتھ ہی چند افکار بھی ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ افکار یا تصورات احساسات کی تصویریں نہیں ہوتے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عدم سے کسی شئے کا وجود میں آنا ممکن نہیں تو اس سے ہماری یہ مراد نہیں ہوتی کہ یہ قضیہ کوئی ایسی چیز ہے جو خارج میں موجود ہے' یا یہ کسی شئے کا خاصہ ہے۔ بلکہ ہم اسکو ایک ازلی صداقت تصور کرتے ہیں جس کا وجود ہمارے ذہن میں ہے اور ہمارے نزدیک یہ اوّلیات میں داخل ہے۔ اسیطرح جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی شئے وقتِ واحد میں موجود اور غیر موجود نہیں ہوسکتی یا یہ کہ فکر کرتے وقت مفکر کا وجود لازمی ہے۔ غرضکہ اس قبیل کے تمام قضایا ایسی صداقتیں ہیں جو فکر سے باہر موجود نہیں۔

یہ بتایا جاچکا ہے کہ ہیوم نے ڈیکارٹ کے اس قول کو تسلیم کیا ہے کہ تمام احساسات حضوری ہیں یعنے یہ اُسوقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ آلۂ فکر کسی نامعلوم العلت مہیج (Stimulus) پر رد عمل شروع کرتا ہے ہیوم کا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ نفس میں موجود ہے اُسکا ماخذ حسّی تجربہ (Sense experience) کا اجتماع اور تغیر ہے۔ مظاہر شعور کی جو تحلیل اوپر پیش کیگئی ہے اگر اوسکو صحیح تسلیم کیا جائے تو ہیوم کی غلطی صاف ظاہر ہو جائیگی۔

فارسی نثر کا آغاز اور ابو علی بلعمی

(از سید غلام محی الدین قادری زورؔ متعلم ایم اے)

جب عربوں نے ایران پر فتح حاصل کی تو سکندر اعظم، چنگیز خاں یا تیمور کی طرح اپنے مفتوحین کے صرف ملک و مال ہی پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہی وہ زبردست خصوصیت تھی جس نے عرب فاتحین کو ہر جگہ امتیازی حیثیت سے بہرہ ور کر رکھا تھا۔

اسلام کے اثر سے ایرانیوں کے دل و دماغ میں علم و ادب کا شوق برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ وہی ایرانی جو اپنی قومی حکومتوں کے زمانہ، اور بالخصوص ساسانیوں کے عظیم الشان دور میں بھی معدودے چند علمی، ادبی اور مذہبی یادگاروں کے علاوہ کوئی مہتم بالشان کارنامہ نہیں پیش کر سکے، عربوں سے متاثر ہونے کے بعد متفرق علوم و فنون کے مخزن بن گئے[1]۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خود فاتحین کی مادری زبان میں اس شان اور کثرت سے کتابیں لکھیں کہ ان خوددار عربوں کو بھی جو اپنے مقابلہ میں دوسری قوموں کو بے زبان سمجھتے تھے، ان کی اعلیٰ علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کا اعتراف کرنا پڑا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں کے حملے اور فتح کے ساتھ ہی ایرانیوں میں جو کچھ بھی علمی و ادبی قوتیں تھیں وہ سب ایک عرصے کے لئے معطل سی ہو گئیں، لیکن جہاں سیاسی ہڑبونگ ختم ہوا اور اسلام کی صداقتیں عالمگیر اثر دکھانے لگیں، ایرانی محیط و علم و فضل کی یہ خاموشی انگریزی کے اس مشہور مقولہ کے مطابق تھی کہ ہر جمود کے بعد ایک طوفان ہوتا ہے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل "ان حملۃ العلم فی الاسلام اکثرہم العجم"۔ ۱۲

ایک ایسے زبردست ہیجان اور تلاطم میں تبدیل ہوگئی جس نے بہت جلد فارسی زبان کو دنیا کی ترقی یافتہ اور شگفتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھا دیا۔

موجودہ فارسی کی ابتدا فی الحال اس امر کا کوئی قطعی تصفیہ کرنا دشوار ہے کہ موجودہ فارسی نثر کی عبارتیں کس وقت سے لکھی جانی شروع ہوئیں؟ بہت ممکن ہے کہ عرب فتح کے بالکل بعد ہی سے ایران کے نومسلم اپنی مادری زبان کو اپنے مذہب کی زبان (عربی) کے رسم الخط میں لکھنے کی طرف راغب ہوگئے ہوں گے کیونکہ یہ ان کے لئے بہ نسبت پہلوی لکھنے اور پڑھنے کے بہت آسان تھا۔

عربوں کے حملے کے بعد ایرانی زبان میں جو انقلاب ہوا وہ بظاہر نہایت اہم نظر آتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ایران کی قدیم زبان میں کوئی بڑا اور اصولی تغیر نہیں ہوا، بلکہ صرف رسم الخط بدل گیا، جو بہ نسبت گذشتہ رسم الخط (یعنے پہلوی) کے زیادہ سہل الحصول اور سود مند تھا۔ اگر کسی پہلوی کتاب کو ہزوارش طریقہ پر نہ لکھکر موجودہ فارسی خط میں لکھا جائے تو ان دونوں میں لغت کے لحاظ سے بہت کم فرق ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی پہلوی کتاب کو کوئی زرتشتی موبد با آواز بلند پڑھے اور آجکل کا کوئی مسلمان اس کو عربی رسم الخط میں لکھتا جائے تو وہ آخر کار موجودہ فارسی کی ایک ایسی کتاب بن جائے گی جس میں عربی عنصر مطلق نہو۔ اس کے برخلاف پہلوی سے اس کے قبل کی زبان کئی حیثیتوں سے بالکل جداگانہ تھی۔ ساسانی دور کا کوئی ایرانی، ہند ایرانی میڈوی یا ہخامنشی دور کی زبان قطعاً نہیں سمجھ سکتا حالانکہ وہ موجودہ فارسی کو بہت کچھ سمجھ لیگا۔

پہلوی کے بہت جلد مفقود ہو جانے اور اس کی جگہ موجودہ فارسی (خصوصاً رسم الخط) کے رائج ہونے کے متعلق کئی اسباب قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا سبب مذہبی اثر ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہب کی جو زبان ہوتی ہے اسی کو تمام اہل مذہب اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر وہ مذہب کی زبان کو پوری طور پر اختیار نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کے رسم الخط کو ضرور اختیار کر لیتے ہیں شلاً[1]

ا۔ شام کے عربی بولنے والے عیسائی عربی رسم الخط میں لکھنے کی جگہ عربی کو شامی رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

---

[1] دیکھو پروفیسر براؤن "تاریخ ادبیات ایران" حصہ اول صفحات ۸ اور ۹۔

۲۔ ترکی بولنے والے ارمنی و یونانی ترکی رسم الخط استعمال نہیں کرتے بلکہ اکثر ترکی زبان کو ارمنی اور یونانی حروف میں لکھتے ہیں۔

۳۔ ایران کے یہودی اگرچہ ایرانی زبان بولتے تھے لیکن لکھتے عبرانی رسم الخط میں تھے۔ چنانچہ ان کا ایک خاص ادب ہے جو اگرچہ فارسی زبان میں ہے لیکن عبرانی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے۔

۴۔ ہسپانیہ کے "مور" باشندے جنہوں نے عربی بولنا اگرچہ کبھی کے فراموش کر دیا تھا لیکن لکھتے عربی رسم الخط میں تھے۔ اسی طرح ایرانی اگرچہ اپنی قدیم زبان بولتے رہے لیکن لکھنا اپنے جدید مذہب کی زبان (عربی) کے رسم الخط میں شروع کیا۔

جدید فارسی رسم الخط کے بہت جلد رائج ہو جانے کا ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلامی اثر سے پہلے پہلوی زبان میں یوں بھی بہت کم لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ صرف مذہبی موبد اور علما و فضلا لکھنا جانتے تھے۔ اسلام کی وجہ سے جب علم عام ہوا اور کسی خاص فرقہ تک محدود نہ رہا تو بہت سے ایرانیوں نے لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ کی اور چونکہ اکثر کا مذہب اسلام ہو گیا تھا اس لئے سبھوں نے اسی کی زبان کے رسم الخط میں لکھنا شروع کیا۔ پہلوی کا لکھنا دشوار بھی تھا۔ وہ آسانی سے ذریعہ بیان نہیں بن سکتی تھی۔ چنانچہ جب شاپور جندشاپور کے قریب پہونچا اور وہاں شہر آباد کرنے کے متعلق ایک بوڑھے سے رائے لی تو اس نے جواب دیا کہ "اگر میں اپنی اس عمر میں لکھنا سیکھ سکتا تو تم کو بھی یہاں شہر آباد کرنے کی اجازت مل سکتی۔ پہلوی میں خاص بات یہ تھی کہ لکھتے کچھ تھے اور پڑھتے کچھ۔ مثلاً لکھتے تھے "گبر" اور پڑھتے تھے مرد۔ اگر مردم کہنا ہوتا تو لکھتے "گبرام"۔ اسی طرح لکھتے تھے "ابتر" پڑھتے تھے "پدر"۔ رسم الخط اور تلفظ کے اختلاف کی بنا پر پہلوی کے متعلق یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ "وہ خیالات کے مخفی رکھنے کا ایک ہنر ہے"۔ غرض اس قسم کے اسباب تھے جن کے باعث پہلوی رسم الخط بہت جلد معدوم ہو گیا اور موجودہ فارسی رسم الخط کی ابتدا ہوئی۔

مشرق میں عام طور پر زبان کو مذہب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ چنانچہ فارسی میں بھی غالباً اسلامی

۱۔ دیکھو پروفیسر براؤن تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۱۰۱، ۷۴ - ۷۵

اصول وعقائد ہی سے نثر کی ابتدا ہوئی ۔ لطف یہ ہے کہ اس ابتدائی فارسی اور کئی صدیوں بعد کی فارسی میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے بعض قدیم ترین مصنفین کے کارناموں میں اس قسم کی تحریریں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری ساسانی اور ابتدائی اسلامی زمانہ کی فارسی تقریباً وہی تھی جسمیں موجودہ فارسی نثر کی کتابیں لکھی جاتی ہیں ۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً فارسی زبان میں کوئی زیادہ تغیر نہیں ہوا ۔

فارسی نثر کی اولین کتابیں

پانچویں صدی ہجری تک بھی فارسی نثر میں بہت کم کتابیں لکھی گئیں ۔ اس سے قبل کی جو کتابیں اس وقت تک دریافت ہوئی ہیں یا مختلف مقامات پر موجود ہیں وہ حسب ذیل ہیں ۔

۱ ۔ طبری کی مشہور ”تاریخ الامم والملوک“ کا فارسی ترجمہ جسکو ابو علی بلعمی نے منصور اول سامانی کے حکم سے ۳۵۲ (م ۹۶۳ ۔ ۹۶۴ء) میں کیا تھا ۔

۲ ۔ طبری کی تفسیر کا ترجمہ[۱]

۳ ۔ ابو منصور موفق بن علی ہراتی کی قرابادین یعنی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ“ جو منصور اول ہی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی ۔ اس کا ۴۴۷ھ (م ۱۰۵۵ یا ۱۰۵۶ء) کا لکھا ہوا ایک نسخہ ویانا میں پایا گیا تھا جس کو سیلگمن (Seligmann) نے ۱۸۵۹ء (م ۱۲۷۶ھ) میں نہایت ہی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ۔

۴ ۔ قرآن کی ایک قدیم تفسیر کا حصہ دوم جو کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور جو متذکرۂ بالا کتابوں کے ساتھ ہی یا ان کے قریب ترین زمانہ میں لکھا گیا تھا ۔

۵ ۔ خدائے نامہ کا فارسی ترجمہ جس کو منصور بن نوح کے زمانہ میں طوس کے حاکم ابو منصور بن عبدالرزاق (زمانۂ حکومت ۹۴۴ ۔ ۹۶۰ء) کی فرمائش پر ابو منصور معمری نے کیا ۔ مشہور ہے کہ حاکم طوس نے اس کام کے لئے چار مجوسی موبدوں کو بھی جمع کیا تھا[۲] ۔

۶ ۔ دانش نامہ علائی ۔ جس کو ابن سینا نے عضد الدولہ اصفہانی (متوفی ۴۳۳ھ م ۱۰۴۲ء) کے لئے لکھا تھا[۳] ۔

---

[۱] طبری کی ان دونوں کتابوں کے متعلق ہم اسی مضمون میں آئندہ تفصیل سے بحث کریں گے ۔ [۲] دیکھو حکیم شمس اللہ قادری کا آثار الکرام مطبوعہ ... جلد ۲ حصہ الف

۷۔ خجستہ نامہ بہرامی[1]
۸۔ ترجمان البلاغہ فرخی } یہ دونوں کتابیں فنونِ عروض و بلاغت سے متعلّق ہیں اور ۴۵۰ھ (م ۱۰۵۸ء) کے قریب لکھی گئی ہیں۔

ان کتابوں[2] میں سب سے اہم ابو علی بلعمی کا "ترجمہ تاریخ طبری" ہے۔ بلعمی کے متعلق اِس وقت تک کئی طرح کی غلط فہمیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ اکثر مشہور مستشرقین نے اس کے متعلّق دھوکے کھائے ہیں اور خصوصاً براؤن (اَسُوف علیہ) کو بلعمی کی نسبت کچھ مغالطہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلّق ہم اپنے اس مضمون میں بعض معلومات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

بلعمی کے متعلق مغالطہ تاریخ طبری کے مترجم کا نام دراصل ابو علی محمّد بلعمی ہے۔ لیکن اس کے اور اس کے والد ابو الفضل محمّد بلعمی کے متعلّق اکثر دھوکا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر براؤن جس نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات کی جلد اول (دیکھو صفحہ ۳۵۶) میں اس قسم کا التباس دور کرنے کے لئے ابو علی اور اس کے باپ ابو الفضل کی شخصیتوں کو واضح کر دیا ہے، اسی کتاب کی دوسری جلد میں خود دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اشاریہ (انڈکس) میں ابو الفضل کے نام کے آگے قوسین میں "مترجم تاریخ طبری" لکھا ہے[3]۔ اور پھر متن کتاب میں دیوان ناصر خسرو کے بیان میں "سامانی وزیر ابو الفضل بلعمی مترجم تاریخ طبری" درج ہے[4]۔ حالانکہ تاریخ طبری کا مترجم ابو الفضل نہیں بلکہ اس کا بیٹا ابو علی ہے۔ اسی اشتباہ کے خوف سے مرزا محمّد خاں قزوینی نے ابو الفضل اور ابو علی کی شخصیتوں کو واضح کرتے ہوئے لکھدیا ہے کہ "غالبًا پدر و پسر بیگدگر مشتبہ شوند"[5]۔

نسبت بلعمی کی تحقیق بلعمیوں کا خاندان عربی النسل تھا۔ ان کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنو تمیم سے ملتا ہے جو اس طرح ہے[6] "ابو الفضل محمّد بن عبداللہ بن محمّد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ

---

[1] دیکھو محمد عوفی لباب الالباب مصحح براؤن جلد دوم صفحہ ۹۶۔ [2] ان میں سے بعض کے متعلّق دیکھو براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران حصہ اول۔ صفحات ۱۱ اور ۱۲۔ حصہ دوم صفحہ ۱۱۵۔ [3] دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم صفحہ ۵۴۸۔ [4] دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم صفحہ ۲۴۰

[5] دیکھو۔ مرزا محمد قزوینی حواشی چہار مقالہ مطبوعہ گب موریل سیریز صفحہ ۹۸۔ [6] دیکھو سمعانی۔ کتاب الانساب نسخہ عکسی مطبوعہ گب موریل سیریز صفحہ ۹۰۔

بن عیسیٰ بن رجا، (غالباً رجاء ہوگا) بن معبد بن علوان بن زیاد بن غالب بن قیس بن المندر (جو یقیناً منذر ہے) بن حرب بن حسان بن ہشام بن معیث (جو غالباً مغیث ہوگا) بن الحرث بن زید مناۃ بن تمیم"۔

لفظ بلعمی کے متعلق سمعانی نے کتاب الانساب میں دو روایتیں پیش کی ہیں[1]۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ نسبت قصبۂ بلعمان سے حاصل کی گئی ہے جو مرو کے قریب اور قریہ بلاسجرد کے نشیب میں واقع ہے۔ اور دوسری یہ ہے جو دراصل صحیح ہے کہ بلعم ایشیائے کوچک کے ایک شہر کا نام ہے جس کو بنی تمیم کی ایک شاخ (سمعانی کے قول کے مطابق رجاء بن معبد) نے مشہور اموی سپہ سالار مسلمہ ابن عبدالملک کی ماتحتی میں حاصل کیا تھا اور وہیں آباد ہوگئی تھی۔ چنانچہ ابوالفضل اس تمیمی قبیلہ کی اولاد سے تھا اور اس نسبت سے بلعمی کہلایا جاتا تھا[2]۔ تاریخ مسعود بیہقی[3] اور تاریخ گزیدہ[4] میں بلعمی کے لفظ کے غلط نسخے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اول الذکر میں "بوالعمی" اور موخرالذکر میں اس کا نام اسطرح لکھا ہے "ابوعلی محمد بن محمد بلخی مترجم تاریخ طبری"۔

ابوالفضل بلعمی

ابوالفضل بلعمی کو کتاب الانساب میں غلطی سے سامانی خاندان کے پہلے فرمانروا اسمٰعیل ابن احمد سامانی (المتوفی ۲۹۵ھ م ۹۰۷ء) کا وزیر لکھدیا ہے۔ اور اس بنا پر متاخرین کی کتابوں میں ہر جگہ یہی غلطی پیش ہوتی گئی ہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن نے (دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۳۵۶) ابوالفضل کو اسمٰعیل بن احمد بن اسد سامانی کا وزیر بتلایا ہے۔ اور اسی طرح خانصاحب عبدالمقتدر نے بھی پبلک اورینٹل لائبریری بانکی پور کے کٹلاگ (دیکھو جلد ششم تذکرہ تاریخ طبری) میں ابوالفضل کو امیر اسمٰعیل۔ "بانی خاندان سامانیہ" کا وزیر لکھا ہے۔ مشہور روسی محقق بارٹولڈ، جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لئے بلعمیوں پر ایک مختصر سا مگر مفید مضمون (دیکھو جلد اول صفحہ ۶۱۴) لکھا ہے، یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ سامانیوں کے

---

[1] دیکھو سمعانی۔ کتاب الانساب نسخۂ عکسی۔ مطبوعہ گب موریل سیریز صفحہ ۹۰۔ [2] تفصیل کے لئے دیکھو مضمون بارٹولڈ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ ۶۱۴۔ (۲) مرزا محمد قزوینی۔ حواشی چہار مقالہ مطبوعہ گب موریل سیریز۔ صفحہ ۹۸۔ (۳) مولوی عبدالمقتدر۔ بانکی پور لائبریری کٹلاگ عربی اور فارسی نسخ قلمی جلد ششم صفحہ ۲۔ (۴) پروفیسر محمود شیرانی۔ تنقید شعر العجم رسالہ اردو۔ جلد دوم حصہ ہشتم صفحہ ۶۹۴۔ [3] دیکھو تاریخ مسعود بیہقی مصحح مورلے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۱۰۔ [4] دیکھو نسخہ عکسی مطبوعہ گب موریل صفحہ ۳۰۵۔

تاریخی احوال میں ابوالفضل کا ذکر وزیر کی حیثیت سے سب سے پہلی دفعہ اس خاندان کے تیسرے فرمانروا نصر بن احمد (۳۰۱ تا ۳۳۱ھ م ۹۱۴ تا ۹۴۳ء) کے زمانہ میں پیش ہوتا ہے اس طرح سے کہ ابوالفضل نصر بن احمد کے پہلے وزیر ابوعبداللہ جیہانی کا جانشین تھا۔ ابوالفضل کس سنہ میں مسند وزارت پر متمکن ہوا؟ اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ابن اثیر لکھتا ہے[1] کہ حسین ابن علی جو ربیع الثانی ۳۰۶ھ (م اگست۔ ستمبر ۹۱۸ء) میں شکست کھا کر گرفتار ہوا تھا اس کو وزیر جیہانی ہی نے قید سے آزاد کیا تھا۔ اس کے برخلاف ثعالبی نے اسی حسین کی ایک نظم نقل کی ہے[2] جس میں شاعر نے اپنی رہائی کے متعلق وزیر بلعمی کا شکریہ ادا کیا ہے۔

اس امر کا تصفیہ کرنا کہ حسین ابن علی کو جیہانی نے قید سے چھڑایا یا بلعمی نے، ہمارے اس مضمون کے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن ان دونو بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ابوالفضل بلعمی نصر بن احمد بن اسمٰعیل سامانی کے زمانہ میں ضرور وزیر تھا۔

ابو علی بلعمی ابوالفضل کے بیٹے ابو علی محمد جس کو مقدسی نے "امیرک بلعمی" لکھا ہے[3]، کی وزارت سامانیوں کے چھٹے حکمران عبدالملک بن نوح (۳۴۳۔ ۳۵۰ھ م ۹۵۴۔ ۹۶۱ء) کے آخری عہد حکومت میں شروع ہوتی ہے اور اس کے جانشین منصور بن نوح (۳۵۰۔ ۳۶۵ھ م ۹۶۱۔ ۹۷۶ء) کے زمانہ میں بھی جاری رہتی ہے۔ اس کے متعلق تاریخ گزیدہ میں لکھا ہے[4]:۔ "الوزیر ابو علی محمد ابن محمد بلعمی مترجم تاریخ جریر طبری معاصر منصور ابن عبدالملک سامانی بود" منصور، عبدالملک کا بیٹا نہیں بلکہ بھائی تھا اور اس کے بعد اس کا جانشین ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ حمداللہ مستوفی نے عبدالملک کا جانشین ہونے کے باعث منصور کو اس کا بیٹا خیال کر لیا ہو۔ سامانی خاندان کے متعدد حکمرانوں کے نام ایک ہی ہونے[5] کی وجہ سے قدیم مورخوں نے اس قسم کی کئی غلطیاں کی ہیں۔

ابو علی کی ترقی مشہور حاجب الپتگین (جس نے غزنوی خاندان سلاطین کی بنا ڈالی) کی مرہون منت ہے۔

---

[1] دیکھو تاریخ کامل مصححہ ٹورنبرگ جلد ششم صفحہ ۶۶۔ [2] دیکھو جورنال ایشیاٹیک جلد ۵۔ سیریز ۱۔ صفحہ ۲۰۴۔ [3] دیکھو احسن التقاسیم مصححہ دی خویہ صفحہ ۳۳۸۔ [4] تاریخ گزیدہ۔ مطبوعہ گب موریل سیریز طبع عکس صفحہ ۱۰۱۔ [5] دیکھو شجرہ نسب سامانیاں جو اسی مضمون میں آیندہ صفحہ ۸۵ پر پیش کیا گیا ہے۔

بلعمی اور البتگین نے آپس میں اس امر کا عہد کر لیا تھا کہ ہر کام ایک دوسرے کی استصواب سے کریں گے۔ چنانچہ عبدالملک کی وفات تک بلعمی اپنے دوست البتگین سے مشورہ لیتا رہا۔ لیکن جب منصور تخت نشین ہوا اور البتگین کا تعلق سامانی دربار سے منقطع ہوگیا تو بلعمی کو وزارت کا کام بغیر البتگین کے مشورے کے آزادانہ انجام دینا پڑا۔ مقدسی لکھتا ہے کہ اس موقع پر بلعمی کو بھی عہدہ چھوڑ دینا پڑا تھا اگرچہ کہ بعد میں پھر وزارت اسکے سپرد کی گئی۔

بلعمیوں کی شہرت

نظام الملک نے لکھا ہے[1] کہ بلعمی مشرقی وزراء کے بہترین نمونے تھے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے زیادہ تر عظمت بلعمی اول سے متعلق ہے۔ (مقابلہ کرو تاریخ مسعود بیہقی مصححہ مورلے۔ صفحہ ۱۱۷) وہ اپنے پیشرو وزیر جیہانی اور اپنے آقا نصر بن احمد کی طرح سامانی دور کے بہترین شخصیتوں کی ایک اعلیٰ مثال تھا۔ شعرا اور فضلا کا مربی ہونے کی حیثیت سے اس کو خاص طور پر شہرت حاصل ہے۔ سمعانی نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ[2] "کان واحد عصرہ فی العقل والرائے واجلال العلم"۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے شاعر رودکی (جس نے ۳۲۹ھ میں اسی سال انتقال کیا جس سال ابوالفضل بلعمی نے وفات پائی) کی خاص قدردانی کی ہے اور اس کو عرب و عجم کے تمام شعراء پر ترجیح دی ہے۔ اس زمانہ میں ابوالفضل کی مدح میں رودکی کا ایک قصیدہ بہت مشہور تھا جس کے ایک شعر کی حکیم سوزنی نے بھی اپنے ممدوح (صدر جہاں شمس محمد بن عمر بن عبدالعزیز مازہ) کی تعریف میں تضمین کی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے[3]

در مدح تو بصورت تضمین ادا کنم — یک بیت رودکی را در حق بلعمی

صدر جہاں جہاں ہمہ تاریک شب شدہ است — از بہر ما سپیدہ صادق ہمی دمی

ناصر خسرو بلعمی کے متعلق کہتا ہے

بوالفضل بلعمی بنوانی شدن بفضل — گر نیستی بہ نسبت بوالفضل بلعمی[3]

ابو منصور ثعالبی نے "کتاب النثر النظم" میں ابوالفضل بلعمی کے متعلق ابی احمد بن ابی بکر الکاتب کے

---

[1] دیکھو سیاست نامہ مصححہ شیفر صفحہ ۱۵۰۔ [2] کتاب الانساب نسخہ عکسی مطبوعہ گب میموریل سیریز صفحہ ۹۰۔ [3] تنقید شعر العجم جناب محمود شیرانی رسالہ اردو۔ جلد دوم۔ حصہ ہشتم صفحہ ۳۹۴۔

حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں[1]:-

یا ابا الفضل لک الفضل المبین	وبما تکنی بہ انت قمین
لیس تخلو من زکاۃ نعمۃ	اوجبت شکراً الرب العالمین
فزکاۃ المال من اضافہ	وزکاۃ الجاہ رفد المستعین

مرو اور بخارا میں ابو الفضل نے جو عمارتیں بنائی تھیں اُن کا بیان اصطخری نے خاص طور پر کیا ہے[2] وہ ابو الفضل کو "الشیخ الجلیل" لکھتا ہے۔ بخارا کے ایک دروازہ شیخ الجلال کا نام بہت ممکن ہے کہ اسی بلعمی سے متعلق ہو۔ ابن اثیر کے قول کے مطابق[3] بلعمی اول کو ۳۲۶ (م ۹۳۷-۹۳۸ء) میں عہدہ وزارت چھوڑ دینا پڑا تھا۔ اور سمعانی کی روایت کے مطابق اُس نے دسویں صفر ۳۲۹ (م ۱۴ نومبر ۹۴۰ء) کو وفات پائی۔ اس کی اولاد سمعانی (۵۰۵ م ۱۱۵۵ء) کے زمانہ تک زندہ تھی۔ اس کے بیٹے ابو علی بلعمی کے متعلق سمعانی نے کوئی ذکر نہیں کیا اور دیگر مورخین نے بھی اس کی وزارت کے کارناموں کے نسبت کچھ نہیں لکھا اس کی تمام شہرت یا تو صرف اس کے باپ کی وجہ سے ہے یا مشہور تاریخ طبری کے ترجمہ کے باعث[4]۔

ابو علی کی تاریخ وفات کے متعلق اختلافات

گردیزی کے خیال کے مطابق[5] ابو علی بلعمی جمادی (الاول یا الثانی) ۳۶۳ (م ۲۷ فروری یا مارچ ۹۷۴ء) میں اپنی وزارت کے زمانہ ہی میں انتقال کر گیا[6]۔ اس کے برخلاف عتبی کہتا ہے[7] کہ ابو علی دوبارہ ۳۸۲ (م ۹۹۲ء) میں نوح بن منصور (۳۶۵-۳۸۷ م ۹۷۶-۹۹۷ء) کے زمانہ میں وزیر بنایا گیا تھا۔ لیکن اسی سال تھوڑے دنوں کے بعد ہی مستعفی ہو گیا۔ کیونکہ ایلک خانی حملوں کی وجہ سے اس وقت سامانی حکومت کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی

۱۔ دیکھو کتاب النثر النظم وحل العقد مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ء۔ صفحہ ۲۵۔......... ۲۔ دیکھو کتاب المسالک والممالک مصححہ دی خویہ۔ صفحات ۲۶۰ اور ۳۰۱

۳۔ دیکھو تاریخ کامل جلد ۸ صفحہ ۲۸۳۔.......... ۴۔ دیکھو مضمون بارٹولڈ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام صفحہ ۶۱۴۔

۵۔ زین الاخبار نسخہ بوڈلین لائبریری اکسفورڈ صفحہ ۱۲۹۔......... ۶۔ دیکھو ڈسکرپٹیو کٹلاگ آف پرشین مینو سکرپٹس کتب خانہ

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال صفحہ ۱......... ۷۔ تاریخ یمینی معہ شرح منینی طبع قاہرہ۔ ۱۲۸۶ء۔ اول صفحہ ۱۸۶۔

اور بلعمی کا خیال تھا کہ وہ ایسے خطرناک زمانہ میں کامیابی کے ساتھ وزارت نہیں کر سکتا۔ لیکن ان تمام واقعات کے تذکرہ کے باوجود عتبی نے بلعمی کی تاریخ وفات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کی وفات کی تاریخ ۳۸۶ھ (م ۹۹۶ء) جو عام طور پر پیش کی گئی ہے اور خصوصاً ریو (دیکھو برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد اول۔ صفحہ ۷۰) ایتھے (دیکھو گرنڈرس ڈر ایرانشین فیلالوجی جلد دوم۔ صفحہ ۳۵۵) اور براؤن (دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۳۵۶) نے جس کا تذکرہ کیا ہے' دراصل ابوعلی سیمجوری کی تاریخ وفات ہے اور مغالطہ کی وجہ سے ابوعلی بلعمی سے منسوب کر دی گئی ہے۔ اس کے متعلق مشہور روسی مستشرق بارٹولڈ نے ابوعلی بلعمی (دیکھو صفحہ ۶۱۴) اور ابوعلی سیمجوری (دیکھو صفحہ ۷۷) پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جو مضامین لکھے ہیں' ان میں وضاحت کر دی ہے۔

تاریخ طبری امام ابوجعفر بن جریر الطبری ۲۲۴ یا ۲۲۵ (م ۸۳۸ء) میں آمول (طبرستان) میں پیدا ہوئے اور بغداد میں ۳۱۰ھ (م ۹۲۱ء) میں انتقال کیا۔[1] تاریخ طبری کے سنہ تصنیف میں اختلافات ہیں۔ معجم الادبا میں لکھا ہے "وفرغ من تصنیف کتاب التاریخ ومن عرضه علیه فی یوم الاربعاء لثلاث بقین من شهر ربیع الاخر ۳۰۳ھ......... الخ" (دیکھو صفحہ ۴۲۶) سور لے لکھتا ہے کہ طبری نے یہ تاریخ ۳۰۰ھ (م ۹۱۲ء) کے قریب لکھی لیکن حاجی خلیفہ نے اس کی تصنیف کی تاریخ ۳۰۹ھ (م ۹۲۱ء) لکھی ہے۔ اور تعجب ہے کہ باوجود یاقوت کے مستند بیان کے بانکی پور لائبریری کے کیٹلاگ میں اسی کو زیادہ صحیح تسلیم کیا گیا۔[2]

بعض مورخین کا خیال ہے کہ طبری نے اپنی تاریخ کا نام "تاریخ الامم والملوک" رکھا۔[3] اور بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا نام "اخبار الرسل والملوک" ہے۔[4] حاجی خلیفہ نے ابن سبکی کی روایت پر (مقابلہ کرو معجم الادبا جلد ششم۔ صفحہ ۴۲۵) لکھا ہے کہ تاریخ طبری دراصل تیس ہزار اوراق پر مشتمل تھی اور اس وقت جو تاریخ طبری

---

[1] دیکھو ارشاد الاریب الی معرفة الادیب المعروف بہ معجم الادبا یاقوت الرومی مطبوعہ گب موریل سیریز جلد ششم۔ صفحات ۴۲۳۔ اور ۴۲۸۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھو کیٹلاگ آف پرشین عربک مینوسکرپٹس بانکی پور لائبریری۔ جلد ۶۔ [3] دیکھو (۱) معجم الادبا مطبوعہ گب موریل سیریز جلد ششم۔ صفحہ ۴۴۴۔ (۲) کشف الظنون۔ حاجی خلیفہ جلد دوم صفحہ ۱۳۶۔ [4] براکلمن۔ جلد اول صفحہ ۱۴۲۔

پائی جاتی ہے وہ اصل تاریخ کا خلاصہ ہے جو خود طبری نے کیا تھا۔[۱]

تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ

خلافت عباسیہ کے کمزور ہو جانے کے بعد جو جو مرکزی حکومتیں قائم ہوئیں، ان سب میں سامانیوں کو خاص طور پر امتیاز حاصل ہے۔ جس طرح اردو زبان میں غدر کے زمانہ تک تصنیف و تالیف کرنا معیوب خیال کیا جاتا تھا، ایران میں سامانی عہد تک عربیت کا اس قدر گہرا اثر چھایا ہوا تھا کہ فارسی میں نثر کی کوئی کتاب لکھنی تو کجا فارسی شعر و سخن کا ذوق شوق بھی عالموں اور فاضلوں کی شان کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ تک ایک کتاب بھی فارسی نثر میں نہیں لکھی گئی اور جس قدر فارسی شاعر گزرے ان کی قدر و منزلت اتنی نہیں کی گئی جتنی کے بعد کے زمانہ میں کی جاتی ہے۔

یہ سامانی حکمران تھے جنہوں نے فارسیت کو بہت زیادہ فروغ بخشا۔ وہ اپنے تئیں ہر طرح سے ایران کے قدیم ساسانی بادشاہوں کے جانشین ثابت کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہر اس چیز کی جو خالص ایرانی ہوتی تھی خاص طور پر قدر کی۔ عربیت کا جو گہرا اثر ایران اور ایرانیوں پر پڑ چکا تھا اس کا ردعمل کرنا چاہا۔ قدیم ایرانی معاشرت کے احیاء کی کوشش کی اور ایرانیوں کے دل میں اس بات کو جاگزیں کر دیا کہ گویا اب پھر قدیم ایرانی قومی سلطنت ازسرنو زندہ ہو گئی ہے۔

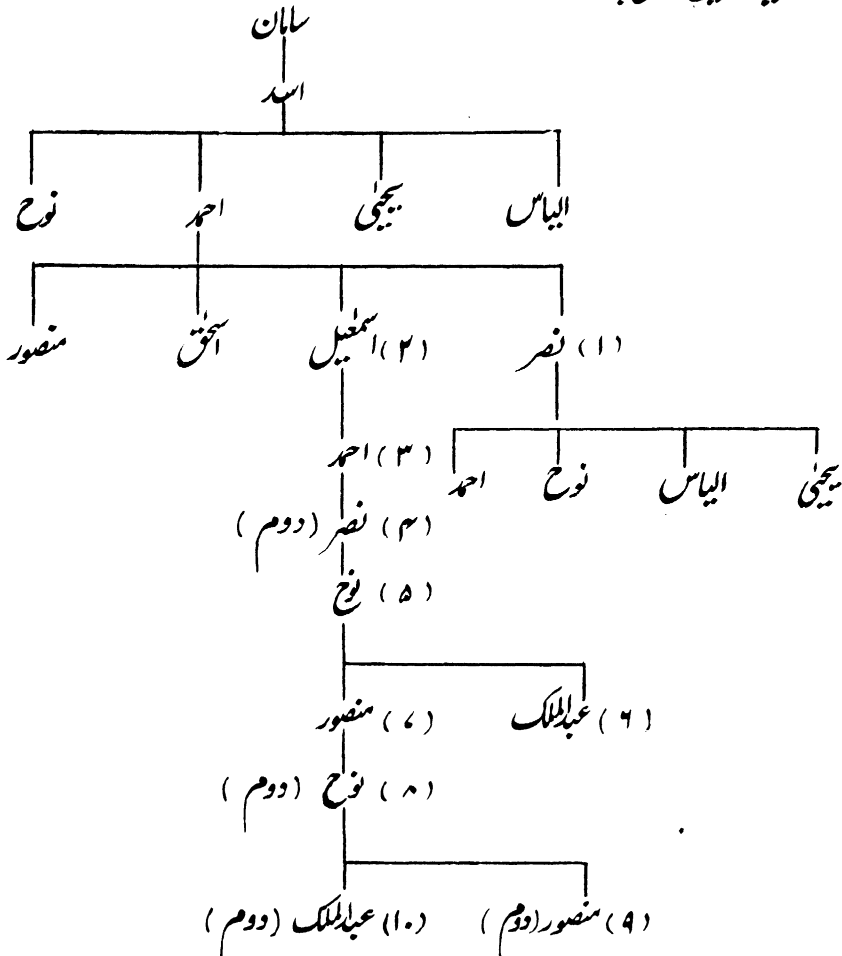
یوں تو اس خاندان کے تمام حکمراں روشن خیال اور علم پرور تھے[۲] لیکن ساتویں فرمانروا منصور بن نوح

---

[۱] اس امر کے متعلق ارتھ ناٹ سامانیوں کے علمی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے (دیکھو پرشین پورٹریٹس صفحہ ۱۱) کہ امیر نصر نے تاریخ طبری کا خلاصہ کے طور پر ترجمہ کیا تھا اور اپنے اس بیان کے متعلق ذیل میں لکھتا ہے کہ "تاریخ طبری در اصل عربی زبان میں لکھی گئی، اس کو خلاصہ کے طور پر امیر نصر بن احمد سامانی نے فارسی میں لکھا۔ اس کے علاوہ اس کا اور ایک ترجمہ ابو علی وزیر منصور بن نوح نے کیا اس کے بعد ابو محمد تبریتی نے ۱۱۱۸ء (م ۵۱۲ ق) میں کیا اور سب کے آخر میں ابو عبداللہ صالح بن محمد نے کیا۔"

ارتھ ناٹ نے یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں لکھی اور دیباچہ میں پچیس[۲۵] تیس[۳۰] مستشرقین کے نام لکھے ہیں جن کی تحقیقات سے اس نے اپنی کتاب میں مدد لی تھی۔ لیکن کتاب کے متن میں اس نے کہیں کسی کا حوالہ یا سند نہیں پیش کی اور جا بجا اس قدر غلطیاں کی ہیں کہ اس وقت اس کی کتاب سے کچھ نقل کرنا یا اس کا حوالہ دینا بھی بیکار ہے۔ [۲] اس خاندان کی علمی خدمات کے متعلق کتاب "سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب" میں کافی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔

(۳۵۰ - ۳۶۵ھ م ۹۶۱ - ۹۷۶ء) کے زمانہ میں یہ روشن خیالی اور علم پروری معراج کمال کو پہنچ گئی تھی ۔ چونکہ اس مضمون میں سامانی خاندان کے فرمانرواؤں کا اکثر تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سلسلہ نسب کو واضح کر دیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر حکمران کے نام کے ساتھ اس کے تقدم و تاخر اور تعلقات کی نسبت واقفیت میں آسانی ہو۔



منصور بن نوح (اول) کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فارسی زبان میں باضابطہ نثر نگاری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ چنانچہ اس کے زمانہ کی کئی نثری کتابوں میں سب سے زیادہ اہم تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ ہے جس کے لئے ۳۵۲ھ (م ۹۶۳ء) میں منصور نے اپنے نائب ابوالحسن فائق کے ذریعہ وزیر بلعمی کو

حکم دیا تھا[1]۔ بلعمی نے تاریخ طبری کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ نئے نئے عنوانات کا اضافہ کر کے ایک حد تک اصل کتاب کی ترتیب بھی بدل دی۔ اُس نے اِس تاریخ کو کئی چھوٹی بڑی فصلوں پر منقسم کر دیا اور اِس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا کہ واقعات سنین وار ترتیب کے ساتھ پیش کئے جائیں۔ چنانچہ اس کے ضمن میں اُس نے اپنے زمانے کے جدید حالات سے بھی مدد حاصل کی ہے۔ اصل کتاب کے عربی اشعار اور دیگر عناصر کو بالکل ترک کر دیا ہے اور اگرچہ بہت سا نیا مواد بھی داخل کیا لیکن بجائے اصل کتاب سے ترجمہ کا حجم زیادہ ہونے کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ طبری فارسی زبان میں بالکل خلاصہ کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

تاریخ طبری میں بلعمی کے بعد دو تین دفعہ صلہ اور ذیل کے نام سے اور بھی اضافے کئے گئے ہیں چنانچہ اس کے متعلق اسی مضمون میں ایک جگہ ذیل میں ارتھ ناٹ کا خیال پیش کیا جا چکا ہے لیکن کتب خانہ بانکی پور کی عربی اور فارسی کتابوں کے کٹلاگ (جلد ششم) میں حاجی خلیفہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو محمد عبداللہ ابن محمد الفرغانی نے اس تاریخ میں "الصلۃ" کے عنوان سے اور اضافہ کیا ہے اور اِس طرح ابو الحسن محمد بن عبدالملک بن ابراہیم بن احمد الہمدانی نے بھی، جس کا انتقال ۵۲۱ھ (م ۱۱۲۷ء) میں ہوا اس میں عباسی خلیفہ مستظہر باللہ (۴۸۷ – ۵۱۲ھ م ۱۰۹۴ – ۱۱۱۸ء) کے زمانہ تک کے حالات کا اضافہ کیا ہے[2]۔

تاریخ طبری کے اور ترجمے

(۱) بلعمی کی فارسی تاریخ طبری کا ایک عثمانی ترکی ترجمہ قسطنطنیہ سے ۱۲۶۰ھ (م ۱۸۴۳ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر جی روزن نے بھی کیا ہے۔

(۲) ایک اور مشرقی ترکی ترجمہ (جو ۹۲۸ھ م ۱۵۲۱ء میں کیا گیا تھا) کا ذکر کوسگارٹن نے اپنی کتاب طبرستانسس انیلس (Taberist anensis Anneles) صفحہ ۱۰ میں کیا ہے۔

(۳) فرانسیسی زبان میں ایم۔ ہرماں۔ زوتن برگ نے ترجمہ کر کے ۱۲۸۴ھ (م ۱۸۶۷ء) میں چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔

---

[1] دیکھو کٹلاگ بانکی پور لائبریری پرشین اور عربک مینوسکرپٹس جلد ششم۔ صفحہ ۲۔

[2] دیکھو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (جہاں بلعمی کے ترجمے کے دو نسخے موجود ہیں) کے فارسی مینوسکرپٹس کا ڈسکرپٹیو کٹلاگ صفحہ اول۔

ترجمہ تاریخ طبری اور بلعمی کے متعلق معلومات

بلعمی اور اس کے ترجمہ تاریخ طبری وغیرہ کے متعلق چند یورپین و دیگر محققین کی کتابوں کے حوالے حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) سینٹ پیٹرس برگ کٹلاگ پرشین مینوسکرپٹس صفحات ۲۶۰ تا ۲۶۴
(۲) برٹش میوزیم (لنڈن) پرشین مینوسکرپٹس جلد اول صفحہ ۶۸
(۳) بوڈلین لائبریری (اکسفورڈ) ,, ,, ,, ,, ,, نمبر ۲ تا ۱۳
(۴) ببلیوتھیک نیشونیل (پیرس) کٹلاگ پرشین مینوسکرپت۔ جلد اول نمبر ۲۳۸ تا ۲۴۴
(۵) ویٖنا لائبریری کٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹس جلد دوم صفحہ ۴۶
(۶) انڈیا آفس لائبریری کٹلاگ آف ,, ,, ,, ,, اول نمبر ۲ تا ۱۳
(۷) بانکی پور لائبریری ,, ,, ,, ,, ,, ششم نمبر ۴۴۹ اور ۴۵۰
(۸) ڈسکرپٹیو ,, ,, ,, ایشیاٹک سوسائٹی بنگال صفحہ ۱۔
(۹) کشف الظنون حاجی خلیفہ جلد دوم صفحہ ۱۳۶
(۱۰) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ براکلمن جلد اول صفحہ ۱۴۲
(۱۱) اسپرنگر جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۱۷۔ حصہ ۲۔ صفحات ۴۳۷ تا ۴۴۱
(۱۲) بارتولڈ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ ۶۱۴
(۱۳) براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اول صفحات ۱۱۔ ۱۱۰۔ ۳۵۶۔ جلد دوم صفحات ۳۶۸ تا ۳۶۹
(۱۴) زوتن برگ اور دیو بے کے فرانسیسی ترجمۂ تاریخ طبری کا مقدمہ
(۱۵) آقا میرزا محمد قزوینی حواشی چہار مقالہ صفحہ ۹۸
(۱۶) کوسگارٹن۔ طبرستانسس انلیس (مطبوعہ ۱۸۳۱ء) کے تمہیدی صفحات نمبر ۱۰۔ ۱۱

بلعمی کے دوسرے فارسی کارنامے

ترجمہ تاریخ طبری کے علاوہ ابو علی بلعمی سے دو اور ترجمے منسوب کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک بیدپائے کی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ ارتیھ نا ٹ نے لکھا ہے[1] کہ

---

[1] دیکھو پرشین پورٹریٹس مطبوعہ ۱۸۸۷ء صفحہ ۱۱

سامانیوں کے زمانہ میں مشہور شاعر رودکی نے بیدپائے کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا اور وزیر بلعمی نے نثر میں۔ لیکن جس طرح پہلے بھی ہم نے ذکر کیا ہے اربتھ ناٹ اپنے بیانات کا کوئی حوالہ نہیں دیتا چنانچہ اس کے اس بیان کی بھی کہ بلعمی نے بیدپائے کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا کہیں تصدیق نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں کہ خود اس کو یہ بات کس ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی۔

فارسی نثر کا ایک اور کارنامہ جو ابوعلی بلعمی سے منسوب کیا جاتا ہے تفسیر طبری کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا ذکر براؤن جیسے مستند مستشرق نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران کی جلد دوم صفحہ ۱۱۵ میں کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی پہلے کی طرح سہو نظر معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوائے براؤن کی کتاب کے اس ذکر کے کہیں اور اس کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ خود پروفیسر براؤن نے اسی کتاب کے حصہ اول صفحہ ۴۸۰ میں ترجمہ تفسیر طبری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا اس کا مترجم ابوعلی بلعمی نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے چنانچہ وہ کہتا ہے: "طبری کی تفسیر کا ترجمہ اسی زمانہ میں کیا گیا تھا جب کہ بلعمی نے اس مشہور مورخ اور فاضل کی تاریخ کا ترجمہ کیا تھا"۔ برٹش میوزیم (جہاں اس تفسیر کا ایک قلمی نسخہ پائے جانے کے متعلق براؤن نے اسی ذکر میں حوالہ دیا ہے) کے کٹلاگ میں ترجمہ تفسیر طبری کے متعلق جو لکھا ہے[۱] اس کا ترجمہ یہ ہے :-

> "ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی تفسیر قرآن کا فارسی ترجمہ۔ پہلے کے دو صفحوں میں مصنف کا عربی دیباچہ ہے جو الحمد للہ الذی افتتح بالحمد کتابہ وحمد نفسہ حین انزل خطابہ سے شروع ہوتا ہے۔ اسکے بعد ایک صفحہ کا فارسی دیباچہ ہے جس میں ترجمہ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ اصل عربی کتاب جو چالیس جلدوں میں تھی بغداد سے امیر ملک مظفر ابوصالح منصور بن نوح (وہی سامانی امیر جس کے لئے طبری کی تاریخ کا ترجمہ کیا گیا تھا) کے دربار میں لائی گئی۔ امیر نے علمائے ماوراءالنہر سے اس کے فارسی میں ترجمہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا جب انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا تو حکم دیا کہ اپنے میں سے چند ایسے افراد کا انتخاب کریں جو اس کام کے لئے موزوں ترین ہوں"۔

براؤن نے اس عبارت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے پڑھنے سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے ان چند افراد میں سے جو ترجمہ تفسیر طبری کیلئے منتخب کئے گئے تھے ابوعلی بلعمی بھی ایک ہو لیکن اس میں بھی شبہ ہے بلیوتھیک نیشونیل پیرس کے

---

[۱] دیکھو برٹش میوزیم۔ کٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹس جلد اول صفحہ ۸۔

کٹلاگ میں[1] تفسیر طبری کے دیباچہ کی یہ عبارت نقل کرتے ہوئے :۔

"این کتاب تفسیر بزرگ است از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کردہ
بزبان پارسی و دری راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بود این کتاب نبشتہ
بزبان تازی و باسنادہای دراز بود و بیاوردندے سوئے امیر سید مظفر ابو صالح منصور بن نوح بن
نصر بن احمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔۔۔۔ و چناں خواست کہ مرین را ترجمہ کردند بزبان پارسی
پس علماء ماوراء النہر را گرد کرد و این از ایشان فتویٰ کرد کی روا باشد کی این کتاب را بزبان پارسی
گردانیم گفتند روا باشد خواندن و نبشتن تفسیر قرآن بپارسی مران کسے را کی او تازی نداند۔۔۔۔۔۔"

لکھا ہے کہ فارسی زبان میں ترجمہ کو جائز قرار دینے کی بابت حسب ذیل شخصیتوں کے ناموں کا ذکر کافی ہے ۔
ابو بکر محمد ابن فضل الامام ۔ محمد بن اسمٰعیل ۔ ابو بکر احمد ابن حامد ۔ خلیل ابن احمد سجستانی ۔ ابو جعفر محمد ابن علی باب الہند
ابو الجہم خالد ابن ہانی ۔ ان تمام نے چند ایسے افراد کا انتخاب کیا جو فارسی میں ترجمہ کر سکتے تھے ۔ غرض اس تذکرہ میں
بھی اُن علماء کے نام نہیں دئے گئے جنہوں نے تفسیر طبری کا ترجمہ کیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ منصور نے
سمرقند، اسیجاب اور[2] فرغانہ سے علمائے وقت کو طلب کر کے اس تفسیر کا ترجمہ کرایا تھا لیکن اس امر کا کہیں پتہ
نہیں چلتا کہ آیا ابو علی بلعمی کا بھی اس ترجمہ میں کوئی حصہ ہے یا نہیں ؟

۱؎ دیکھو جلد اول صفحہ ۱۶ ۔

۲؎ دیکھو آثار الکرام شمس اللہ قادری صاحب مطبوعہ اردو ۔ باب اول صفحہ ۳۶۰ ۔

سرگزشت پھول کی

از جناب ابوالکلام محمد بدرالدین صاحب بدر متعلم بی اے

ظلمتِ شب سے ہے لرزاں دلِ نازک میرا
مجھے تاروں کی یہ چشمک نہیں بھاتی اصلا
کانپتا ہوں جو فلک پر کوئی تارا ٹوٹا
حسرت آلودہ ہے کچھ آج قمر کا چہرہ
اوس پڑتی ہے مسلسل کہ فلک روتا ہے   صبح تک خیر نہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے
آہ فطرت نے مجھے آنکھ کا تارا سمجھا
تختۂ گل تھا مرے واسطے اک گہوارہ
جھونکے دیتی تھی وہ جنگل کی پری ٹھنڈی ہوا
ایسے نازوں سے میں وادی میں پلا اور بڑھا
رس جو ٹپکا تو مرے داغِ جگر دھلنے لگے   حوصلہ بڑھنے لگا بندِ قبا کھلنے لگے
سانس چلنے لگی رحمت کی ہوا آنے لگی
رنگ چڑھتا گیا صورت مری شرمانے لگی
دیدبازی مجھے خورشید کی کچھ بھانے لگی
خودنمائی مرے نیرنگ کو جھلکانے لگی

ہائے ایسے میں کوئی کیوں مجھے برباد کرے
تن بتقدیر ہوں گلچیں کو خدا شاد کرے

صورتیں وہ کہ کریں حورِ جناں بھی تعریف
موت کے ہاتھ نے چھینا تھا جنھیں نیکے حریف
رگ و ریشہ میں ہے مٹی کے وہی خونِ شریف
مجھے دیکھو کہ اُسی خاک کی ہوں رُوحِ لطیف

لاکھ جانیں ہیں نہاں مجھ سے بھی بے جانوں میں
دوڑتی پھرتی ہیں رو جیں مری شریانوں میں

چیر کر دل مرا کوئی تو تماشا دیکھے
کتنے جلوے ہیں مرے طور پہ پیدا دیکھے
میری اِس ننھی سی ہستی میں ہے کیا کیا دیکھے
دیکھنے والا اگر دیکھے تو دنیا دیکھے

ہوں تو ہنس مکھ ہی مگر چاک ہے سینہ میرا
یہ بھی اک راز ہے کانٹوں پہ ہے جینا میرا

کیا وہ جینا جو نہ ہنگامہ ہو برپا یارب
ایسے جینے سے تو بہتر ہے نہ جینا یارب
حُسن کو نرم بنا عشق کو گرما یارب
خیر یوں ہی سہی گر ہے ترا منشا یارب

عشق کو آگ میں جلنے کے لئے شیدا کر
حسن کو خاک میں ملنے کے لئے پیدا کر

تخیّل اور داستان امیر حمزہ

(از جناب سیّد وفار احمد صاحب متعلم ام۔ اے)

کہا گیا ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے چنانچہ مالک نے تقریباً اپنی تمام صفات بندہ میں ودیعت کی ہیں۔ اور صفات کی شہادت تو شاید آسانی سے مل جائے لیکن یہاں خدا کی صفت خلاقی سے بحث ہے جو اس کی ایک عظیم الشّان صفت ہے۔ خلق کے معنی کسی معدوم شئے کو پیدا کرنا ہے۔ اب انسان کے متعلّق دیکھنا چاہیئے کہ یہ کن چیزوں کو خلق کرسکتا ہے۔ دانہ کو زمین میں بونا خلق کرنا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں تمام کام فطرت کے قوانین کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ انسان کے ذہن کی پیداوار البتہ اس کی اپنی پیداکی ہوئی ہے۔ کوئی نظم لکھنی کوئی قصہ گھڑنا انسان ہی کے دماغ کا کام ہے اور جو قوت یہ کام کرتی ہے اس کو اصطلاح میں تخیل کہتے ہیں۔ یہ وہ قوت ہے جس کا ہونا خصوصاً شاعر، تمثیل نگار، ناول نویس اور ہر ادبی آدمی کے لئے ضروری ہے۔

تخیل کی تعریف کرنی مشکل ہے۔ رسکن[1] کہتا ہے "تخیلی قوت کی روح بالکل مبہم اور ناقابل تفہیم ہے اس کو ہم صرف اثر کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں"۔

تخیل کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا بلکہ دماغ میں دنیا کی کثیر التعداد اشیاء کے جو تصورات ہوتے ہیں انہیں کو تخیل مختلف طور پر جمع کرکے پیش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا جمع کرنا یا آمیزش کرکے نئی صورت گھڑنا دو طرح کا

---

[1] (John Ruskin)

ہوتا ہے ۔ ایک تو یہ کسی پہلی دیکھی ہوئی یا محسوس کی ہوئی چیز کی ہو بہو تصویر دماغ میں پیدا کر دے مثلاً اگر کسی شخص نے تاج محل دیکھا ہوا اور پھر وہ اپنے تصور میں تاج محل کی تصویر قائم کرے ۔ اس کو محاکاتی تخیل کہتے ہیں ۔ بیانیہ شاعری کی تمام تر عمارت اسی قسم کے تخیل پر مبنی ہے ۔ دوسری صورت تخیل کی یہ ہے کہ انسان اپنی دیکھی ہوئی اشیاء سے اپنی پسند کے موافق اس کے لوازمات کو اپنے ذہن میں علیحدہ کرلے اور ان کو ترتیب دیکر ایک نئی چیز پیدا کرے مثلاً ایک شخص اپنے ذہن میں ایک ایسے جانور کا تصور پیدا کر سکتا ہے جس کا منہ بندر کا سونڈ ہاتھی کی، کان گھوڑے کے، پیر ہرن کے اور بدن انسان کا ہو ۔ ایسے تخیل کو جو مختلف اجزا جمع کر کے نئی چیز پیدا کرتا ہے تخلیقی یا اختراعی تخیل کہتے ہیں ۔

ادب میں محاکاتی تخیل کی کچھ کم اہمیت نہیں لیکن وہ تخلیقی تخیل کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ درجہ کا ہے محاکات میں تخیل کا کام اصل شئے کی پابندی کے ساتھ نقالی کرنا ہے ۔ لیکن انسان کے خالق ہونے کی صفت کامل طور پر تخلیقی تخیل سے ظاہر ہوتی ہے ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر قسم کا تخلیقی تخیل قابل قدر ہے ۔ تخلیقی تخیل کو قابل قدر بنانے کے لئے چند قواعد ضروری ہیں ۔ اگر یہ قواعد نہ ہوں تو جیسا کہ شکسپیر نے کہا ہے " دیوانہ عاشق اور شاعر تینوں کا درجہ مساوی ہو جائیگا " اس میں شک نہیں کہ تخیل تینوں کا یکساں ہوتا ہے لیکن دیوانہ کا تخیل بے لگام اور غیر منتظم ہوتا ہے ۔ وہ بلا سبب کبھی جانور پیدا کرتا ہے کبھی انسان کبھی کوئی درخت اور اسی طرح دنیا کی اشیاء سے عجیب عجیب مرقعے ۔ عاشق کا تخیل اتنا بے لگام نہیں ہوتا، اس کی جولانگاہ معشوق اور اس کے متعلقات ہوتے ہیں اس جولانگاہ میں عاشق کا تخیل بھی دیوانہ کی طرح بے لگام ہوتا ہے ۔ کبھی کہیں اور کبھی کہیں ۔ برخلاف ان دونوں کے شاعر کا تخیل سدھایا ہوا اور منتظم ہوتا ہے ۔ وہ دنیا کو غور سے دیکھتا ہے ۔ فطرت کے قوانین سے آگاہ ہوتا ہے ۔ زندگی کے اسرار سے واقف ہوتا ہے ۔ تب کہیں خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے مقابلہ میں اپنی ایک اور دنیا پیدا کرتا ہے، جو تقریباً ویسی ہی ہوتی ہے ۔ اس کے انسان خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کی طرح زندہ اور ذی روح ہوتے ہیں ۔ ویسا ہی عمل کرتے رہتے، سہتے، سوچتے، اور غور کرتے ہیں جیسے کہ دنیا کے واقعی انسان اگر دنیا میں ویسے ہی حالات پیدا کر دئے جائیں جو شاعر نے اپنی تصنیف میں پیدا کئے ہیں تو ان حالات میں دنیا میں بھی ویسا ہی انسان پیدا ہوگا جو شاعر نے پیدا کیا ہے ۔ یہی ہے وہ نکتہ

جس کی بنا پر شعرا کو تلامذہ الرحمٰن کہا گیا ہے۔

شکسپیر کے ڈراما، ہملٹ کو لیجیے اس میں اس کے ہیرو ہملٹ کو دیکھیے جو واقعات اس پر گزرے ہیں، کیا وہ ایسے نہیں کہ اچھے خاصے انسان کو پاگل بنا دیں اور ایسے دماغی خلجان میں اگر کوئی انسان واقعی مبتلا ہو جائے تو کیا وہ خودکشی کا ارادہ نہ کریگا؟ جولیس سیزر کو لیجیے، بروٹس اگرچہ سیزر کا دوست ہے مگر وطن پرستی اور آزادی اس پر غالب ہے۔ جب مختلف طریقوں سے اس کو باور کرایا گیا کہ سیزر ملک کو غلام بنا رہا ہے" تو اُٹھ اور ملک کو بچا" اس صورت میں ایسے اعلیٰ خاندان اور بلند خیال والے انسان کا کیا فریضہ ہوگا، بیچارے نے ملک پر دوستی کو قربان کیا اور اپنے محسن دوست کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بروٹس کو آپ محسن کش یا غدار نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح میکبتھ کو لیجیے، میکبتھ بذات خود نیک انسان تھا لیکن اسی میکبتھ نے انتہائی بزدلی اور کمینہ پن سے اپنے مہربان بادشاہ کو قتل کیا۔

غرض بڑا کمال شاعر کا یہ ہے کہ پہلے تو وہ زندگی کو سمجھے فطرت کے قوانین سے واقف ہو اور اس علم کو صحیح طور پر اپنے تخیل پر منطبق کرے۔ تب کہیں وہ تخیل تخلیقی تخیل ہوگا۔ اور اس سے وہ جواہر پارے نکلیں گے جن کی چمک رہتی دنیا تک باقی رہیگی۔

اس میں شک نہیں کہ تمثیل نگار یا ناول نویس اپنے ذہنی ذخیرہ سے چند باتوں کو منتخب کرتا ہے، مگر یہ عمل بالکل غیر شعوری ہوتا ہے۔ رسکن نے شاعروں اور صناعوں کے تخیل کی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ اپنی زندگی میں سنتے اور دیکھتے ہیں وہ تمام چیزیں ان کے حافظے کے غیر محدود ذخیرہ میں محفوظ رہتی ہیں، اس کو وہ وقت پر استعمال کرتے ہیں۔

جب مشاہدہ تجربہ اور نتائج اس طرح مرتب کئے جائیں کہ اس سے ایک نئی چیز پیدا ہو جائے تو یہ تخلیق ہے۔ تخلیقی تخیل کے امکانات غیر محدود ہیں۔ ہر فرد کی حقیقی زندگی کو جس قدر چاہیں گھٹا بڑھا کر تخیل کی دنیا میں لاسکتے ہیں۔ حقیقت میں تخیل ہی ہمارے دماغی عمل کا کارفرما ہے۔ ہم اشیاء کو ہمیشہ اپنے خیال میں جوڑتے اور ان کو ایک تخیلی صورت دیتے رہتے ہیں اور ان سے نتائج مستنبط کرتے ہیں کہ فلاں چیز کیسی ہوگی یا فلاں چیز کیسی ہوسکتی ہے۔ اکثر دماغ ایسے ہوتے ہیں جو کوئی زندہ تصویر پیش نہیں کر سکتے۔

اس لئے اس کا کوئی مدامی اثر ہمارے جذبات پر نہیں ہوتا۔ مگر شاعر یا تمثیل نگار اس راز سے واقف ہوتا ہے کہ اپنی تخیلی دنیا کو اس طرح پیش کرے جو حقیقت کی تصویر ہو یا اس سے بھی زیادہ دلچسپ۔

ہم خواب میں اپنے گذشتہ تجربہ کی بنا پر بعض اوقات ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور اصلی رنگ میں دکھائی دیتی ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مگر جب خواب کی حالت گزر جاتی ہے اور پھر ہم وہی حالت اپنے آپ پر طاری کرنا چاہتے ہیں تو وہ صورت ناممکن ہو جاتی ہے کیوں کہ اب ہمیں خواب کی چیزوں کو استدلال کی کسوٹی پر کسنا پڑتا ہے مگر خواب کی حالت میں ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم خواب میں ڈرتے اور خوش ہوتے ہیں مگر کبھی استعجاب نہیں ظاہر کرتے اس کی یہ وجہ ہے کہ اس وقت ہماری اشیاء کو مقابلہ کرنے اور ان کے معقول سمجھنے کی استدلالی قوت غائب ہو جاتی ہے۔ جب ہم سوتے ہیں تو ہمارا تخیل عمل پیرا رہتا ہے مگر ہماری استدلالی قوت سو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا تخیل خواب میں ایسی وہی اور واہی تباہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا تعلق قانون فطرت کے قوانین سے بالکل جدا ہوتا ہے ان کو ہم محض خیالی تصویریں کہینگے۔

"خیال" سے ایسا تخیل مراد ہے جو بغیر کسی رکاوٹ یا استدلال کی رہبری کے کام کرتا ہے۔"

تلازمی تخیل' اشیا' تصور' یا خیال کی جذباتی تصویروں کے ساتھ رہتا ہے۔ اگر اس ائتلاف کی بنا جذباتی رشتہ پر نہ ہو تو اس صورت میں اس کو محض خیال یا وہم کہتے ہیں۔

تیسری صورت میں تخیل کی حالت اس سے علیحدہ ہوتی ہے اس میں شاعر اپنے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور وہ ترجمانی اس طرح کی جاتی ہے کہ شاعر اپنے جذبات کو دوسری چیزوں سے وابستہ کر دیتا ہے گویا وہ ان اشیائیں انسانی صفات پاتا ہے اور اس پردہ میں اپنے دلی خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے ڈاکٹر اقبال "ہلال عید" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

غرۂ شوال اے نور نگاہِ روزہ دار　　　آ! کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار

سرگزشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے　　　اے مہ نو! ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

جس عَلَم کے سایہ میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم　　دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی پستی دیکھ لے　　اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

یہاں شاعر چاند کو ذی حس فرض کرتا ہے اور اس کو مخاطب کر کے اپنے جذبات اور تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارا روحانی تاثر ہی ہمارے احساسی تجربوں کو اہمیت دیتا ہے۔ اگر روحانی تاثر موجود نہ ہو تو زندگی بیکار ہے۔

جب ہم کسی باغ میں سیر کے لئے جاتے ہیں، اس کے سبز درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کو یا کبھی کسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر بطوں اور مچھلیوں اور اس کے دلکش منظر کو دیکھتے ہیں تو ان تمام چیزوں کے دیکھنے سے ہمارے دل پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے مگر ہم اس کو تخیل نہیں کہہ سکتے۔ تخیل کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان اشیا کے دیکھنے سے روحانی اثر لیتے ہیں اور جب روحانی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہمارے جذبات کو اکسانے کی حقیقی علت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعر ان اشیا کو بیان ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ورڈسورتھ کہتا ہے کہ کسی چیز کو ٹھیک طور پر دیکھنے اور غور کرنے سے بعض اوقات تخیل کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی نفسیاتی تحلیل یہ ہے کہ اس کا دماغ غیر شعوری طور پر اس کے مشاہدہ ہی میں مصروف رہتا ہے اور اسکے احساسات پورے طور پر ادا نہیں ہوتے۔ اس لئے شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی ہو بہو تصویر کھینچے بلکہ اس کے اثر کی ترجمانی بھی کرے۔ اور اس میں اصل کی ایک جھلک ضرور نمایاں ہو۔

ایک اچھی مثال وُرسفولڈ[ا] نے یہ دی ہے کہ ہومر نے ایلیڈ میں ہیلن کے حُسن کا بیان کرنے میں اس کے خط و خال کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کے حُسن کا اثر دکھلایا ہے جو ٹرائے[۲] کے تجربہ کار بڈھوں پر ہوا۔

"یہ کوئی حیرت[۳] انگیز بات نہیں کہ ٹروجن اور مصیبت زدہ ایچین نے ایسی عورت کے لئے اتنے عرصہ تک

[ا] (B. Worsfold)

[۲] (Troy)　　[۳] (ایلیڈ ترجمہ انگریزی)

تکلیفیں برداشت کیں۔ وہ ایک ہراس ڈالنے والی غیر فانی دیوی نظر آتی ہے۔"

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض چیزیں قدرت نے ایسی پیدا کی ہیں جن کے دیکھنے سے دل مسرور ہوتا ہے اور ان کی ہو بہو تصویر سے فرحت ہوتی ہے۔ تو کیا ایسی صورت میں بھی اس کا ایک ہی رُخ دکھانا کافی ہوگا یعنی صرف وہ تاثیر جو ایسی چیزوں کے دیکھنے سے حاصل ہو۔ نہیں۔ ایسی صورتوں میں صرف تاثیر کا ظاہر کرنا کافی نہیں۔

کسی منظر کا اچھا یا بُرا ہونا شاعر کی دماغی کیفیت پر منحصر ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض مناظر قدرت ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر ایک اچھے دماغ پر اسی طرح ہوتا ہے جو دوسرے کے دماغ پر۔ ایسی صورت میں اسکی ہو بہو تصویر کھینچنے سے اس کا اثر اچھا ہوگا۔ یہی ایک اہم صورت ہے جس میں محاکاتی تخیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ورڈسورتھ کی شاعری میں یہ بات ایک بڑی حد تک موجود ہے مگر ہم یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دنیا بھی ہمارے ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ آج دنیا کی ایک چیز ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں مگر کل ہماری حالت بدل جاتی ہے اور جو چیز ہمارے لئے باعث انبساط تھی وہی وبال جان ہو جاتی ہے۔ اس لئے محاکاتی تخیل ہمیشہ کسی شخص کے نزدیک یا کسی ملک میں یکساں مقبول نہیں رہ سکتا۔ زمانہ کے ساتھ افراد کا اور ملکوں کا مذاق شاعری بھی بدلتا جاتا ہے کوئی چیز کسی زمانہ میں اچھی معلوم ہوتی ہے اور بعد میں وہی بری نظر آتی ہے۔

جب ایک چیز کے دونوں رخ بتائے جاتے ہیں تو یہ تخیل کی انتہا ہے۔ اس طرح تخیل ترجمانی کرتا ہے ان اشیاء کی جن کا ہم احساس و ادراک کرتے ہیں۔ خارجی شاعری میں یہ فرض آسانی کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے مگر داخلی شاعری میں جہاں انسان کے کردار کی حقیقی یا تخیلی ترجمانی کی جاتی ہے یہ بات بہت مشکل ہے۔ جب کوئی مصنف انسان کے صحیح کردار کو ظاہر نہیں کر سکتا تو اس کی کتاب دلچسپ ہی نہیں بنتی۔

ان تینوں قسموں کے تخیل میں جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں حتی الامکان امتیاز کرنا چاہئے گو ان میں ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔

تمام انسانی صفات میں زیادہ مفید اور کارآمد چیز تخیل ہے، تمام ادبی تحریروں میں تخیل کا ہونا ضروری ہے۔ جس قدر ادب اعلیٰ ہوگا اسی قدر تخیل بھی پاکیزہ ہوگا۔ خصوصاً ناول، داستان میں تو اس کی سخت ضرورت ہے۔ غرض تخیل کی ضرورت صرف تاریخ یا افسانہ ہی میں نہیں ہے بلکہ بغیر اسکے شاعری شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہے

اور نہ صرف شاعری میں بلکہ کل فنون لطیفہ میں اس کی ویسی ہی اہمیت ہے۔

اس وقت ہمارا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اردو فسانہ نویسی میں تخیل سے کتنا کام لیا گیا ہے اور فسانوں کے مصنفوں کا تخیل کس درجہ کا ہے۔ خیالی افسانوں میں اس وقت ہمارے پیش نظر داستان امیر حمزہ ہے جس میں بے حد خیال آفرینی کی گئی ہے اگرچہ خیالی قصّوں کی فہرست میں سب سے طویل طلسم ہوش ربا یا بوستان خیال کا سلسلہ ہو سکتا ہے لیکن اختصار کے لحاظ سے داستان امیر حمزہ ہیں زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قصّہ پر تنقید

داستان امیر حمزہ کا قصّہ تاریخ پر مبنی نہیں ہے لیکن اس میں اہم شخصیتیں تاریخی ہیں۔ پورے قصہ میں مرکزی شخصیت حضرت امیر حمزہ کی ہے۔ نوشیروان کا بیان آغاز قصّہ سے آخر تک رہتا ہے۔ داستان نگار کا مقصد امیر حمزہ کی شجاعت کو چمکانا اور نوشیروان کو بے وفا، نادان اور ڈرپوک ثابت کرنا ہے۔

تاریخی اشخاص جن کے کردار زیادہ اہم ہیں وہ نوشیروان، امیر حمزہ اور بزرجمہر ہیں۔ معدی کرب کی بھی تاریخی شخصیت ہے مگر اس قصہ میں اس کا بڑا حصّہ نہیں۔ عمرو عیار کی شخصیت بالکل مصنّف کی تخیلی پیداوار ہے اور اسی طرح مہرنگار اور بقیہ غیر اہم شخصیتیں بھی۔

ہم نے جیسا کہ تخیل کے ضمن میں رسکن کا قول لکھا ہے کہ شاعر یا صناع جو جو باتیں اپنی پوری زندگی میں سنتے، دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہ تمام چیزیں ان کے حافظہ کے غیر محدود ذخیرہ میں موجود رہتی ہیں اور وہ ان کا استعمال غیر شعوری طور پر کرتے ہیں۔

داستان امیر حمزہ کے مصنّف نے جس ماحول میں نشو ونما پائی وہ خالص ایشیائی ہے۔ مغربی خیالات کا اثر اس وقت تک ملک میں اچھی طرح نہیں ہوا تھا اس لئے ساری کتاب ایشیائی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

تمام داستان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے کئی ایک مشرقی قصّوں کو اپنا لیا ہے۔ اس میں گلستاں کے اس قصہ کا ماخذ ہے جس میں سعدی نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو جو کشتی میں بہت گھبراتا تھا غوطہ دیکر نکالا تو آرام سے بیٹھ گیا۔ ذرا سے تغیر سے مصنّف نے اس کو عمرو عیار سے متعلق کر دیا کہ وہ مچھلی پر کود پڑا مگر جب وہاں سے

زندہ نکالا گیا تو خاموش ہو رہا۔

"باغ بیداد" میں نقش نے بادشاہ کے لئے جو تخت بنوایا تھا اس کی تصویر قصہ نویس نے شاہ جہاں کے تخت کی سی کھینچی ہے۔

ہندوستان کے سفر میں امیر مع اپنے رفیقوں کے تسمہ پا کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ الف لیلہ میں سندباد جہازی کے قصہ میں تسمہ پا کا ذکر آیا ہے اسی طرح گرداب سکندری اور منار کا قصہ الف لیلہ سے لیا گیا ہے۔

غرض مختلف قصّوں سے اخذ کر کے داستان کو مرتب کیا ہے ہم یہاں قصہ کی بندش یا ترتیب سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ اس داستان کو جدید معنوں میں قصہ (ناول) سمجھنا اور قصہ نویسی کے اصول پر منطبق کرنا ایک فعل عبث ہے۔ البتہ آگے چلکر ہم اشخاص داستان کے حقیقی تاریخی حالات اور داستان میں ظاہر کئے ہوئے کردار دونوں علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں جس سے ناظرین کو مقابلہ کے بعد مصنف کے تخیل کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

اس سارے قصہ میں اکثر موقعوں پر لڑائیوں کا سین شاہنامہ سے لیا گیا ہے اور اس کے اشعار بھی من وعن نقل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ شعر اکثر موقعوں پر استعمال کیا ہے۔

تو ضرب بے زدی ضرب مانوش کن　　　غم ہر دو عالم فراموش کن

شاہنامہ میں جنگ کا یہ طریقہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے ایک بہادر آتا اور اپنا مقابل چاہتا۔ اول ایک دوسرے کا نام معلوم کر لیتا اور کہتا کہ ایسا نہ ہو کہ تو گمنام مارا جائے۔ اس کے بعد خاص طور پر اپنے مقابل کو ہوشیار کر کے وار کرتا۔ ان دونوں میں لڑائیاں ہوتیں۔ مگر وہ اکثر برابر رہتے یا کسی ایک کے کمزور ہونے کی صورت میں ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ جب اس پہلوان کا خاتمہ ہو جاتا تو دوسرا میدان جنگ میں آتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ صرف ایک شخص سے سارا لشکر مرعوب ہو کر بھاگ جاتا۔

ایک شخص کا دن بھر اپنے حریف سے لڑتے رہنا اس زمانہ میں ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے مگر اس زمانہ میں دشمن کے ہر ایک حملہ سے بچنے کیلئے جنگجو خاص خاص داؤ جانتے تھے اور اپنی ساری عمر اسی میں

صرف کرتے تھے ۔

بعض موقعوں پر قصہ نویس نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت فوج کی جو حالت تھی اس کی تصویر کھینچی ہے ۔ مثلاً لندھور اور امیر حمزہ میں جو لڑائی ہوئی اس رات سپاہیوں میں جو چہ میگویاں ہوئیں وہ بالکل آخری دور کے مغلیہ لشکر کی تصویر ہے ۔

اصل قصہ میں ایرانیوں کا غرور و فخر ظاہر کیا ہے اس وقت ایرانی عربوں کو بہت ذلیل سمجھتے تھے نوشیروان اور اس کے وزرا کی گفتگو میں اکثر اس کی جھلک نظر آتی ہے اس کے ساتھ ہی مصنف نے اپنی جانب سے مغلیہ خاندان کے زوال کے وقت سلطنت کی جو حالت تھی اس سے بہت کام لیا ہے ۔

قصہ نویس نے جس طرح اس سے پیشتر لکھے ہوئے قصوں میں مشکلوں کو حل کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اسی پر عمل کیا ہے اس لئے اس میں مافوق العادۃ باتیں کثرت سے ہیں ۔ اکثر موقعوں پر حضرت آدم، حضرت خضر حضرت الیاس، حضرت داؤد، اشخاص داستان کی کبھی سمندر میں کبھی خشکی پر نمودار ہو کر مشکل کو رفع کرتے ہیں یہ باتیں رفتہ رفتہ زائل ہوتی جارہی ہیں مگر اس زمانہ میں ان کو حقیقی تصور کیا جاتا تھا اور ان پر اقوام کے اکثر افراد اور داستان نویس کا اعتقاد تھا ۔ انہیں خیالات کا مظہر یہ کتاب ہے ۔

داستان نویس کا منشا، اس قصہ سے یہ بھی ہے کہ ابتدائے اسلام کے حالات بیان کرے یعنی اسلام کس طرح ترقی کرتا گیا ۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اس نے امیر حمزہ کے پردے میں اسلام کے بعد کے حالات اور پارسیوں اور دیگر اقوام کا حلقۂ اسلام میں آنا ظاہر کیا ہے ۔ کیونکہ قصہ نویس کو معلوم ہے کہ نوشیروان کا کارنامہ اسلام کے کچھ دنوں پہلے اور امیر حمزہ کا اسلام کے چند روز بعد ختم ہو جاتا ہے ۔ نوشیروان نے آں حضرت کی ولادت کے چھ یا سات سال بعد ہی وفات پائی اور امیر حمزہ بدر میں بہادری سے لڑے اور احد میں شہید ہوئے ۔

ان چیزوں کو پیش نظر رکھکر جہاں جہاں لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں اس بات کا بھی اشارہ کر دیا ہے کہ امیر حمزہ لوگوں کو ملت ابراہیمیہ میں داخل کرتے تھے ۔ اس طرح قصہ نویس نے اہل اسلام کے تمام خصوصیات بیان کئے ہیں جو اس کی ذہنی دنیا میں موجود تھے ۔ چنانچہ مہر نگار کے متعلق قصہ نویس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ آیت الکرسی پڑھ کر دم کرتی ہے یا بزرجمہر نے اپنے باپ بخت جمال کی جس طرح تجہیز و تکفین کی ہے

وہ ہوبہو ہند کے مسلمانوں کے رسم ورواج کے موافق ہے۔ مثلاً مقبرہ بنواکر روشنی کرنا اور فاتحہ دلواکے غربا کو کھانا تقسیم کروانا اور چالیس دن (چہلم) تک وہاں رہنا۔

قصہ نویس کا تخیل بہت زبردست ہے اس قصہ کا جال نہایت عمدہ ہے۔ ابتدا ہی سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے جو ختم قصہ تک باقی رہتی ہے اس طرح ایک داستان کے بعد دوسری داستان پڑھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ بخت جمال کے قتل کے بعد ہی اس کے انتقام کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس انتقام کے بعد بزرجمہر کی دلچسپ پیشین گوئی شروع ہوتی ہے جس کو تاریخی اہمیت حاصل ہے اسی کو کسی قدر بدل کر قصہ نویس نے حضرت امیر حمزہ، مقبل اور عمرو کی جانب منسوب کردیا ہے۔ امیر کی تعلیم و تربیت کے زمانہ کا بہت دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ پھر مہر نگار کے عشق سے قصہ میں جان پڑجاتی ہے اور واقعات ایسے پیش آتے ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ ان دونوں کی شادی جلد ہوجائے گی۔ مگر قصہ نویس نے نہایت دانائی سے پہلے ہی پیش گوئی میں یہ بات ظاہر کردی تھی کہ ایک بدطینت مصاحب کی وجہ نوشیروان کو پریشانی اٹھانی پڑیگی۔ چنانچہ ہندوستان سے جب امیر لندھور کو گرفتار کر کے لاتے ہیں تو پھر بختک کے اکسانے سے نوشیروان امیر کو روم، یونان، مصر روانہ کرتا ہے اس طرح ان کی شادی ہونے نہیں پاتی۔ جب امیر حمزہ ان مہموں کو فتح کر کے واپس آتے ہیں تو بھی ان کی مراد پوری نہیں ہوتی آخر کار وہ مہر نگار کو اپنے قبضہ میں کرلیتے ہیں۔

اس کے بعد توی توقع ہوتی ہے کہ ان دونوں کی شادی ہوجائے گی اور وہ عیش وعشرت سے زندگی بسر کریں گے۔ لیکن پرستان کا جو ذکر قصہ نویس نے آغاز قصہ میں کیا تھا اس کا ظہور ہوتا ہے اور امیر اٹھارہ سال کے لئے پرستان چلے جاتے ہیں جس کی وجہ قصہ نویس نے یہ گھڑی ہے کہ وہ "انشاءاللہ" کہنا بھول گئے تھے۔

پرستان سے واپسی کے بعد مہر نگار کا نکاح امیر حمزہ سے ہوجاتا ہے۔ پھر بھی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آخر کار مہر نگار ماری جاتی ہے۔ امیر اس کی قبر پر مقبل کے ہمراہ بیٹھ کر مجاوری کرتے ہیں۔ یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تو قصہ کا خاتمہ ہوگیا مگر قصہ نویس پھر اس کو طول دیتا ہے اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

نوشیروان اپنی بیوی کے قتل ہونے کے بعد سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ امیر اس کی تلاش میں جاتے ہیں جس سے قصّہ میں پھر جان پڑ جاتی ہے۔

سب سے زیادہ لطف اس قصّہ میں اس وقت آتا ہے جب امیر حمزہ نوشیروان سے ملکر اُس کی تکالیف کا باعث دریافت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے اور کہتے ہیں "اگر میں امیر حمزہ کو گرفتار کر کے لا دونگا تو تم کیا دو گے" نوشیروان کہتا ہے اگر تم اس کو گرفتار کر کے لا دو گے تو میں اپنی دوسری بیٹی سے تمھارا نکاح کر دوں گا۔

یہ بات قصہ نویس کو خوب سوجھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر دوسرا واقعہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ باوجود بختک کی مخالفت کے نوشیروان اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی امیر سے کر دیتا ہے۔ ایرانی اپنی عصبیت کی وجہ امیر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ آخر کار نوشیروان سلطنت چھوڑ کر اپنے بیٹے ہرمز کو تخت نشین کر دیتا ہے اور امیر حمزہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوتے ہیں اور اُحد کی جنگ میں شہید ہوتے ہیں۔

باوجودیکہ داستان نویس کے ذہن میں قومی اساطیر، رسم و رواج و معتقدات کا ذخیرہ موجود ہے مگر بعض اوقات وہ اپنے تخیّل کی عنان کو بے تحاشا چھوڑ دیتا ہے۔ جس کی وجہ اس کا بیان غیر مدلل ہو جاتا ہے اور قصّہ کی وقعت بہت گھٹ جاتی ہے۔

قباد کے وزرا جب اس کے خواب کی تعبیر نہیں بیان کرتے تو وہ کہتا ہے "قسم ہے آتش کدہ نمرود کی" اس کے بعد ہی اس کے وزیر کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے لات و منات کی قسم کھائی۔ حالانکہ لات و منات عرب کے بُت ہیں ذرا سے غور سے مصنّف اس غلطی کو رفع کر سکتا تھا۔

یہ بات بھی انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کا نام جس میں واقعی ظلم ہوا ہو۔ "باغ بیداد" رکھے۔

"حکایت قباد ہیزم فروش" میں تو مصنّف کے تخیّل نے گذشتہ واقعات کی تکذیب کی ہے۔ جہاں تک اس داستان کا تعلق ہے بزرجمہر کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ہوتی ہے مگر اس حکایت میں دلآرام کے مقابلہ میں بزرجمہر کی پیشین گوئی جھوٹی ہوتی ہے۔

نوشیروان کو تعلیم و تربیت کے وقت تو ذہین بیان کیا ہے مگر سارے قصہ میں اس کی نادانی ثابت کی ہے۔ تجربہ کے بعد تجربہ۔ ذلت کے بعد ذلت اٹھانی پڑتی ہے مگر نوشیروان اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔

بہزنگار مسلمان ہونے سے پہلے اپنی دائی سے کہتی ہے "قسم ہے خدائے پاک اور بے عیب کی"

اس قسم کے قصہ میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں قصہ نویس کے تخیل نے اشیاء کو بے جوڑ ملانے کی کوشش کی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے عمرو عیار کے کردار کو قصہ نویس نے اپنی ذہنی ذخیرہ سے پیدا کیا ہے اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ عمرو عیار کی ایسی دلچسپ شخصیت ہے کہ باوجود لڑائیوں کے قصہ سے طبیعت نہیں اکتاتی۔ اس کے علاوہ نوشیروان کے کردار کو اس نے بالکل نیا جامہ پہنایا ہے۔

حضرت امیر حمزہ کے کردار کو جس قدر قصہ نویس کے امکان میں تھا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اور نوشیروان کو انتہا درجہ کا ذلیل۔ یہانتک کہ چور ثابت کیا ہے۔

اب ہم افراد قصہ کے تاریخی حالات بیان کرتے ہیں اور پھر ان کے داستانی کردار پیش کرتے ہیں، ان دونوں کے مقابلہ سے ناظرین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ حقیقی واقعات کیا ہیں اور ان میں مصنف کے تخیل نے کیا کیا کام کئے ہیں۔

کردار حضرت امیر حمزہ

تاریخی حالات حمزہ بن عبدالمطلب پیغمبرؐ کے چچا اور رضائی بھائی تھے۔ آپ بڑے بہادر تھے آپ کی شجاعت اور دلیری کی وجہ پیغمبرؐ نے آپ کو اسد اللہ کا خطاب دیا تھا۔ آپ اسلام کے سب سے پہلے علم بردار تھے۔ آپ نے جنگ بدر میں بڑی شجاعت دکھائی۔

جنگ اُحد جو قریش اور پیغمبرؐ کے درمیان ہوئی تھی اس میں اسلام کے دشمنوں کا سپہ سالار ابوسفیان تھا اس لڑائی میں وحشی حبشی نے آپ کے سینے میں برچھی بھونک دی جس سے آپ نے انتقال فرمایا۔ کہتے ہیں کہ وحشی نے آپ کا پھڑپھڑاتا ہوا جگر ہند معاویہ کی ماں کے روبرو پیش کیا۔ اور اس نے اپنے دانتوں سے

اس کو چبایا۔ آپ نے ۷۰ بقول بعض ۹۵ برس کی عمر پائی۔

داستانی حالات اور کردار

امیر حمزہ کی دلیری تاریخ میں مشہور ہے۔ آپ نے بدر میں اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ قصہ نویس آپ کی بہادری کو دنیا کے پہلوانوں سے مقابلہ کرکے ثابت کرتا ہے کہ کوئی آپ کے برابر نہ تھا۔

آغاز قصہ میں بزرجمہر نوشیروان کے خواب کی تعبیر میں کہتا ہے کہ

"حشام ابن القمہ خیبری ایک بادشاہ زادہ مشرق میں پیدا ہوگا اور بادشاہ (نوشیرواں) کا تخت و تاج چھین لیگا۔ حمزہ نامی ایک لڑکا حشام کو مار کر تخت و تاج حضور میں گزرانے گا۔"

اس پیشین گوئی کی بناء پر بزرجمہر مکہ روانہ کیا گیا اور اس نے امیر حمزہ کی پیدائش کے وقت طالع کو دیکھکر کہا۔

"یہ وہ لڑکا ہے جو ہفت اقلیم سے خراج لیگا اور تمام جہان میں اپنا عمل کریگا۔ اور ملک ملک کے پہلوانوں اور بادشاہوں کو زیر کرکے اُن کے کان میں حلقہ بندی ڈالیگا۔ اور مسلمان کریگا۔ اور عمرو عیار اور مقبل اس کے جانی یار ہوں گے"

ساری داستان میں اِس پیشین گوئی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

پیدائش کے چھ روز بعد امیر کا گہوارہ بزرجمہر کے کہنے سے بالاخانہ پر رکھوا دیا جاتا ہے اور وہ گم ہوجاتا ہے بزرجمہر عبدالمطلب سے کہدیتا ہے کہ امیر حمزہ شہپال بن شارخ کے پاس سات روز رہینگے اور انھیں پرستان میں دیو، پری، جن، غول وشیر کا دودھ پلایا جائے گا۔ تاکہ عالم جوانی میں وہ کسی سے دہشت نہ کھائیں۔ اور امیر کا بیاہ آسمان پری سے ہوگا۔ ابتداہی سے ان کی زندگی میں مافوق العادۃ عنصر شامل کردیا گیا ہے۔

امیر کو اپنے دوستوں سے بہت محبت تھی کبھی انکا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مقبل اور عمرو کا انہوں نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ عمرو کی خاطر انھوں نے اپنی ساری تعلیم برباد کی۔ جب عبدالمطلب نے عمرو کو گھر سے نکالدیا تو امیر نے کھانا کھانا چھوڑ دیا۔

بزرجمہر نے امیر کے پاس تحائف روانہ کئے تھے۔ عمرو نے امیر کو دھوکا دیکر کہا کہ 'میں ہر تاجدار کے پاس

چلا جانا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اس نے میرے لئے یہ چیزیں روانہ کی ہیں۔ اب آپ سے رخصت لینے آیا ہوں"
امیر یہ سنکر ملول ہوتے ہیں اور انھیں عمرو سے جدائی پسند نہیں۔

ہندوستان کے سفر میں عمرو امیر کا ساتھ دینا نہیں چاہتا مگر امیر اس کو دھوکے سے ساتھ لیجاتے ہیں۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے دوستوں سے کتنی محبت تھی کہ کسی حالت میں جدائی گوارا نہیں کرتے تھے۔

امیر کی پہلی بہادری اس سے معلوم ہوتی ہے جب انہوں نے تین درخت عمرو کے اکسانے سے جڑ سے اکھاڑ دئے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے سرکش گھوڑے پر سواری کی۔

جب امیر کی عمر سات سال کی تھی اس وقت انہوں نے بنی کو شکست دی اور اسے مسلمان کیا۔
یہ ان کی سب سے پہلی لڑائی ہے۔ اس کے بعد امیر کا مقابلہ امیر حشام بن القمہ خیبری سے ہوتا ہے۔ یہی وہ بہادر تھا جس نے نوشیروان کو شکست دی اور اپنی اس شجاعت کا ثبوت دیا جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ مگر امیر نے اس کو مار کر تخت و تاج نوشیروان کی خدمت میں روانہ کیا۔

امیر جب مدائن جاتے ہیں تو نوشیروان کی بیٹی مہر نگار پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اس کے محل میں برابر جایا کرتے ہیں۔ نوشیروان کو اطلاع ملتی ہے کہ کوئی شخص اس کے محل میں داخل ہوتا ہے اس لئے وہ ایک دن قارن کو مقرر کرتا ہے کہ وہ محل کی نگرانی کرے اور کسی کو بھی اندر داخل ہونے نہ دے۔ باوجود عمرو عیار کی نصیحت کے امیر حمزہ محل میں جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر دلیر تھے۔

بیشۂ فیض میں امیر شیر کے پاؤں کو پکڑ کر زمین پر دے مارتے ہیں اس سے قصہ نویس اس بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی ہیبت سے ہیبت چیز سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔

ہندوستان میں وہ لندھور کا نہایت شجاعت کے ساتھ مقابلہ کر کے اس کو حلقہ بگوش کرتے ہیں۔
اور مدائن جاتے ہیں۔

یونان، روم اور مصر میں امیر حمزہ نے اپنی شجاعت کو چمکایا اور وہاں خدا کے فضل سے سب پر غالب رہے۔ اس کے بعد نوشیروان کی وعدہ خلافیوں سے تنگ ہو کر مہر نگار کو اپنی حراست میں لے لیتے ہیں تا کہ وہ اپنی منافقت سے کسی اور سے شادی نہ کردے۔

امیر میں بہادری کے ساتھ ہی رحم کا بھی مادہ بہت بڑھا ہوا ظاہر کیا ہے۔ وہ پہلوانوں کو گرفتار کرنے کے بعد نہایت اخلاق سے برتاؤ کرتے اور اُن سے پوچھتے تھے کہ "میں نے تجھ کو کس طرح گرفتار کیا"! اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ کسی کو دھوکے یا مکر سے گرفتار کرنا جوانمردی کے خلاف ہے۔ اکثر صورتوں میں لوگ آپ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے۔ یہ صفت پیغمبرؑ خدا کی تھی۔ مصنف نے اسے پیغمبرؑ کے چچا سے بھی منسوب کر دیا۔

جب انتہائی شرارتوں کے بعد نوشیروان، زوبین اور بختک گرفتار ہو کر آتے ہیں تو امیر عمرو کو تاکید کرتے ہیں کہ نوشیروان کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا اور خود ان سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔

پرستان میں امیر کا بڑے بڑے دیوؤں سے مقابلہ ہوتا ہے مگر وہ سب پر غالب آتے ہیں اور تمام پرستان میں اُن کی شجاعت کا ڈنکا بج جاتا ہے۔

یوبین فولاد تن بڑی مشکلوں سے گرفتار ہو کر آتا ہے۔ امیر کے مصاحب اس خوف سے کہ کہیں امیر اس کو رہا نہ کر دیں عمرو کو لالچ دیکر کہتے ہیں کہ کسی طرح اس کو قتل کرے۔ عمرو ان کے کہنے پر عمل کرتا ہے اس کی اطلاع جب امیر کو ہوتی ہے تو وہ عمرو کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوتے ہیں اور اپنے عزیز دوست کو بقول عمرو عیار ایک کافر کے مقابلہ میں سات کوڑے لگاتے ہیں۔ جس کی وجہ وہ اُن سے جُدا ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے رحم کی کیا حالت تھی کہ ایسی صورتوں میں اپنے عزیز سے عزیز دوستوں سے بھی ناراض ہو جاتے تھے۔

امیر اپنے وعدہ کا برابر خیال رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے مہرنگار سے جو وعدہ کیا تھا ایفا کیا۔ مہرنگار کی وفات پر امیر مقبل کے ساتھ قبر پر بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس سے اُن کی وفاداری کا ثبوت ملتا ہے۔

امیر کی شرافت کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب نوشیروان کی بیوی زر انگیز ان پر عاشق ہو جاتی ہے اور دوا رو بےہوشی پلا کر ان کو قید کرتی اور اپنا عشق ظاہر کرتی ہے تو وہ اس سے کہتے ہیں "تو میری ماں ہے" جس کی وجہ انھیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں مگر انھیں اس کی پروا نہیں۔

جب نوشیروان اپنی بیوی کی ناپاک حرکات سنتا ہے تو تخت و تاج چھوڑ کر ملک سے نکل جاتا ہے اور نہایت تکلیف سے زندگی بسر کرتا ہے۔ بزرجمہر کے کہنے پر پھر امیر سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ نوشیروان کو تلاش کر کے وطن واپس لائیں۔ امیر باوجود اس کی غداریوں کے اس کی جستجو میں نکل جاتے ہیں اور بڑی دقتوں کے بعد اس کو تلاش کر کے واپس لاتے ہیں۔

راستے میں امیر نوشیروان سے دریافت کرتے ہیں "اگر میں حمزہ کو گرفتار کر کے تیرے حوالہ کر دونگا تو مجھے تو کیا دیگا" نوشیروان اپنی دوسری لڑکی دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ مدائن آنے کے بعد امیر باوجود دوستوں کی نصیحت کے اپنے آپ کو قیدی بنا کر اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

بقول قصہ نویس امیر حمزہ نے ہزاروں مسلمان کئے اور ان کے پیروؤں کا دائرہ روز بروز بڑھتا گیا۔ انھوں نے تمام عمر شریفانہ کام کئے اور اپنے اخلاق، رحم، فیاضی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ یہ انسانی کردار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

کردار نوشیرواں

تاریخی نوشیروان عادل ایران کے بادشاہ قباد کا بیٹا تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۵۳۱ء میں تخت نشین ہوا۔ مشرقی اور مغربی مصنفوں نے روم پر اس کے حملہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ روم پر فتحیاب ہوا۔ ان کے بیانات میں بہت کم اختلاف ہے۔ بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ اس نے شہنشاہ روم کو قید کیا۔ اس قسم کے واقعات کو ایرانیوں نے اپنی قومی داستان میں شریک کر لیا ہے جس سے انکی عصبیت کا پتا چلتا ہے۔ نوشیروان کی سلطنت کے آغاز میں روما کے مشہور مقنن شہنشاہ جسٹینین اور اس کے درمیان صلح نامہ ہوا تھا۔ اس صلحنامہ میں نوشیروان کا لہجہ فاتحانہ ہے، روم سے دوسری لڑائی میں نوشیروان نے بھی حصہ لیا تھا اس وقت اس کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔

اس نے نہایت شان و شوکت سے (۴۸) سال تک حکومت کی اور ۵۷۹ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا ہرمز چہارم تخت نشین ہوا۔

آفتاب رسالت ۵۷۱ئہ میں طلوع ہوا اور خود مفخر موجودات نے اس بات پر ناز کیا ہے کہ آپ کی ولادت ایسے عادل پاشاہ کے عہد میں ہوئی۔

داستانی نوشیروان کی شخصیت تاریخی ہے مشرق ومغرب کے علماء اس کو عادل مانتے ہیں شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے۔

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

مگر قصہ نویس اپنے ہیرو امیر حمزہ کے کردار کو چمکانا چاہتا ہے اس لئے اس کو بے ایمان وعدہ خلاف کٹھ پتلی، چور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ مصنّف کی تخیلی تصویر یہ ہے۔

جب نوشیروان پیدا ہوا تو بزرجمہر نے یہ پیشین گوئی کی

"یہ بادشاہ ملک ایران میں سو برس بادشاہت کریگا بلکہ ہفت اقلیم سے خراج لیگا۔ ایک مصاحب بد کے سبب سرگردانی بھی بہت اٹھائیگا"

جب نوشیروان کی شادی خاقان اعظم بادشاہ چین کی لڑکی سے ہوئی تو قباد نے اپنے عین حیات نوشیروان کو تخت نشین کیا اور اس وقت نوشیروان کو نصیحت کی کہ

"باباجان خبردار بزرجمہر کی مشورت بغیر کچھ کام نہ کرنا اور کسی بات میں بختک کا کہنا نہ ماننا۔"

مگر نوشیروان عجیب نادان آدمی تھا کہ اس نے اپنے والد کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔

اس نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم لندھور کا سر لاؤ گے تو تمہاری شادی مہرنگار سے کردی جائیگی مگر اس کے ساتھ ہی اس نے بختک کے مشورہ سے گستہم کو ہندوستان روانہ کیا کہ کسی طرح امیر کو ہلاک کرے چنانچہ اس نے امیر کو دھوکے سے زہر دے ہی دیا۔

جب امیر کے مرنے کی جھوٹی خبر مشہور ہو جاتی ہے تو بختک کے مشورہ پر عمل کرکے نوشیروان نے

لے (Encyclopaedia Britannica) حاشیہ صفحہ (۱۰۷)

مہرنگار کی شادی اولاد بن مرزبان سے اس شرط پر کردی کہ اگر چالیس دن کے اندر امیر نہ لوٹیں تو مہرنگار تمھاری ہوجائیگی۔ اس سے اس کی منافقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب امیر زندہ واپس آتے ہیں تو نوشیروان بختک کے اکسانے سے امیر کو اور مقامات پر جنگ کرنے کے لئے روانہ کرتا ہے۔ دوسرے سفر میں قارن دیوبند کو امیر کے ہمراہ کرتا ہے اور یہ تاکید کرتا ہے کہ امیر کا کسی طرح کام ختم کردے۔

راستہ میں جب امیر کو پیاس لگتی ہے تو یہ ملعون امیر کو زہر کا پیالہ دیتا ہے مگر امیر اس کو نہیں پیتے۔ اس طرح بار بار امیر کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ امیر نے جو خط نوشیروان کے نام لکھا تھا اس سے نوشیروان کے کردار پر بخوبی روشنی پڑتی ہے چنانچہ امیر لکھتے ہیں۔

"حمزہ بن عبدالمطلب کی طرف سے تجھے معلوم ہو کہ تو بادشاہ ظالم ہو کے عادل کہلاتا ہے اور اپنا خطاب عادل معین کیا ہے۔ بتلا کہ میں نے تیری کیا تقصیر کی ہے جو تو نے اول کہا تھا کہ لندھور کا سر لے آنے پر مہرنگار تجھے دونگا۔ اس لئے لندھور کو میں زندہ پکڑ لایا اور تیرے حوالے کیا اور تو نے اپنی بیٹی مرزبان کو دی اور گستہم کے ہاتھ سے مجھے زہر دلایا اور بعد اس کے مصر، یونان و روم کو بھیجا۔ اور وہاں بھی خطوط لکھکر حیلہ اور مکر کرایا۔ پھر خدا نے مجھے وہاں سے بھی خلاصی دی پھر بھی تو اپنی بیٹی مغلوں کو دینے کے لئے تیار ہوا۔ بارے خدائے تعالیٰ نے مجھے غیب سے مدد پہنچائی اور مہرنگار کو مغلوں کے ننگ سے بچایا۔ تب میں نے ناچار ہو کے مکہ میں بھیجدیا ہے اور دشمنوں کی آنکھوں میں خاک ڈالدی ہے۔ اور اب تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اپنے کئے سے پشیمانی اٹھا کر توبہ کرکے میرے ساتھ صلح کریگا اور اپنی بیٹی مہرنگار کو اپنی رضامندی سے مجھ پر حلال کریگا۔" [لہ ظاہراً مغون]

باوجود اس کے نوشیروان کا دل امیر سے صاف نہیں ہوتا اور وہ لڑائی برابر جاری رکھتا ہے اور شداد کو امیر کے خلاف ابھارتا ہے۔

شداد کو جب امیر شکست دیتے ہیں تو وہ مدائن جاکر نوشیروان سے انتقام لیتا ہے اور اُس کو

گرفتار کر کے در کے روبرو لٹکا دیتا ہے" ہر روز ایک روٹی جو کی اور ایک گھونٹ پانی کا دیکر کہتا ہے کہ "تو مجھے نہ بلاتا تو میں جا کر اس عرب کے ہاتھ سے فضیحت نہ پاتا اور نہ کان میں حلقہ غلامی پہنتا"

اس کے جواب میں نوشیروان کہتا ہے کہ یہ کام بختک کا ہے اس پر شداد بختک کو اپنے حوالے کرنے کے لئے کہتا ہے مگر وہ بدنصیب اس بات پر راضی نہیں ہوتا اور تکلیف برداشت کرتا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان کے دل میں بختک کی کتنی محبت تھی باوجود بختک کی فطرت کو جاننے کے اس کو شداد کے حوالہ نہیں کرتا اور خود تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔

نوشیروان کی بیوی زرنگار امیر حمزہ پر عاشق ہو جاتی ہے اور ان پر اپنا عشق ظاہر کرتی ہے۔ امیر کہتے ہیں "تو میری ماں ہے" اس کے بعد وہ ماری جاتی ہے۔ نوشیروان کو اس سے سخت ندامت ہوتی ہے اور تجارت کرنے کے لئے بغیر کسی اطلاع کے نکل جاتا ہے۔ راستہ میں رہزن اس کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بادشاہ ختن کو اس واقعہ کی اطلاع دیتا ہے۔ اس کو یقین نہیں آتا کہ نوشیروان یہی ہے۔ اس لئے اس کو نکال دیتا ہے اس طرح ذلت اٹھا کر آتشکدۂ نمرود میں آتا ہے اور اپنے غلاموں کے پاس آکر کہتا ہے کہ "میں نوشیروان ہوں" تو وہ اس کو باور نہیں کرتے اور مار مار کر اس کا منہ لال کر دیتے ہیں۔ اسلئے نوشیروان فقیروں میں رہنا قبول کرتا ہے۔ مگر تین دن کے بعد وہاں سے بھی جواب ملتا ہے کہ فقیر تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اگر تو لکڑیاں لائیگا تو کھانا ملیگا۔ چنانچہ اسی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان کس قدر بے وقوف تھا کہ بختک کے کرتوت کی وجہ بیحد تکلیف اٹھاتا اور پھر بھی اسکے مشورہ پر عمل کرتا۔

ہرمز کی درخواست پر امیرؑ نوشیروان کی تلاش میں نکل جاتے ہیں اور اس کو اس ذلت و خواری میں دیکھکر اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔ مگر اس کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے اور اس کے حالات دریافت کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ تیرا کیا حال ہوا۔ نوشیروان کہتا ہے

"بدبخت عرب کے ظلم سے میں اپنا ملک و مال و تاج چھوڑ کر سوداگری میں خوشی سے بسر کرتا تھا...... مگر چوروں نے اسباب لوٹ لیا".... امیر نے کہا حمزہ نے

تیرے اوپر کیا ظلم کیا.......... نوشیروان نے کہا" اول وہ مطیع تھا پھر میری لڑکی پر عاشق ہو کر مجھ سے پھرا" امیر نے کہا تم ہی ہر بار اسکے دشمن ہوئے اسکو رنج دیتے تھے۔"

(نوشیروان امیر حمزہ کے جواب میں کہتا ہے) "سچ یہی ہے جو تو نے کہا مگر حمزہ میری جان کا دشمن نہ تھا اور مجھسے ملک نہ چھینتا تھا۔ لیکن میرے وزیر میرے اور اس کے درمیان مخالفت ڈالکر مجھے شہر بہ شہر ملک بہ ملک پھراتے رہے۔"

امیر اس پر کہتے ہیں "اگر حمزہ کو گرفتار کر کے تیرے حوالے کر دوں گا تو مجھے کیا دیگا" نوشیروان نے کہا کہ "سوگند ہے مجھے لات کی اور قسم ہے چھوٹے منات کی اگر تو حمزہ کو پکڑ کر مجھے دیگا تو میں تجھ کو چھوٹی بیٹی مہرافروز دوں گا اور تجھے دامادی میں قبول کروں گا۔"

اس نکتہ پر مصنف کی داد دینی چاہیے ایسی حالت میں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ نوشیروان بڑا بیوقوف تھا یا سخت بدذات۔ مگر حقیقت میں یہ انسانی فطرت کی صحیح تصویر ہے۔ انسان کی غیر تربیت یافتہ نفسی حالت بالکل یہی ہوتی ہے یعنی ایک ایسے شخص کو جس کی اخلاقی تربیت اور سمجھ اچھی نہ ہو جب کوئی ذلت یا تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس تکلیف کے اصل سبب سے ناراض ہونے سے زیادہ اس ذریعہ پر ناراض ہوتا اور غصہ نکالتا ہے جس سے صدمہ پہنچا ہو۔ بچے جس بید سے پٹتے ہیں اس کو وہ استاد سے زیادہ قابل لعنت سمجھتے ہیں۔ جہلا راستے میں ٹھوکر کھا کر پتھر پر غصہ نکالتے ہیں۔ عوام جج سے زیادہ پھانسی دینے والے پر خون تھوکتے ہیں۔

ایک دفعہ امیر، بہرام اور نوشیروان جنگل میں لکڑیاں لانے گئے اور تھک کر سو رہے۔ نوشیروان بیدار ہوتا ہے اور ان کو اٹھا کر کہتا ہے کہ لکڑیاں جمع کر لو۔ امیر کہتے ہیں "تم سو رہو ہم تمھاری لکڑیاں بھی جمع کر دینگے۔ مگر نوشیروان کو اس سے تشفی نہیں ہوتی اور دوسرے لکڑہاروں کی لکڑیوں میں سے تھوڑی تھوڑی لکڑیاں چرا لیتا ہے امیر ہوشیار تھے اس حالت کو دیکھ کر افسوس کرتے اور کہتے ہیں۔

"نوشیروان کا کیا حال تھا اور کیا ہو گیا"

امیر نوشیروان کو آرام سے مدائن واپس لاتے ہیں اور وہاں ایک بھٹیارے کی دوکان میں کھانا کھاتے ہیں

عمرو اور مقبل بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ نوشیروان امیر کو پہچان لیتا ہے اور فرار ہو کر اپنے لشکر سے جا ملتا ہے۔ وطن واپس ہونے کے بعد امیر اپنا وعدہ ایفا کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے آپ کو گرفتار کروا کر نوشیروان کے سامنے پیش کرتے ہیں تو بختک کہتا ہے "امیر کو اس وقت مار ڈالو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا" مگر نوشیروان باوجود ان کے احسانات کے خاموش ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان کا ضمیر ایسا ناپاک ہو گیا تھا کہ اب اس کو کچھ احساس باقی ہی نہیں رہا تھا۔ انسانی ہستی کی یہ تصویر اگرچہ بالکل صحیح تو نہیں مگر ساری داستان میں اس سے زیادہ مکمل کوئی نہیں۔ سب کرداروں میں مافوق العادت عنصر شامل کر دینے سے اصلیت سے دور ہو گئے ہیں۔ نوشیروان گو بادشاہ ضرور تھا مگر پھر بھی انسان تھا متواتر شکستوں اور ذلتوں نے اس کے احساس خود داری کو بالکل فنا کر دیا تھا اس طرح مصنّف نے اُس سے جو ایسی کمینہ حرکتوں کا صادر ہونا بیان کیا وہ بالکل فطرت کے مطابق اور لائق داد ہے۔

آخر کار امیر کا بیاہ مہر افروز سے کر دیتا ہے مگر اس کے بعد پھر بختک کے داؤں میں آجاتا ہے اور امیر سے جنگ کرتا ہے۔ آخر کار اپنے بیٹے ہرمز کو تخت نشین کر دیتا ہے۔

جیسی پیشین گوئی کی گئی تھی اسی طرح محض بختک کی وجہ نوشیروان کی زندگی تکلیفوں میں گزرتی ہے۔ اور اس کو ذلیل سے ذلیل حرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس کا قلب سیاہ ہو گیا تھا وہ بجائے عادل کے ظالم، وعدہ خلاف، غدار، بے ایمان اور چور بن گیا۔

کردار بزرجمہر[1]

تاریخی بُزُرجُمہر (عربی) بُزرگ مِہر (فارسی) واچرک متر (پہلوی)[2] سوخراء مروزی کا بیٹا تھا۔ یہ نوشیروان عادل کا ایک جلیل القدر حکیم اور وزیر باتدبیر تھا۔ اس کے باپ کا لقب

---

[1] آثار عجم۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ۔ کنز العلوم فرید وجدی شرح مجانی الادب حصہ ہفتم۔ [2] Justi, Iranisches Namenbuch.

بختگان تھا جو انوشیروان کے باپ قباد کے عہد میں قتل کیا گیا۔

بزرجمہر ابتدا میں ایک خدمت پر مامور تھا۔ جب بہبود نامی وزیر خیانت کے جرم میں قتل کیا گیا تو یہ مدائن (طیسفون[1]) میں منصب وزارت پر فائز ہوا۔ مزدک کو جس نے قباد کے زمانہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا انوشیروان نے بزرگ مہر کے کہنے سے قتل کروا دیا۔

اسی وزیر کے عہد میں ہندوستان سے شطرنج ایران میں پہنچی جس کے جواب میں بزرگ مہر نے نرد (چوسر) ایجاد کر کے ہندوستان روانہ کیا۔

انوشیروان نے ایک خواب دیکھا کہ رات کو ایک آفتاب نکلا اور ایک سیڑھی ہے جو ایوان کے سرے سے گزر گئی ہے۔ وہ آفتاب حجاز کی جانب سے خراماں خراماں اور خوشی و ناز سے برآمد ہوا اس آفتاب سے تمام آفاق روشن ہو گیا لیکن ایوان کسریٰ تاریک ہی رہا۔

اس خواب کے باعث انوشیروان آدھی رات کو سوتے سے اچھل پڑا لیکن کسی سے خواب نہیں بیان کیا۔ جب صبح ہوئی تو بزرگ مہر سے سب حال بیان کیا۔ اس نے غور و فکر کے بعد عرض کیا کہ یہ ایک راز نہفتہ ہے اسکی تعبیر سے تعجب نہ فرمائیے۔

آج سے چالیس سال کے بعد عربوں میں ایک شخص یہاں قدم رکھے گا راستی اور استقامت کی راہ اختیار کریگا اور کج روی سے احتراز کریگا۔ دین زردشت کو نیست و نابود کر دے گا۔ چاند کو انگلی دکھائیگا جس سے وہ شق ہو جائیگا۔ کل قدیم مذاہب یہودیت و مسیحیت وغیرہ قائم نہ رہیں گے۔ بادشاہ کے قصر کے سوا سب ملک فرنون شاداب و آباد رہیگا۔

یہ پیشین گوئی آنحضرتؐ کے متعلق تھی۔

انوشیروان نے بزرگ مہر کو اس کے عین عظمت و جلال کے زمانہ میں کسی اہتمام کے باعث غضبناک ہو کے قتل کروا دیا۔ ظہور اسلام سے چند سال پہلے اس نے انتقال کیا۔

اس کے مقالات میں سے ہے کہ سلطنت کا مدار گیارہ چیزوں پر ہے (۱) غضب بیجا سے احتراز (۲) صداقت و راستی (۳) دانشمندوں سے مشورہ (۴) تعظیم بزرگان (۵) قیدیوں کے حالات کی

---

[1] (Ctesiphon)

خبر گیری (۶) راستوں کی محافظت (۷) جرائم کے انداز سے کے موافق سیاست وعفو (۸) سپاہ کی آرائش (۹) قبائل و اقارب کے ساتھ مراعات (۱۰) ملک کے اطراف و جوانب جاسوسوں کا تعین (۱۱) ارباب خدمت و اہل کمال پر مہربانی۔

بزرگ مہر سے پوچھا کہ آپ نے علم و حکمت میں یہ مقام کیونکر حاصل کیا۔ فرمایا۔

بِبُکُورٍ کَبُکُورِ الغُرَاب — وَحِرْصٍ کَحِرْصِ الخِنْزِیر
وَتَمَلُّقٍ کَتَمَلُّقِ الکَلْب — وَصَبْرٍ کَصَبْرِ الحِمَار

یعنی علم و حکمت میں نے اس طرح حاصل کیا کہ کوے کی طرح علی الصباح بیدار ہوتا تھا۔ ادراک مطالب میں سور کی مانند حریص تھا علماء سے کتے کی مثل خوشامد کرتا تھا اور مصائب و آفات کے وقت گدھے کی مانند صبر کرتا تھا۔

داستانی بزرگ مہر کی تاریخی شخصیت ہے مگر مصنف نے داستان کی ضرورت کے لحاظ سے اس کو ردوبدل کر کے ایک نئے قالب میں ڈھالا ہے وہ یہ کہ بزرجمہر کو رمل ورثہ میں ملا تھا یعنی اس کو ایک کتاب ایسی ملی تھی جس سے باطن کا حال معلوم ہوتا تھا چنانچہ یہ وہ قوت ہے جس کی وجہ بزرجمہر نے اپنے باپ بختجمال کا بدلہ القش سے لیا اور اسی کی وجہ قباد کا وزیر ہو گیا۔

باپ کا انتقام لینے کے بعد بزرجمہر نے اس کے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کیا چنانچہ القش کے لڑکے سختک کی قباد سے سفارش کی اور اس کو وزیر بنا دیا۔ مصنف نے اس سے اس کی شرافت ثابت کی ہے۔

بزرجمہر بڑا مدبر تھا اس نے قباد سے اجازت لے کر نوشیروان عادل کو چالیس دن تک قید رکھا اور اس کے بعد آپ گھوڑے پر سوار ہوا اور نوشیروان کو پیدل ساتھ لایا اور اس کے تین کوڑے لگائے اس سے بزرجمہر کا مقصد یہ تھا کہ تکلیف کا احساس ہو۔

بزرجمہر جانوروں کی زبان سے بھی واقف تھا چنانچہ الوؤں کے جوڑے کی گفتگو نوشیروان سے بیان کر دی تھی جس کی وجہ نوشیروان نے اپنے ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا لیا۔

بزرجمہر رمل دانی میں یگانہ روزگار تھا۔ اس نے جتنے حالات بیان کئے وہ سب (بجز ایک کے)

صحیح نکلے۔ چنانچہ بنیے، قصاب اور صراف کا احوال باطن بیان کر کے ان سے تمام چیزیں مفت حاصل کیں۔ باغبان سے بیان کیا کہ "قفل کے نیچے سانپ ہے اگر تم نہ مارو گے تو کاٹ لیگا" چنانچہ یہ بالکل صحیح نکلا اور وہ اس کا معتقد ہو گیا۔ جب باغبان نے بکری کو ہلاک کیا تو بزرجمہر نے کہا کہ "تو نے تین خون کئے" باغبان نے ہنس کر کہا "میں نے تو صرف ایک ہی خون کیا" تو اس نے کہا ایک تو بکری اور دو بچے اس کے پیٹ میں ہیں جس سے وہ حیران رہگیا اور القش نے خیال کیا کہ یہ روشن ضمیر ہے۔

جب القش نے بختیار کو بزرجمہر کے مار ڈالنے کے لئے بھیجا اور وہ اس کو مارنا چاہتا تھا تو اس نے کہا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیگا اس پر اس نے کہا "میرا کیا مقصد ہے"؟ بزرجمہر نے بیان کیا "تو القش کی بیٹی پر عاشق ہے اگر تو مجھے مار ڈالیگا تو وہ وعدہ پورا نہیں کریگا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اس کے بعد اس سے بادشاہ کے خواب کے متعلق پیشین گوئی کرتا ہے جو حرف بحرف صحیح ہوتی ہے القمہ[1] خیبری کے متعلق جو بادشاہ سے پیشین گوئی کی تھی وہ بالکل صحیح نکلی۔ چنانچہ القمہ خیبری کا خاتمہ امیر نے کیا تو نوشیروان کا تخت و تاج اس کو واپس ملا۔

جب گستہم نے امیر کو زہر دیا تو عام طور پر مدائن میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ امیر کا انتقال ہو گیا ہے تب بزرجمہر نے مہر نگار سے کہدیا کہ امیر حمزہ زندہ ہیں اور چالیس دن کے اندر آجائینگے۔ اسی طرح جب امیر پرستان چلے گئے تو اس نے کہا چونکہ امیر نے "انشاء اللہ" نہیں کہا اس لئے اٹھارہ سال کے بعد شہر تنجہ[2] میں ملیں گے۔

بزرجمہر اور بختک نے نوشیروان کے روبرو پیشین گوئی کی تھی جس میں نوشیروان کو دھوکا ہوا تھا اس لئے اس نے بزرجمہر کو بختک کے حوالہ کیا تھا اس ناپاک نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروادی۔

ابتداء سے انتہا تک بزرجمہر امیر کا ہمدرد رہا۔ اس کے دل میں ہر وقت امیر کا خیال رہتا تھا۔ جب اس کو امیر کے عشق کا حال معلوم ہوا تو اس نے امیر کی شادی کی یہ تدبیر نکالی کہ امیر ہندوستان جاکر لندھور کو مغلوب کریں تو ان کی شادی مہر نگار سے ہو جائے۔

امیر جب ہندوستان جا رہے تھے تو اس نے ان کی ران میں زہر مہرہ رکھدیا تھا جسکی وجہ وہ ہلاکت سے بچے

[1] علقمہ، خالباً داستان نویس نے اپنے بچاؤ کیلئے تاریخی ناموں کو مسخ کر دیا ہے۔ [2] طنجہ (Tangier) معجم البلدان، والنخبۃ الازھریہ صفحہ (۳۲۰)

غرض ہر موقع پر اس نے امیر کی مدد کی ۔

جب نوشیروان آتشکدہ نمرود میں لکڑیاں لاکر زندگی بسر کرتا تھا تو اس وقت بھی اس نے ہرمز سے کہا کہ اس کو امیر حمزہ کے سوائے کوئی نہیں لاسکتا اس طرح غیر شعوری طور پر وہ امیر حمزہ کی دوسری شادی کا باعث ہوتا ہے جو نوشیروان نے وطن واپس ہوکر اپنی دوسری لڑکی سے کردی ۔

جب عمرو عیار نے بختک کے گوشت کا ہریسہ نوشیروان کے سامنے پیش کیا تو بزرجمہر نے خاموشی اختیار کی جس کی وجہ نوشیروان نے ناراض ہوکر اس کی دونوں آنکھیں نکلوادیں ۔ اس طرح اس نے امیر حمزہ کی محبت میں اپنی آنکھیں کھودیں ۔

بزرجمہر دانیال پیغمبر علیہ السّلام کی اولاد میں تھا چنانچہ جب وہ بادشاہ چین کے پاس گیا تو اس نے بزرجمہر کو بتخانہ میں اپنے ہمراہ رکھا جب بادشاہ نے بت کے سامنے سجدہ کیا تو بزرجمہر تماشا دیکھتا کھڑا رہا ۔ بادشاہ نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی ۔ بزرجمہر نے کہا

"جو چیز تم نے بنائی ہو اسے سجدہ کس طرح جائز ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدانیت کا خیال اس کے دل میں تھا ۔ آخر کار جیسا کہ اس کو رمل سے معلوم ہوچکا تھا پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر قدم بوس ہوا اور اس کی آنکھیں اچھی ہوگئیں ۔

بزرجمہر کے کردار کے بیان میں فنّی نقطۂ نظر سے مصنّف نے کوئی بات نہیں پیدا کی ۔ بزرجمہر کی زندگی ہی مافوق العادت باتوں سے شروع ہوتی ہے اور اس کے کردار میں فن کے اعتبار سے طرح طرح کی غلطیاں کی ہیں ۔ منشاء مصنّف کا یہ تھا کہ امیر حمزہ کے لئے ایک ہمدرد پیدا کرے ۔ اسی ہمدردی میں بزرجمہر سے وہ تمام افعال صادر ہوتے ہیں جو ایک سطحی نظر والے کو بھی معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لئے اسکے کردار کو عوام اچھا سمجھتے ہیں اور اس سے ہمدردی رکھتے ہیں ۔

باقی آیندہ

غزلیات

(۱)

عالیجناب نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظمؔ طباطبائی

سرو کی طرح اگر بر زدہ داماں ہوتا
مثلِ غنچہ کے نہ میں سر بہ گریباں ہوتا

رشکِ فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا

مار ڈالا ہے زمانہ کی دو رنگی نے مجھے
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا

ہم کہاں بیٹھ کے رستہ میں ترے سر پٹکیں
نقشِ پا کوئی تو اے عمرِ گریزاں ہوتا

چھپ گئے گرد میں سب قافلے وا افسوس
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا

مرغِ بسمل ہوں نہیں میرے تڑپنے کا علاج
چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا

حلقے تدویرِ کواکب کے مسلسل رہتے ؟
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے قائم
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالمِ امکاں ہوتا

ڈر تھا سوزِ غمِ ہجراں کا مجھے اے واعظ
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دل کا ارمان نکلنا تو ہے مشکل اے نظمؔ
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

(۲)

از لسان القوم مولانا سید شاہ ابراہیم ۔ عفو

اُسی کا راگ گایا جا رہا ہے آبشاروں میں
اُسی کی دھن میں موجیں نغمہ زن ہیں جوئباروں میں

ہے اُسکے رنگ سے رنگیں سارا گلشنِ ہستی
ہیں جلوے سب اُسی کے چاند میں سورج میں تاروں میں

پسِ پردہ یہ کس کے بول ہیں یار قیامت ہے
یہ میٹھے سُر کہاں سے آ گئے بیجان تاروں میں

بتوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں کیوں اُنکے قدموں پر
کچھ ایسی بات ہے دلکش تمہارے خاکساروں میں

ضرورت ہے ذرا سی چھیڑ کی مضرابِ الفت کو
تڑپ جاتے ہیں نغمے بربطِ ہستی کے تاروں میں

لئے دو پھول بھی مجھسے دمِ رخصت نہ ظالم نے
کہ میری روح بو ہو کر نہ ہو پھولوں کے ہاروں میں

زمانہ نے جھنجھوڑا خوابِ نوشیں سے بہت ہمکو
مگر اے عفو اب تک نیند کے ماتے ہیں یاروں میں

کتاب کے کیڑے

از مولوی عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے مددگار ناظم تعلیمات سرکار عالی

چارلس لیمب نے نسل انسان کو دو انواع میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو قرض لیتے ہیں اور دوسرے وہ جو قرض دیتے ہیں۔ یہ تقسیم بڑی حد تک درست ہے اور تقریباً کل ہندوستانی مسلمان پہلی نوع میں آجاتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تقسیم کی حدیں پتھر کی لکیر نہیں ہیں۔ ایسے اللہ کے بندے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی زندگی کی ابتدا میں قرض لینے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ جہاں کوئی گرم جیب والا ہاتھ لگا اور وہ قرض مانگ بیٹھے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یہ خود صاحب ثروت ہو گئے اور حاجتمندوں کی قرض سے دستگیری فرمانے لگے۔ اس طرح ایک نوع سے دوسری نوع میں بدل جانا صرف ممکن ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی بات ہے۔

اگر نوع انسان کی تقسیم اس طرح کیجائے کہ ایک خانہ میں وہ لوگ ہوں جو کتاب کے کیڑے ہیں اور دوسرے میں وہ جو اس طرح کے کیڑے کہلانے کے مستحق نہیں تو یہ تقسیم لیمب والی تقسیم سے زیادہ فطری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہونے کے بعد قرض دینے یا لینے والا بن سکتا ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر اس کی معاشی حالت پر ہوتا ہے۔ لیکن کتاب کا کیڑا ماں کے پیٹ ہی سے کتاب کا کیڑا بنکر نکلتا ہے اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہیئے کہ ہر کتاب کا دیکھنے والا کتاب کا کیڑا ہے۔ کتابوں کا دیکھنا اور بات ہے اور کتاب کا کیڑا بننا اور چیز۔ ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

کتاب کے کیڑوں کی بھی دنیا کی ہر چیز کی طرح بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اُن کی ہے جو نمایشی کیڑے ہوتے ہیں۔ ان کو کتاب کا بڑا شوق ہوتا ہے اور جہاں کہیں خوبصورت جلد نظر آگئی اور یہ بیتاب ہو گئے

لوٹنے لگے ۔ ان کے گھریلو کتب خانہ میں آپ پیاری پیاری دلکش اور خوشنما جلدیں پائیں گے جن کی پشتیں سنہری حروف میں مسکراتی ہیں جس طرح ۔ خیر تشبیہ کو جانے دیجئے ۔ اس قسم کے کتاب کے کیڑے کتابوں کے حُسن کے ایسے متوالے اور قدر دان ہوتے ہیں کہ کتابوں کو چھوئی موئی بنا دیتے ہیں ۔ نہ خود ہاتھ لگاتے ہیں اور نہ کسی اور کو ہاتھ لگانے دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک چھونے سے کتاب خراب ہو جاتی ہے کھول کر پڑھنا اور گھنٹوں پڑھنا تو بس کتاب کو ستیاناس ہی کر دینا ہے ۔ ان اصحاب کا کتاب کا دیکھنا ہی ہے کہ کتبخانہ میں بیٹھ گئے اور کتابوں کی قطاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے گئے اور اخبار پڑھنے گئے ۔ ان سے کبھی بھولے سے بھولے پن کے ساتھ آپ کتاب مستعار مانگ بیٹھئے تو غضب ہی کر دیا ۔ وہ چونک پڑتے ہیں اور اس قدر اہمیت اور سنجیدگی ان کے چہرہ پر دوڑ جاتی ہے گویا کسی نے ان کی صاحبزادی سے پیام دیدیا آنکھوں سے اس طرح کا شک اور شبہ ٹپکنے لگتا ہے گویا مانگنے والا امیر علی ٹھگ کے قبیلہ سے ہے اور کتاب کو ٹھگ کر ہضم کرنا چاہتا ہے ۔ ان کتاب کے کیڑوں کو کتاب سے افلاطونی محبّت ہوتی ہے ۔

ان کے بالکل برعکس جو کیڑے ہیں وہ کتابوں کی جلدوں کی خوشنمائی اور سنہری پشتوں سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں ۔ ان کو اس ظاہری دلکشی اور نظر فریبی سے یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ بس یہ کتابیں نری دیکھت ہی کی ہیں ۔ ان کے باطن کا خدا ہی حافظ ہے ۔ ایک ایسے کیڑے اس درجہ غلو کر گئے تھے کہ وہ اچھی سے اچھی تصنیف کو بھی اچھی جلد میں برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ سرے سے پڑھتے ہی نہ تھے ۔ کچھ یونہی سی چھپی ہوئی پھٹی پرانی کرم خوردہ کتاب پر لٹو ہو جاتے تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ کتب مبنی علم کی خاطر ہوتی ہے اور علم ایک باطنی چیز ہے ۔ کتاب کی سیرت اصل شئے ہے ۔ نری اچھی صورت سے کیا حاصل ہوتا ہے ۔ ان حضرات کی محبّت ڈس ڈمونا (Desdemona) کی سی محبّت ہے ۔ اوتھےلو (Othello) کی دھواں کھانی جلد سے اسے سروکار نہ تھا بلکہ وہ تو اوتھےلو کی سیرت پر مرتی تھی ۔

کتاب کے کیڑوں کی جس قسم کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اس سے ملتی جلتی کیڑوں کی ایک اور شاخ ہے جس کا مقولہ یہ ہے کہ کتاب ایسی ہونی چاہئیے کہ اسے جس طرح چاہیں برت سکیں ۔ ایک ہاتھ میں حقہ کی نے ہے ۔ کتاب کو بیچ میں سے موڑا اس طرح کہ ذرا ٹانکے ڈھیلے ہو جائیں اور دوہرا کر لیا ۔ اب کیا ہے

آسانی سے کتاب کو ایک ہاتھ میں لے لیا۔ حقہ کا حقہ پیتے رہے اور کتب بینی کی کتب بینی ہوتی رہی۔ بھلا نفیس جلد والی کتاب کا اس طرح دھڑ توڑنے کی کب ہمت ہوسکتی ہے۔ پھٹے حالوں سستی کتاب کو دیکھتے دیکھتے رکھنا پڑا تو صفحہ کا ایک کونا لیا اور ولایتی کُتّے کے کان کی طرح موڑ دیا۔ کسی نشانی وشانی کی حاجت نہیں۔

اس قماش کے ایک کیڑے کے کتب خانہ میں معمولی الماریاں تھیں۔ کسی خانہ میں شیشہ تھا اور کسی میں نہیں کوئی کتاب ایسی نظر نہ آتی تھی جس کی پشت پر جھریاں اور دڑاڑیں نہ پڑی ہوئی ہوں۔ پشت پر نام کے متعلق صرف یہ گمان ہوسکتا تھا کہ کبھی یہاں حروف تھے۔ آپ نے کسی کتاب کو نکالنا چاہا تو جلد نکلی چلی آتی ہے یا اگر اس خانہ میں بہت سی کتابیں اور بھری ہوئی ہوں اور آپ نے ہاتھ آگے کو ڈالکر کھینچا تو بیچ میں سے کتاب نکلی چلی آتی ہے جلد بیچاری پھنسی کی پھنسی رہجاتی ہے۔ ان بزرگوار کا استدلال یہ تھا:۔

"ارے میاں کتابیں پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں یا بڑی دیکھنے کو؟ ایسی کتابیں کیا کہ ان سے کام لیتے آپ کا دل دکھے یا آپ کو ادب آداب سے بیٹھ کر پڑھنا پڑے۔ ایسی کتابیں کیا ہوئیں وبال جان ہوئیں۔ اور یہ بھی تو خیال کرو کہ علم کو سستا ہونا چاہئے کتابیں سستی نہ ہوں گی تو پھر علم کب سستا ہوسکتا ہے؟ آپ یہ جتنے فیشن ایبل کتب خانے دیکھتے ہیں وہاں کیا خاک کتب بینی ہوتی ہے یوں کہو کہ کتابوں کی نمائش بینی ہوتی ہے"

بعض کتاب کے کیڑے اس مزاج کے ہوتے ہیں اور یہ ایک قابل قدر نوع ہے کہ کتاب کے پڑھتے ہی ان میں لکھنے کی ریس بیدار ہوجاتی ہے۔ وہ بغیر پنسل یا سیاہی وقلم کے پڑھ نہیں سکتے۔ ان میں سے بعض تو سطروں کے نیچے یا حاشیہ پر لکیروں کا کھینچ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس رجحان کے لوگوں میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو حاشیہ پر کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی فرماتے جاتے ہیں اور جہاں کہیں خالی صفحے مل گئے وہاں اپنی رائے اور خیالات کا اظہار فرما دیتے ہیں۔ اس رجحان کی تہ میں اتنی سی کھوٹ ضرور ہوتی ہے کہ یہ لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھینگے وہ ہمارے حاشیے دیکھ کر ہماری قابلیت کا لوہا مان لینگے۔ ایک عنایت فرما اس مرض میں اس قدر مبتلا تھے کہ ان کے کتب خانہ کی ہر کتاب محشی ہوگئی تھی۔ جہاں مصنف نے کوئی ایسا خیال ظاہر کیا جو حضرت کی پسند خاطر ہوا اور جھٹ انھوں نے حاشیہ پر لکھدیا "ماشاءاللہ! مجھے پورا پورا اتفاق ہے"۔ اگر کوئی بات پسند نہیں آئی تو تحریر ارشاد ہوا۔ "قبلہ! آپ یہاں بہک گئے ہیں"۔

ان کی ایک کتاب تھی ۔ ان کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ ان کے کتب خانہ کی ۔ یہ کتاب غالباً لارڈ مارلے کے مضامین کا مجموعہ تھا۔ اس میں ایک مضمون تھا۔ "مطالعہ ادبیات"! کتاب دیکھنے اور کتاب پڑھنے کے فرق پر بحث تھی۔ ایک جگہ یہ خیال تھا کہ سچ مچ پڑھنے والا بغیر پنسل کے نہیں پڑھتا ۔ اس پر قبلہ نے نوٹ کیا تھا۔ "اے تمھاری صدقے کیا بات کہی ہے"۔ یہ مرض متعدی سا ہے اور ہر قسم کے کیڑوں میں اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ پبلک کتبخانوں کے قواعد میں اس امر کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ کتاب پر کچھ نہ لکھا جائے ۔ ان کتب خانوں کے رکھوالوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن کتاب کے کیڑوں میں یہ مرض گھن کی طرح لگ چکا ہے ان کو اس لغو تنبیہ سے کس قدر دکھ سہنا پڑتا ہے ۔ یہ ایک طرح کی بیرحمی ہے جس کا زخم نفسیاتی ہوتا ہے ۔

کتاب کے کیڑوں کی ایک اور پہلو سے دو قسمیں ہو سکتی ہیں ۔ خال خال کتاب کے کیڑے ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ کتابوں سے چاٹا جائے اسکو ادل بدل کر یا کمی بیشی کر کے اپنی جانب سے ایک کتاب کی صورت دیدیتے ہیں اور موجودہ اور آنے والے کتاب کے کیڑوں کے لئے ذہنی اور روحانی غذا فراہم کر دیتے ہیں۔ اگر کسی ملک سے ایسے لوگ کم یا مفقود ہو جائیں تو بڑا ستم ہو جائے ۔ نئی کتابوں کا کال ہو جائے اور کتاب کے کیڑوں پر ایک بپتا پڑ جائے ۔ یہ لوگ کتاب کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں ۔ اس کا مغز نکال لیتے ہیں اور پھر اس مغز کو اور کتابوں کے مغز سے سلیقہ کے ساتھ گھلاتے ملاتے ہیں اور ایک نئی چیز کی صورت میں کتابی دنیا میں پیش کرتے ہیں ۔ اس رنگ ڈھنگ اور آن بان کے کتابی کیڑے بہت کم ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کی دیکھا دیکھی اور موجودہ تعلیم کے فروغ کی بدولت اس زمرہ میں نصاب کی کتابیں بنانے والے شرحیں اور طلبہ کے رہنما تیار کرنے والے حشرات ارض کی طرح نکل آئے ہیں۔ ان کا کام یہی ہے کہ کتابوں کا پورا یا ادھورا ۔ عموماً ادھورا ۔ مغز نکالا یا اوندھا سیدھا مطلب لکھ مارا اور لیجئے صاحب کتاب تیار ہو گئی اور ملک کے سررشتہ تعلیمات کا مار مراسلوں کے ناک میں دم ہے کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کیا جائے یا بذریعہ مراسلہ گشتی صدر مدرسوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اس لاجواب شرح سے مدد لیکر بچوں کے ذہن میں صحیح مطالب اتروائیں اور اس طرح غلط مطلب اور معنے سے ملک کے ہونہار نونہالوں کو بچائیں ۔ یہ خدمت قوم کی خاطر کی گئی ہے اس سے "اس ناچیز" شارح کا کوئی خاص فائدہ نہیں ۔ اس طرح کے ایک بگڑے دل

کتاب بنانے والے نے ایک کتاب یا کتابوں کا سلسلہ تیار کیا۔ بدقسمتی سے کسی سررشتہ تعلیمات نے ہندوستان میں اس کو نصاب کے قابل اور بچوں کے لئے موزوں نہیں سمجھا۔ آپ نے عام بے قدری اور جوہر ناشناسی کا ماتم کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔

گر ہمیں مکتب است واین ملا وغیرہ۔

اصلی کتاب کا کیڑا ان سب سے انوکھا ہوتا ہے۔ وہ کتاب کو اپنی جان سمجھتا ہے۔ اگر کتاب اس سے منہا کر دی جائے تو پھر یہ بیچارہ کچھ نہیں۔ وہ کتاب کا عاشق ہوتا ہے۔ کتاب کی صورت اور سیرت کا اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھونڈی سے بھونڈی اور موہنی سے موہنی کتاب اس کی نظروں میں یکساں ہوتی ہے۔ صدیوں عمر والی اور جدید سے جدید دوشیزہ اشاعت دونوں پر اس کا دل لوٹ کے آتا ہے۔ دیمک لگی بوسیدہ اور چکنے چکنے کاغذ اور تصویروں والی کتابیں اس کے جذبات پر یکساں بجلیاں گراتی ہیں۔ اسطرح کے ایک کتابی کیڑے کی عمر بھر کی آرزو یہ تھی کہ اپنے کتب خانہ کے لئے ایک نفیس اور موزوں عمارت بنائیں۔ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ اس عمارت میں کتب خانہ کے متعلق جتنی ایجادیں آرام اور آسایش کی یورپ میں ہو چکی ہیں ان سب سے کام لیا گیا تھا۔ کتاب پڑھنے کی کرسی عجیب چیز تھی۔ نرم نرم اور جس طرح لیٹنا چاہو اسی طرح جھجی تلی اوپر نیچے ہو جائے۔ پشت پر لیمپ گیر لگا ہوا جسکو جتنا چاہا ہٹا لیا گھٹا لیا بڑھا لیا۔ اس کرسی پر دراز ہونا بچپن کا آغوش مادری میں شانتی سے لیٹنا یاد دلا دیتا تھا۔ کرسی۔ خواہ آرام کرسی ہی کیوں نہ ہو۔ پیروں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کرسی کے ہاتھوں پر پیر رکھئے یا تو ضرورت سے زیادہ اونچے یا بے ڈھنگے پن کے ساتھ آڑے ترچھے ہو جاتے ہیں۔ اگر پنڈلیاں ہاتھوں پر ٹکی ہوئی ہیں تو گھٹنوں کو سہارا نہیں ملتا۔ ٹخنے سے لیکر پنجوں تک پاؤں کرسی کے ہاتھوں سے نکلے ہوتے ہیں۔ اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے دکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کتب بینی والی کرسی میں پیروں والا جز متحرک ہوتا ہے اور آپ جس زاویہ تک چاہیں اونچا نیچا کر لیں پھر اس پر مرا فش کا چمڑا منڈھا ہوا۔ لیٹتے ہی یہ معلوم ہو کہ بالائی کے ملایم ملایم ڈھیر میں دھنس گئے۔ اسطرح دھنس دھنسا کر لیمپ کو ٹھیک کیا۔ ٹانگوں کو ٹھیک زاویہ پر ٹکایا۔ بنگلہ اول تو شہر کی غل پکار سے دور اور پھر رات اور دس گیارہ کا عمل۔ سوائے فطرت کی رات کی دھیمی دھیمی سریلی اور بن سری آوازوں کے

باقی ہر طرح سناٹا۔ رہ رہکر میاں کتاب کے کیڑے کے حقّہ کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی گیدڑوں کی پکار کے اور کسی قسم کی کھنڈت اس سنسانی میں نہیں پڑتی۔ اس وقت کتاب کے کیڑے صاحب کے ہاتھ میں ایسے مصنّف کی کتاب مان لیجیئے جس کا قلم ایک ایک لفظ میں جان ڈال دیتا ہو۔ پھر کیا کہنے ہیں؟ کتاب کے کیڑے صاحب کی آنکھوں کے سامنے ایک جیتی جاگتی دنیا کھل پڑتی ہے۔ کتب خانہ کا دلکشا کمرہ اس کمرہ کی نفیس نفیس الماریاں اور ان الماریوں میں کے کتاب کی پریوں کے جھرمٹ سب حواس کے سامنے سے پگھل جاتے ہیں۔ جادوگر مصنّف فرض کیجیئے کہ کپ لنگ ہے اور اس کی کتاب 'نولکھا' ہمارے کتاب کے کیڑے مطالعہ فرما رہے ہیں۔ یہ مصنّف اپنے قلم کی چھڑی سے ایک خوبصورت تالاب کے کنارے جہاں سنگِ مرمر کا چکنا چکنا ٹھنڈا ٹھنڈا فرش ہے ٹارون اور سیتا بائی جیسی کی زندہ تصویریں کھڑی کر دیتا ہے۔ راجپوتانہ کا نیم شبی تاروں بھرا آسمان اوپر ہے۔ کٹورا سا تالاب ہلکی ہلکی ملایم ملایم ہوا سے ایک طرف جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ ٹارون کی سمندر کی سی نیلی نیلی اور سیتا بائی کی ناگن کی سی کالی اور کٹار کی تیز دھار والی آنکھوں سے دو طاقتور نفوس کی نفسیاتی فضائیں مکالمہ کی کھڑکیوں سے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ جذبات کے جوالا مکھ کی سرگرمی میں وقت کے بہاؤ کا احساس نہیں۔ اب کچھ دیر میں پو پھٹنے کو ہے۔ لیکن یہ دونوں پیکر خیالی ایک دوسرے کو قابو میں لانے کی دھُن میں ہیں۔ آخر سیتا بائی کا ساتھی جگت سنگھ جو خواجہ سرا ہے تاریکی سے نمودار ہو کر دور سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے اور اس وقت ٹارون سیتا بائی کے پہلو سے الگ ہوتا ہے۔ اغراض کے داؤ پیچ میں اسنے سیتا بائی کی کمر میں ہاتھ حائل کر دئے تھے اور یہ پتہ لگا لیا تھا کہ نولکھا ہار اس کی کمر میں ہے ساتھ ہی اس دلربا ہستی کے تصادم سے جذبات کی بجلیاں عقل کو جلا کر خاک کر دینا چاہتی تھیں۔ الگ ہوتے ہی طمنچہ کی نال کے زور پر ٹارون نولکھا ہار سیتا بائی سے لیتا ہے۔ ہار کے دیتے وقت سیتا بائی کی چکیلی آنکھیں بجلیاں بجاتی ہیں اور جذبات کے ہیجان سے ابھرتے اور لرزتے سینہ کی چولی میں سے پیش قبض کا زمرد رنگ جواہر نگار قبضہ دکھائی دیتا ہے اور ایک دفعہ ہی سیتا بائی اپنے گھوڑے کی طرف لپکتی ہے سوار ہونے سے پہلے اس کے ننھے منے مہندی لگے اور انگوٹھیاں بھرے ہاتھ سے پیش قبض تیر کی طرح ٹارون کی طرف لپکتی ہے اور ٹارون ابھی گھوڑے

بیٹھا نہ تھا۔ اس کے کندھے پر سے سائیں سے نکل کا ٹھی میں جا بیٹھتی ہے۔ یہ قاتلانہ ادا ٹارون کو بے تاب کر دیتی ہے۔ گھوڑے پر ایک دم بھر میں ٹارون سیتا بائی کے برابر ہے جو ابھی گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکی ہے اور جھک سیتا بائی کی کولی بھر ایک اسے گھوڑے پر بٹھا دیتا ہے اور دونوں ننھے ننھے پیارے پیارے ہاتھ پکڑ یہ کہتا ہوا جھکتا ہے۔ "اب ایک بوسہ"۔ اتنے میں بنگلہ کی مرغی خانہ کا مرغ اذاں دیتا ہے اور میاں کتاب کے کیڑے چونک پڑتے ہیں کیونکہ مرغ کی اذاں کے ساتھ جیسا کہ شکسپیر نے لکھا ہے بھٹکتی ہوئی روحیں پھر اپنے اپنے سفان لوٹتی ہوں یا نہ لوٹتی ہوں لیکن یہ صحیح ہے کہ خلاق دماغ کے پیدا کئے ہوئے خیالی پیکر فجر کی دیوی کی ملائم ملائم آہٹ کے ساتھ پھر الفاظ کا بھیس لے لیتے ہیں اور کتاب کی آغوش میں سو جاتے ہیں اور پھر کتاب کے کیڑے کو اپنی کتب بینی کی فردوس میں قدم رکھنے کے لئے بارہ گھنٹوں کی کٹھن منزل طے کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے اصلی کتاب کا کیڑا پن اور ایسے کتاب کے کیڑے کی اصلی کتب بینی۔

ڈاک کے ٹکٹ

از جناب محمد حمید اللہ صاحب متعلم بی۔اے

گزشتہ دو تین سالوں میں ٹکٹی نمایشوں (Philatelic exhibitions) کی امریکہ اور یورپ میں غیر معمولی کثرت رہی۔ ہر نمایش میں اس بات کی کوشش رہی کہ وہ پیشتر کی تمام نمایشوں سے زیادہ دلچسپ اور بہتر بنائی جائے۔ خصوصاً بین الاقوامی ٹکٹی نمایش کو جو ۲ مئی ۱۹۲۵ء سے ۱۲ ماہ مذکور تک پیرس میں ہوتی رہی[1] اس قدر کامیابی حاصل ہوی کہ اب یہ تفریحی مشغلہ علم سکہ جات (Numismatics) کی طرح ایک علم بن گیا ہے۔ چنانچہ پیرس کی نمایش کے دو ماہ بعد ہی "میری لینڈ اکاڈیمی آف دی سائنسز" واقع بالٹی مور میں اور علوم وفنون کے ساتھ ایک کرسی اس علم کے لئے بھی قائم کرنے کا تصفیہ کیا گیا[2]۔

یوں تو ٹپہ یا ڈاک قدیم زمانے سے رائج ہے اور ہر متمدن ملک میں اس کی ضرورت رہی ہے لیکن قدیم اور موجودہ زمانہ کا نمایاں فرق یہ ہے کہ ۱۸۴۰ء سے پہلے تک ٹکٹ لگانے کا رواج نہ تھا۔ سب سے پہلے انگلستان نے خطوط پر نقد محصول لینے کی بجائے اسی قیمت کے ٹکٹ چسپاں کرنے کی اجازت یکم مئی ۱۸۴۰ء میں دی[3]۔ جبکہ شرح ڈاک نہ صرف بیحد گراں تھی بلکہ اس میں وزن کے علاوہ فاصلہ کے لحاظ سے بھی محصول میں کمی وبیشی ہوتی تھی[4]۔ سب سے پہلا ٹکٹ ایک پنی کا تھا جس کا رنگ گہرا سیاہ تھا[3]۔

---

[1] (Stanely Gibbons, Monthly Journal, June 1925. P. 200)

[2] ایضاً بابتہ جولائی ۱۹۲۵ء صفحہ ۲۲۸۔ [3] گبنز کیٹلاگ صفحہ ۱۔ [4] گبنز جرنل دسمبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۵۸۔

اس کی تقلید میکسیکو اور دیگر ممالک میں ہونے لگی ۔ اور آج کچھ اوپر چھ سو ممالک[1] میں ڈاک کے ٹکٹوں کا رواج ہے ۔ ان ممالک کے شائع کردہ ٹکٹ انگلستان کی سربرآوردہ کمپنی اسٹانلی گبنز (Stanely Gibbons) کے اندازہ کے مطابق فروری ۱۹۲۶ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار قسم کے تھے[2] جس میں ہر ماہ اوسطاً سو پچاس کا اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے ۔ اس تعداد میں وہ ٹکٹ بھی شامل ہیں جو چھپائی کی غلطی کاغذ کے فرق اور پرفریشن (Perforation)[3] یا کنگروں کے اختلاف کی وجہ سے عام ٹکٹوں سے الگ قرار دئیے گئے ہیں جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا ۔ لیکن بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ چھپائی کی تمام غلطیاں معلوم کر لی جائیں ۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دریافت شدہ ٹکٹوں کے علاوہ دنیا میں ایک بڑی تعداد ایسے ٹکٹوں کی بھی ہوگی جنکا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوا ہے ۔ مثلاً میں کوئی منہمک ٹکٹی نہیں ہوں صرف شوقیہ مختلف نمونے جمع کرتا رہتا ہوں لیکن میرے پاس بعض نمونے ایسے بھی ہیں جو کسی کمپنی کی فہرست میں نہیں ملتے ۔ حال ہی میں ہندوستان میں جب ڈاک کی شرح دگنی کردی گئی تو پاؤ آنہ والے کارڈ پر مزید پاؤ آنہ کا ٹکٹ لگانے کی ضرورت لاحق ہوئی ۔ چونکہ پاؤ آنہ کے ٹکٹوں کا ذخیرہ ناکافی تھا اس لئے آدہ آنہ والے ٹکٹ پر پاؤ آنہ کا نشان ڈالکر شایع کیا گیا جس کی شکل ($\frac{1}{4}$) تھی ۔ اس کی دو تین غلطیوں کا علم تو ہو گیا یعنی ایک کے ہندسے کے اوپر کا شوشہ نہیں اٹھا (L) یا ایک کے نیچے کے شوشے نہ چھپے ۔ مگر میرے پاس دو ٹکٹ ایسے ہیں جن میں چار کے نیچے کے شوشے پورے طور پر موجود نہیں ہیں (4 4) اس کا داخلہ کسی فہرست میں نہیں ملا ۔ چھپائی کی ایسی غلطیوں سے ٹکٹیوں کے پاس اس کی قدر بڑھ جاتی ہے

ہندوستان میں سب سے پہلا ٹکٹ کمشنر سندہ سر بارٹل فریر کے حکم سے یکم جولائی ۱۸۵۲ء کو سندہ میں شائع ہوا[4] ۔ جس پر انگریزی میں "سندہ ڈسٹرکٹ ڈاک" اور "$\frac{1}{2}$ آنہ" لکھا ہوا تھا ۔ لیکن دو سال بعد

---

[1] گبنز کیٹلاگ اسمائے ممالک ۔ [2] ضمیمہ گبنز جرنل بابتہ فروری ۲۶ء ۔ [3] ٹکٹوں کے جدولی سوراخ جو اس غرض سے کئے جاتے ہیں کہ ٹکٹوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں سہولت ہو ۔

[4] گبنز کیٹلاگ سنہ ۱۹۲۰ء جلد اول صفحہ ۱۶۰ ۔

اس لئے بند کر دیا گیا ۔ کہ برطانوی ہند کے عام ٹکٹ شائع ہو چکے تھے ۔ حیدرآباد میں ۱۸۶۹ء میں پہلے پہل ٹکٹ رائج ہوئے[1] ۔ چنانچہ ایک آنہ والا ٹکٹ شائع ہوا ۔ جس پر "سرکار آصفیہ یک آنہ ۱۲۸۵ھ" لکھا ہوا تھا ۔ اس کا رنگ زیتونی سبز تھا اور وہ موجودہ ٹکٹوں سے کسی قدر بڑا اور مستطیل شکل کا تھا ۔

لندن کے سب سے پہلے ٹکٹ کی قیمت ایک پنی تھی ۔ دنیا میں سب سے زیادہ قیمت کے ٹکٹ اسٹریٹس سٹلمنٹ (Straits settlement) کے ہیں جہاں سو ڈالر کا ٹکٹ بھی مروج ہے[2] ۔ سب سے کم قیمت ٹکٹ فرانسیسی نو آبادیوں میں چلتا ہے ۔ جو ½ سانتیم[3] یعنی ۳/۲۵ پائی کا ہے ۔ جو فرانک کی قیمت کے گھٹ جانے سے اور بھی کم قیمت ہو گیا ہے ۔ جب جرمنی میں مارک کی قیمت بے حد گھٹ گئی تھی تو وہاں جو ٹکٹ سب سے زیادہ قیمت کا شائع ہوا وہ (۵۰) ارب مارک کا تھا ۔ اس زمانہ میں مارک فی پونڈ ۴۴ کروڑ سے زیادہ ملتے تھے[4] ۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ حیدرآباد میں اب تک تقریباً سوا تین سو قسم کے ٹکٹ شائع ہو چکے ہیں[5] ۔ جن میں چند ٹکٹ مطبع کی غلطیوں کے بھی ہیں ۔ سب سے کم قیمت ٹکٹ پاؤ آنہ یا تین پائی کا ہے اور سب سے بیش قیمت ایک روپیہ کا ' جس کی اشاعت ہو چکی ہے یا آج ہی کل میں ہونے والی ہے ۔ مروجہ ٹکٹ صرف سات آٹھ ہی قسم کے ہیں اور اتنے ہی سرکاری یا دفتری ہیں ۔ دنیا میں سب سے زیادہ ٹکٹ امریکہ نے شائع کئے جو (۱۴۰۰) سے زائد قسم کے ہیں[6] ۔ ترکی اس کے بعد ہے جس نے تقریباً چودہ سو شائع کئے[7] ۔ ۱۸۶۶ء میں یہاں چند ٹکٹ خاص اخبارات و رسائل کے لئے شائع ہوئے تھے ۔

ہندوستان کی چھ دیسی ریاستوں میں برطانوی ہند کے ٹکٹ ہی مستعمل تھے اُن پر ریاست کا نام چھاپ دیا جاتا تھا ۔ وہ چھ دیسی ریاستیں یہ ہیں :- گوالیار ' چمبا ' فرید کوٹ ' جھیند ' نابھ اور پٹیالہ[8] ۔

۱؎ گبنز کیٹلاگ ۱۹۲۰ء جلد اول صفحہ ۱۹۶ ۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۰ ۔ ۳؎ (Yvert et Telliers Catalogue)

۴؎ گبنز کیٹلاگ ...... ۵؎ گبنز کیٹلاگ صفحہ ۱ ...... ۶؎ ایضاً ۔

۷؎ ایضاً ۔

لیکن یہ طریقہ اب صرف چند ریاستوں میں باقی رہ گیا ہے مثلاً گوالیار، پٹیالہ ۔ ۲۰ ریاستوں میں خود ریاست کے ٹکٹ شائع ہوتے ہیں جو ریاست کے اندر ہی کار آمد ہوتے ہیں البتہ حیدر آباد دکن کے سرکاری ٹکٹ برطانوی ہند میں بھی جاتے ہیں۔ دفتری ٹکٹوں پر حیدر آباد میں لفظ سرکاری لکھا جاتا ہے ۔ برطانوی ہند میں پہلے (On H.M.S.) لکھا جاتا تھا اب صرف (Service) لکھا جاتا ہے ۔ ایران میں اس کو "رسمی" اور مصر میں "امیری" کہتے ہیں ۔

ایسے ممالک کے ٹکٹ جن پر عام دسترس نہ ہو بڑی قیمت پاتے ہیں ۔ حیدر آباد اور دیگر ریاستوں کے قدیم ٹکٹ بھی اور مقامات کی بہ نسبت زیادہ قیمت پر خریدے جاتے ہیں ۔ کیونکہ پہلی اشاعتوں کے وقت اُن کی مانگ نہ تھی اور نہ وہ ریاستوں کے باہر جاتے تھے ۔ اب چونکہ اُن کا چلن منسوخ ہو گیا ہے اس لئے نئے شوقینوں کی مانگ پوری کرنے کے لئے اُن کا کافی ذخیرہ نہیں ہے ۔

مشہور ذخیروں میں شاہ انگلستان کا ذخیرہ سب سے بہتر ہے ۔ اس کے بعد لندن میوزیم میں ٹاپ لنگ، ممبر پارلیمنٹ کا ذخیرہ ہے جو قومی چندہ سے ایک لاکھ پونڈ میں خریدا گیا۔[1] جرمنی کا قومی ذخیرہ بھی بہت مشہور ہے ۔

مہر زدہ ٹکٹ بھی بے کار نہیں ہوتے ۔ معمولی سے معمولی قیمت کے ہزار ٹکٹ آٹھ دس آنوں میں بک جاتے ہیں ۔ اگر یہ بیرون ہند بھیجے جائیں تو اور بھی زیادہ قیمت آتی ہے ۔ یہی حال ہر قسم کے ٹکٹوں کا ہے ۔ ہر ٹکٹ جو پھٹا ہوا نہ ہو اور جس کے کنگرے درست ہوں کار آمد اور قیمتی ہے ۔ کنگروں کے کٹ جانے اور ٹکٹ کے پھٹ جانے سے اس کی قیمت جاتی رہتی ہے ۔ قدیم ٹکٹ عموماً قیمتی ہوتے ہیں ۔ اگر وہ کمیاب اور نادر ہوں تو قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔

نادر ٹکٹوں سے وہ ٹکٹ مراد ہیں جن میں مطبع کی جانب سے کوئی بین غلطی ہو گئی ہو مثلاً جزیرہ موریشس کے ایک ٹکٹ پر پوسٹیج (Postage) کی بجائے پوسٹ آفس (Post office) چھپ گیا ۔

---

[1] (Irrington and Martin price list)

اس غلطی کے معلوم ہوجانے پر فوراً باقی ٹکٹ تلف کر دیئے گئے ۔ جو ٹکٹ شائع ہو چکے تھے ان میں سے ایک کی قیمت ۲ پنس تھی اور دوسرے کی ایک پنی اول الذکر کی موجودہ قیمت چار ہزار پونڈ ہے دوسرے کی قیمت آخری فروخت میں (۴۲۵۰) پونڈ تھی ۔ حیدر آباد کے بعض ٹکٹوں پر لفظ سرکاری الٹا (سرکاری) چھپ گیا تھا ۔ جس سے ان کی قیمت بہت بڑھ گئی حال ہی میں ہندوستان میں نو پائی کے ٹکٹ جاری ہوے تھے۔ لیکن چند ایک پر مطبع کی غلطی سے نو پائی کی جگہ (نو نو) اور بعض پر (پائی پائی) لکھا گیا تھا ۔ ایسے ٹکٹ ڈیڑھ سو روپیوں میں بھی بک رہے ہیں ۔ بعض مرتبہ دوہری چھپائی ہوجاتی ہے ۔ اس کی بھی بڑی قیمت آتی ہے ۔ غرض ندرت اور کمیابی سے قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔

ٹکٹ کی قیمت میں کنگروں کے سوراخ کی فراخی و تنگی سے بھی فرق پڑجاتا ہے ۔ کیونکہ اگر ایک انچ میں ½ ۱۲ سوراخ والے ٹکٹ جلد بدل جائیں اور ۱۳ سوراخ کے ٹکٹ زیادہ دن رائج رہیں تو کچھ عرصہ کے بعد لازمی طور پر پہلی قسم کے ٹکٹوں کی قیمت بڑھ جائے گی ۔ کاغذ کی طرح ٹکٹوں میں بھی مائی علامت (Water Mark) ہوتی ہے ۔ ان علامتوں کے فرق سے بھی قیمت بدل جاتی ہے ۔ ٹکٹ کے رنگ کا ہلکا اور گہرا ہونا بھی کبھی کبھی قیمت میں تفاوت پیدا کر دیتا ہے ۔

اوپر جتنی قیمتوں کا ذکر ہوا ہے ان سے وہ قیمتیں مراد ہیں جو ٹکٹ کے شوقین دیتے ہیں ۔ ورنہ ٹکٹ صحیح چھپا ہو یا غلط سرکار ایک ہی قیمت پر دیتی ہے ۔ مثلاً بھوپال کے ایک ٹکٹ پر (Bagam) میں M کا آخری شوشہ نہیں چھپا اور وہ (Bagan) پڑھا جاتا ہے ۔ ان دونوں کی قیمت ٹکٹیوں کے پاس جدا جدا ہے ۔ لیکن سرکار نے ایک ہی قیمت پر فروخت کیا ۔

ٹکٹوں سے کئی قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ اولاً وہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے تاریخی مواد کا کام دیتے ہیں ۔ ان سے ملکوں کے رسم ورواج اور معاشرت کا پتہ چلتا ہے ۔ ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ یونان میں ہر چیز ایک دیوتا سے منسوب تھی ۔ یونان کے اکثر ٹکٹوں پر عریاں دیوتاؤں کی تصویریں ہیں ۔ مملکت یوراگاے (Uragauy) بھی اسی کے قدم بقدم ہے ۔ چنانچہ وہاں کے بعض ٹکٹوں پر بیل بوٹوں کی جگہ عورتوں کی تصویریں لباس فطرت میں بتلائی گئی ہیں ۔ اطالیہ کے ٹکٹوں میں بھی

رومانی صنمیات (Mythology) کا اثر ہے۔ چینی دور شہنشاہیت کے تمام ٹکٹوں پر سانپ کی تصویر پائی جاتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ چین میں سانپ متبرک جانور سمجھا جاتا ہے۔ ٹکٹوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں ملک میں شخصی حکومت ہے یا جمہوری وہ ملک آزاد ہے یا غیر آزاد۔ وہاں کی زبان آریائی نسل کی ہے یا سامی۔ شہنشاہ اور صدر جمہوریہ کی تصویروں کے علاوہ ٹکٹوں پر قومی مشاہیر کی تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ جرمنی میں فریڈرک اعظم، شلر، گیٹے اور دیگر مشاہیر کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ ملکی نمائشوں یا اور اہم موقعوں پر بھی خاص طور پر عارضی ٹکٹ شائع ہوتے ہیں۔ پیرس کی بین الاقوامی نمائش میں ایک ٹکٹ شائع کیا گیا تھا جس پر فرانسیسی مذاق کے موافق عریاں آدمی کی تصویر تھی۔ ویمبلی کی شہنشاہی نمائش کے موقع پر بھی دو ٹکٹ اس کی یادگار میں جاری کیے گئے تھے۔ افغانستان میں قومی آزادی کی ساتویں سالگرہ کی تقریب میں ایک جدید ٹکٹ جاری کیا گیا۔ پرتگالی ہند کے بعض ٹکٹوں پر "ہندکے راستے کی دریافت" کا واقعہ تصویر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جاپان کے ایک ٹکٹ پر ایک شاہزادے کی شادی کا مرقع پایا جاتا ہے۔ امریکہ کے ٹکٹوں پر کولمبس کے ساحل پر اترنے اور اعلان آزادی کے سے اہم تاریخی واقعات کے علاوہ واشنگٹن، لنکن اور فرانکلن کی تصویریں بھی ہیں۔ کولمبس کی مہم سولہ تصویروں میں دکھائی گئی ہے۔ ملکہ ازابیلا کے دربار سے لیکر اس کی واپسی تک کے اہم واقعات ان تصویروں میں بتلائے گئے ہیں۔ امریکہ میں معاشرتی اور تجارتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حسن اور فنون لطیفہ کے کمال بھی ٹکٹوں پر دکھائے گئے ہیں۔ کینیڈا میں ملکہ وکٹوریا کی جوبلی، پیرو میں پیرو اور چلی (Chily) کی جنگ رومانیہ میں سلطنت کی دوصد سالہ سالگرہ، پرتگال میں واسکوڈی گاما، پابندۂ ہند، جوہو (Jubu) میں سلطان ابراہیم کی تصویریں ملتی ہیں۔ غرض سینکڑوں اہم اور دلچسپ واقعات کا تاریخی اور معاشرتی مواد ٹکٹوں سے ملتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ نے ٹکٹوں ہی کے ذریعہ سے اپنے ملک کے صحت بخش مقامات کا اشتہار دیا۔ بعض ٹکٹوں سے حیوانات کے متعلق بھی تھوڑا بہت مواد ملجاتا ہے۔ میکسیکو کے عقاب، آسٹریلیا کے کنگرو، نیوفونڈلینڈ کے کتے اور گیانا کے چیونٹی خوار جانور کا پتہ بہ آسانی ٹکٹوں سے ملتا ہے۔

ٹکٹ ایک تعلیمی امداد بھی بن سکتے ہیں۔ ان سے طالب العلم کو تھوڑی مدت میں بہت سے معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ٹکٹ ایک قسم کا کھلونا ہے جو لڑکوں کے لئے ایک تفریحی مشغلہ بن جاتا ہے۔ اپنے ٹکٹوں کے متعلق لڑکے کو دیگر ضروری معلومات حاصل کرنے کا شوق اس کی تلاش کے نتیجے کو نہ صرف خوشگوار بلکہ علمی حیثیت سے بھی مفید بنا دیتا ہے۔ جن لڑکوں کو جغرافیہ سے نسبتاً کم دلچسپی ہوتی ہے انھیں ٹکٹوں کے ذریعے سے جغرافیہ کا ایک خاموش استاد ملجاتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ کسی ملک سے نئے ٹکٹوں کی اشاعت، تخت نشینی، سیاسی انقلاب یا ملک کی غیر معمولی ترقی کے موقعوں پر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو جمع کرنے سے ان تمام ضروری واقعات کا ایک سرسری علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی ملک کے مختلف زمانوں کے ٹکٹوں کا معائنہ کرنے سے وہاں کی ترقی یا تنزل کا بھی علم ہو سکتا ہے۔ مثلاً ترکی کے ابتدائی ٹکٹوں میں منشرقیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اُن پر نہ تو غیر زبان کی کوئی عبارت موجود ہے اور نہ کوئی ہندسہ بلکہ سب کے سب ترکی زبان اور عربی طرز تحریر میں ہیں۔ لیکن جدید ٹکٹوں میں مغربی اثر کی جھلکیوں کے ساتھ حکمرانوں کی تصویریں بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً سلطان رشاد مرحوم سلطان وحیدالدین مرحوم غازی کمال پاشاہ صدر جمہوریہ۔ ان تصویروں سے وہاں کے سیاسی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ مصر پہ اہرام اور ابوالہول کے ساتھ اب شاہ فواد بھی نظر پڑتے ہیں۔ افسوس ہے کہ حیدرآباد میں ڈاک کے ٹکٹ ملک کی ترقی کو ظاہر نہیں کرتے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام، عدالت العالیہ کا منشور اور دوصد سالہ جشن آزادی حیدرآباد کے بہت اہم واقعات ہیں۔ ایلورا اور اجنٹہ کے غار، گولکنڈہ اور دولت آباد کے قلعے، چارمینار اور مکہ مسجد یہاں کی قابل دید یادگار ہیں۔ ان کی تصویریں اگر ٹکٹوں پر ہوتیں تو نہایت موزوں اور مناسب ہوتا۔

ٹکٹوں کی تاریخی اور تمدنی دلچسپی کے علاوہ فی زمانناکاروباری اہمیت بھی خاصی ہو چلی ہے۔ گبنز کی مشہور و معروف کمپنی وقت واحد میں ۴۰ ہزار پونڈ کا ذخیرہ خریدتی ہے اور اُن کی ایک ایک نمائش پر بیس بیس ہزار پونڈ خرچ کردیا جاتا ہے[1]۔

---

[1] کمپنی کی چہل سالہ جوبلی میں کمپنی کے اخبار کا جو ضمیمہ شائع ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ گبنز کا باپ ایک دوا فروش تھا۔ بیٹا بھی اس کا

باقی صفحہ آیندہ

مشہور کمپنیوں کی فہرستیں ہر سال نہ صرف لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں بلکہ ہر ماہ اُن کے ضمیمے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس فن پر کئی رسالے مختلف ممالک سے نکلتے ہیں اور تقریبًا ہر بڑے ملک میں دو ایک رسالے صرف اس غرض سے نکلتے ہیں کہ اجرت لے کر کسی ٹکٹ کے خریدار یا بیوپاری کا پتہ ضروری معلومات کے ساتھ شائع کریں تاکہ مختلف مقامات کے لوگ بہ آسانی اس کا کاروبار کر سکیں۔

چند روز قبل گبنز کمپنی نے انعامی مقابلہ کرایا تھا کہ ٹکٹ کی کوئی بہترین وضع پیش کی جائے۔ ہزاروں نمونوں میں جو نمونہ پسند کیا گیا اس میں دنیا کا ایک نقشہ دکھلایا گیا ہے جس میں دونوں طرف دو عورتیں کھڑی ہیں جو بعد المشرقین کے باوجود نہایت سہولت سے خطوط کا تبادلہ کر رہی ہیں۔ موجودہ تمدن کی یہ ایک حقیقت ہے جو اس تصویر میں ظاہر کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں حیدرآباد کے چند مشہور ٹکٹی شوقینوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مسٹر مبارٹ (مقیم قریب باغ عامہ) کی اسّی سال کی عمر اسی شوق میں گزری ہے۔ اُن کے ذخیرہ کی قیمت ایک لاکھ روپیہ سے متجاوز ہے۔ اس کے بعد "نگروالا" (شراب فروش، توپ کا سانچہ) مسٹر احمد عبداللہ پروفیسر نظام کالج، مسٹر اسپیٹ پروفیسر عثمانیہ کالج اور مسٹر محمد صبغۃ اللہ مددگار مہتمم بندوبست ہیں۔ مسٹر اسپیٹ نے حال ہی میں ایک حیدرآبادی شوقین کا ذخیرہ ساڑھے چار ہزار کلدار میں خریدا۔

آخر میں اپنے مضمون کو دنیا کے سب سے بڑے ٹکٹی ہز مجسٹی کنگ جارج پنجم کے مختصر حالات پر ختم کرتا ہوں۔ آپ کئی سال تک رائل فلاٹلک سوسائٹی لندن (The Rayal Philatelic Society of London) کے صدر رہ چکے ہیں اور اب اس کے سرپرست ہیں۔ ہز مجسٹی کو بچپن ہی سے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق رہا ہے[1]۔ اور اس خصوص میں اپنے چچا ڈیوک آف اڈنبرا سے بہت مدد حاصل کی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ شریک کار تھا۔ گبنز نے اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ چھوٹے سے پیانہ پر ٹکٹ کا کاروبار بھی شروع کردے۔ باپ کے انتقال کے بعد گبنز نے اس کاروبار میں جو عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے اس سے آج ساری دنیا واقف ہے۔

[1] یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ہز مجسٹی کے فرزند اکبر یعنی پرنس آف ویلز کو بھی اس کا شوق ورا ثتہً ملا ہے۔ انکے پاس کا بھی ذخیرہ نایاب اور بیش بہا ہے۔

۱۸۹۳ء میں ہز مجسٹی نے (جو اس زمانہ میں ڈیوک آف یارک تھے) لندن کی ٹکٹی انجمن کی رکنیت اختیار کی۔ ۱۸۹۶ء میں صدارت پر آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۰۴ء میں ٹکٹ جمع کرنے والوں کے نام ایک خط شائع کرتے ہوئے ہز مجسٹی نے (جو اس وقت پرنس آف ویلز تھے) لکھا تھا کہ "وہ میری زندگی کے دلچسپ ترین مشغلوں میں سے ایک مشغلہ ہے"۔ متعدد مرتبہ ہز مجسٹی نے "فلاٹلک سوسائٹی" کے جلسوں میں دلچسپ اور قیمتی مضمون پڑھے جو انھیں کے الفاظ میں طابعیات[1] (Philatelics) پر تھے۔ شاہی ذخیرہ کی بہترین چیزیں ذاتی طور پر ہندوستان آسٹریلیا اور کینڈا کے سفر میں جمع کی گئی تھیں۔ ان میں سے مشہور ترین جواہر "پوسٹ آفس" کا جو غیر مستعملہ ٹکٹ ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ ٹکٹ لندن میں ۱۹۰۴ء میں ہراج ہوا تھا (۱۴۲۰) پونڈ تک جرمنی نے بولی لگائی تھی۔ تاکہ وہ جرمنی کے قومی ذخیرہ میں رکھا جائے لیکن شاہ جارج نے ۱۴۵۰ پونڈ میں اس کو خرید لیا[2]۔ اب اس کی قیمت ہر سال بڑھ رہی ہے[3]۔

---

[1] مصری ٹکٹ کو طابع کہتے ہیں اور یہاں طابعیات سے ٹکٹوں کا علم مراد ہے۔

[2] (Errington and Martin Co price List 1912. P.100

[3] یہ ٹکٹ اب چار ہزار پونڈ سے زیادہ قیمت پر دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے اور دو ایک ٹکٹ بعض کمپنیوں میں موجود ہیں۔

بُتِ کمسن

از جناب سید محمّد اکبر وفاقانی صاحب بی اے (عثمانیہ)

اے نور کی پتلی رُوحِ حیا　　اے حورِ بہشتی کی ہمتا
اک کیف تری گفتار میں ہے　　اک وجد تری رفتار میں ہے
پیمانہ تیری آنکھیں ہیں　　میخانہ تیری آنکھیں ہیں
تو ننھی بھولی بھالی ہے　　تو کالے کاکل والی ہے
شاعر کے دِل کی آہ ہے تو　　عاشق کا عزّو جاہ ہے تو
تصویرِ تبسّم تو ہی ہے　　اور جانِ تکلّم تو ہی ہے
تو حور ہے یا جنّت کی پری　　یا حسن کی مے شیشہ میں بھری
زُلفوں پہ کرن کا ہے جلوہ　　زربفت ہے نور و ظلمت کا
گالوں میں جانِ گلاب بھری　　آنکھوں میں رُوحِ شراب بھری
واں آنکھ میں پتلی کالی ہے　　یاں پہلو سے دل خالی ہے

کیا الھڑپن کی باتیں ہیں — کیا بھولے پن کی گھاتیں ہیں
کیا سادہ اور پُرکار ہے تو — انجان ہے اور عیّار ہے تو
کانوں میں تاگے کے ڈورے — دل صدقے ایسے زیور کے
چہرے پہ بلا کی معصومی — ہے تجھ میں خدا کی معصومی
شوخی و شرارت بھولاپن — بچپن میں جوانی کا جوبن
عاشق کے دل کو چُور کرے — جو وار کرے بھرپور کرے
آ۔ میرے دل کو مست بنا — بیکل ہوں مست الست بنا
اس دنیا سے بیزار ہوں میں — ان جھگڑوں سے ناچار ہوں میں
ہوں خاکستر اس گلشن میں — بے بال و پر اس گلشن میں
بُلبُل ہوں اور گُل کا جویا — بیمار ہوں سنبل کا جویا
گمنامی کا پیغام ہوں میں — یعنی کہ شکستہ جام ہوں میں
الفت کا ٹوٹا ساز ہوں میں — بسمل کے دل کا راز ہوں میں
متوالے کا اک راگ ہوں میں — پتھر میں چمکتی آگ ہوں میں
ناکام مری خاموشی ہے — بدنام مری سرگوشی ہے
تو مجھ کو بے پایاں کردے — اور الفت کے شایاں کردے

یونانیوں کی اصنام پرستی[1]

(از جناب احمد عارف صاحب)

عرب قدیم اور ہندوستان کی اصنام پرستی دنیا میں بہت مشہور ہے۔ لیکن اگر قدیم یونانیوں کے صنمیات کی چھان بین کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور ہند کی اصنام پرستی یونانیوں کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں۔ قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ سارا عالم دیوتاؤں اور دیویوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کے لئے علیحدہ علیحدہ دیوتا مقرر تھے۔ سارے مناظر قدرت مثلاً پہاڑ، دریا، جنگل وغیرہ کے دیوتا ہی حاکم تھے۔ فطرت کے ہمیشہ جاری رہنے والے اعمال تمام تر دیوتاؤں کے اختیار میں تھے جیسے پانی کا برسنا، بلاؤں کا نازل ہونا وغیرہ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمام انسانی جذبات غم، غصہ امید وغیرہ پر بھی دیوتاؤں ہی کا قبضہ تھا۔ ان کی طینتوں میں ذوقِ صنم پرستی اسقدر رچا ہوا تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں ان کی نظر پڑ جاتی یا فضائے کائنات میں ان کا طائر خیال جہاں کہیں اڑ جاتا وہیں ایک دیوتا انھیں دکھائی دیتا۔ جب اس قوم نے جہالت کے تاریک زمانہ سے اپنا قدم باہر نکالا اور ترقی کے میدان میں

---

[1] مضمون کے ماخذ:-

1. Greek Sculpture. by Ernest A. Gardner, M. A.
2. Greek Art, by Walter.
3. Select Passages from Ancient Writers
4. Encyclopaedia Britannica.
5. The Modern Encyclopaedia.

گام زن ہوئی تو تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اصنام پرستی میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ شاعرانہ نازک خیالی، لطافت پسندی اور حسن پرستی قدرت سے یونانیوں کے حصّہ میں آئی تھی۔ اور اس کا اثر اُن کی اصنام پرستی پر پڑے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ دیوتاؤں اور دیویوں کے ایسے حسین ترین مجسّمے تعمیر کرائے جاتے تھے اور صرف مرقعوں کے ذریعہ اُن دیوتاؤں کی طاقتوں کا اظہار اس شاعرانہ انداز سے کیا جاتا تھا جسے یونانیوں کے معیارِ حُسن اور نزاکت خیال کی انتہائی حد سمجھنا چاہیئے۔ ان بتوں کے مجسّمے اُن کی تہذیب و تمدّن کا ایک ضروری جزو تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ سارا یورپ ان مجسّموں کو بطور آرائش کے استعمال کرتا تھا۔ گو اب موجودہ تہذیب میں اس کے آثار نہ پائے جاتے ہوں لیکن جس طرح ایرانی تمدّن نے اردو لٹریچر پر اثر ڈالا، بالکل اسی طرح یورپین لٹریچر یونان کی اس تہذیب سے متاثر ہوا کہ آج اس میں سینکڑوں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات ان بتوں اور ان کی پیچ در پیچ داستانوں سے متعلق موجود ہیں۔

صنمیات کے ماہرین کا یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ آیا یونانی اپنے خداؤں کو مافوق الفطرت ہستیاں جان کر ان کی یادگار میں بت بناتے اور ان کی پرستش کرتے تھے یا طاقتور انسانی ہستیوں کو اپنا معبود سمجھ کر قدرت کی قوتوں کو ان سے منسوب کر دیتے تھے۔ لیکن اکثر لوگوں نے بعض قرائن کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ صرف انھیں کی قوم کے با جبروت انسان تھے جنہیں وہ اپنا خدا سمجھتے تھے۔ ایک وجہ تو وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان بتوں کے واقعات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کا رہنا بسنا، اٹھنا بیٹھنا، اور کھانا پینا غرض ہر فعل بالکل انسانوں کا سا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ جس قدر مجسّمے ان بتوں کے یہ تیار کرتے تھے وہ تمام تر خوبصورت انسانوں کے ہوتے تھے۔ بہرحال ان کے خدا، خدا ہوں یا انسان۔ لیکن ان کے حالات دلچسپی سے خالی نہیں۔ اب ہم چند جلیل القدر دیوتاؤں کا کچھ ذکر کرتے ہیں۔

آفرینش عالم کے متعلق یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے کیاس (Chaos) نامی ایک مادہ تھا جس کو وہ اپنا سب سے بڑا دیوتا سمجھتے تھے اور جس میں ہر قسم کی چیز پیدا کرنے کی قابلیت موجود تھی۔ تخلیق عالم کی خاطر کیاس نے تاریکی کے ساتھ جسے وہ دیوی سمجھتے تھے شادی کر لی۔ اس کے بطن سے تین بچے زمین رات اور ایریبس (Erebus) نامی ایک دیوتا جو بعد میں جہنم کا مالک قرار دیا گیا، پیدا ہوئے

ان بچوں میں ایریبس اور رات نے شادی کی تو رات کے بطن سے دو بچے دن اور آسمان پیدا ہوئے۔ اسکے بعد آسمان کا زمین سے، جو رشتہ میں آسمان کی خالہ یا پھوپی ہوتی تھی، آپس میں نکاح ہوگیا۔ ان کے پھر تین بچے پیدا ہوے۔ ایک سائیکلوپس (Cyclops) جس کی پیشانی میں صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسرا ٹائٹنس (Titans) جس کے سو سر تھے اور تیسرا ساٹرن (Saturn) اس کو (Cronos) یا زحل بھی کہتے تھے۔ انہیں تینوں بھائیوں کی اولاد آگے چلکر دنیا کی آبادی بڑھانے کا سبب ہوئی۔ اور ان میں کا ہر فرد یونانیوں کے عقیدہ میں بجائے خود ایک دیوتا تھا۔ ان کی سب سے جلیل القدر دیویاں اور دیوتا بارہ تھے جو قدرت کی جداجدا قوتوں کے مالک بنکر عام انسانوں کے کاروبار انجام دیتے تھے۔ ان تمام کی سکونت یونان کے سب سے بلند پہاڑ الیمپس پر تھی۔ ان بارہ دیوتاؤں کا حال یہ ہے۔

(۱) زیئوس (Zeus) اس کو (Jupiter) یعنی مشتری بھی کہتے تھے۔ یہ یونان کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ سیٹرن نے اپنی بہن رہیا (Rhea) کے ساتھ بیاہ کیا تو اس کے ہاں چھ بچے پیدا ہوئے جنیں زیئوس سب سے بڑا تھا۔ چونکہ یہ تمام عالم پر حکمرانی کرتا تھا اس لئے اہل یونان اس کو کل دیوتاؤں کا سردار سمجھتے تھے اور دنیا میں جس قدر برائیاں انسانوں سے سرزد ہوتی تھیں ان سب کا کرنے والا اسی کو جانتے تھے۔ زیئوس نے سب سے پہلے دانائی کی دیوی میٹس سے شادی کی جو سمندر کی بیٹی تھی۔ میٹس کے ایام حمل میں زیئوس نے خیال کیا کہ اگر میٹس (Metis) کو کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ ضرور عقل و دانائی میں سب سے بڑھا چڑھا ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کا وجود میری حکومت کی تباہی کا سبب ہو۔ اس خیال سے وہ میٹس کو کھاگیا۔ لیکن اس کو کھاتے ہی زیئوس کے سر میں ناقابلِ برداشت درد شروع ہوگیا۔ اس لئے اسنے حکم دیا کہ کلہاڑی سے اس کے سر کے دو ٹکڑے کردئے جائیں جب اس کے سر کے دو ٹکڑے ہوئے تو اس میں سے ایک حسین نوجوان اور مسلح دیوی نمودار ہوئی جس کا نام اتھینی (Athene) تھا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی تمام دیویوں نے اس کو اپنا سردار تسلیم کیا۔ مگر چونکہ عقل کی دیوی تھی اس لئے زیئوس نے اس کو اپنا مشیر خاص بنایا اور وہ نہایت اطاعت کے ساتھ اپنی خدمت انجام دیتی رہی۔ اس کے بعد زیئوس نے اپنی بہن ہیری (Here) کے ساتھ بڑے ہی تکلف سے شادی کی اور برات میں سارے عالم کے دیوتا شریک رہے لیکن زیئوس

بہت عیاش واقع ہوا تھا اس لئے ہیری اس سے ہمیشہ ناراض رہی ۔ زیئوس کے متعلق اہل یونان کا عقیدہ تھا کہ وہ سارے انسانوں اور دیوتاؤں کا جد امجد ہے انسانوں کا اس لئے کہ وہ عیاش ہونے کی وجہ سے (انسان) عورتوں سے تعلقات رکھتا تھا اور ان عورتوں سے جو اولاد ہوتی وہ انسان ہی ہوتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا دینا ۔ پانی برسانا، بجلی چمکانا یا بادل گرجانا اور رات دن پیدا کرنا زیئوس ہی کے فرائض تھے ۔ یونانی زیئوس کا جو بت بھی تیار کرتے وہ نہایت بیش قیمت اور خوبصورت ہوتا تھا ۔ سونے کے تخت پر ہاتھی دانت کا مجسمہ بٹھایا جاتا اور سر پر ایک زرنگار سائبان ہوتا ۔ بت کے دائیں بازو ایک عقاب ہوتا جو پر کھولے مورت کو دیکھتا ہوتا اور پر کی طرف اٹھے ہوئے دائیں ہاتھ میں کچھ رسیاں ہوتیں جو آسمانی قوتوں کی علامت تھی ۔ اور بائیں ہاتھ میں ایک مرصع عصا ہوتا تھا ۔ برہنہ جسم پر لہراتی ہوئی لمبی داڑھی یا تو شان خدائی کو ظاہر کرتی تھی یا سینہ اور پیٹ پر سے اتر کر نچلے حصے کو ڈھانکتی تھی[1]۔

(۲) ہفاسٹس (Hephæstus) آگ اور لوہاروں کا دیوتا مانا جاتا ہے ۔ یہ ہیری کے بطن سے زیئوس کا بیٹا تھا ۔ اور اسی کے ساتھ آسمان پر رہا کرتا تھا ۔ لیکن کسی بات پر زیئوس اس سے ناراض ہوا تو اسکو زمین پر پھنکوا دیا ۔ وہ جزیرہ لیمناس میں آگرا اور اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی ۔ یہاں وہ بڑی شان و شوکت سے رہنے سہنے لگا ۔ چونکہ لوہاروں کا دیوتا تھا اس لئے وہ لوہے کے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے تمام دیوتاؤں کے لئے ہتھیار مہیا کرتا تھا ۔ اس نے مٹی کی ایک مورت بنا کر اس میں جان بھری جو آگے چل کر پینڈورا (Pandora) دیوی مشہور ہوئی ۔ چونکہ تمام دیوتا اس کے وجود پر نازاں تھے اس لئے سبھوں نے تحفہ تحائف دیئے ۔ زیئوس نے بھی اُسے یہ کہکر ایک خوبصورت صندوق دیا کہ اس کی شادی ہو جانے پر یہ اس کے خاوند کی ملکیت ہے ۔ چنانچہ جب ایک دیوتا اپی میتھیوس (Epimetheus) سے اس کی شادی ہوئی تو اُس نے اس صندوق کو کھولا اور معاً سارے امراض اور برائیاں عالم میں پھیل گئیں ۔ صرف امید اس صندوق کی تہ میں باقی رہ گئی ۔ آج انسان اسی "امید" کی امید پر دنیا جہان کی مصیبتیں اٹھاتا اور زندگی

---

[1] اسکے مجسمے کی ایک اور تصویر دیکھنے میں آئی جس میں کسی قدر اختلاف ہے ۔ یعنی داڑھی مختصر ہے اور جسم ایک نیلگوں چادر سے نیم برہنہ ۔

بسر کرتا ہے ۔

یونانیوں کا خیال تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں کوہ آتش فشاں ہیں وہ سب کے سب ہیفائیسٹس کے لوہے کے کارخانے ہیں۔ اور آگ جہاں کہیں اپنا کام کرتی ہے سو وہ سب اسی کے حکم سے ۔ زمین و آسمان کی اولاد سائیکلوپس کی نسل جس کی صرف ایک ہی آنکھ پیشانی میں ہوا کرتی تھی' ہیفائیسٹس ہی کے زیر حکومت تھی۔

(۳) پوسائیڈن (Poseidon) سمندر کا دیوتا تھا۔ زیوس نے اس کو سمندروں کی سلطنت اس وجہ سے دی تھی کہ وہ اس کا حقیقی بھائی تھا۔ سمندروں میں طوفان اور تلاطم پیدا کرنا' جہازوں کو غرقاب کرنا۔ دریاؤں جھیلوں' تالابوں اور چشموں سے کام لینا اس کے فرائض تھے ۔ گویا پانی پر اس کی پوری حکومت تھی۔ اہل روم اسکو نیپچونس (Neptunus) کہتے تھے ۔ اسکے دوسرے بھائی بہنوں کی طرح اسکا باپ کرونوس اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اُسے بھی کھا گیا تھا مگر بعد میں کرونوس نے اس کو اگل دیا ۔ اسکا محل سمندر کی گہرائی میں تھا جہاں اسکے سنہری ایال اور پیتلی سموں والے گھوڑے بھی رہتے تھے ۔ وہ انھیں گھوڑوں کی ایک رتھ میں بیٹھ کر سمندر کی موجوں پر جو اس کی سواری کے وقت ہموار ہو جایا کرتی تھیں' سیر کیا کرتا ۔ یولیسس (Ulysses) کو اسی نے جبکہ وہ اپنی مہم سے گھر واپس ہو رہا تھا ۔ روک دیا تھا۔ کیونکہ یولیسس نے اسکے بیٹے پالیفیمس (Polyphemus) کی آنکھ پھوڑ دی تھی ۔

(۴) ایریس (Ares) یہ دیوتا بھی ہیری کے بطن سے زیوس کا بیٹا تھا۔ زیوس نے اس کو جنگ کی خدمت عطا کی تھی ۔ اہل یونان سمجھتے تھے کہ دنیا میں جس قدر جنگ و جدال واقع ہوتے ہیں وہ سب ایریس ہی کے کرشمے ہیں اور فتح و شکست کا ہونا' کسی قوم پر اس کی مہربانی اور نامہربانی کا نتیجہ ہے ۔ رومیوں کے ہاں اس دیوتا کی بڑی عزت تھی ۔ وہ اس کو مارس (Mars) یعنے مریخ کہتے تھے ۔ جنگ کو جاتے وقت ہر رومی سپاہی کا یہ فرض تھا کہ ایریس کے مندر میں جا کر اس کی برکت حاصل کرے ۔ کیمپس مارٹیس (Campus Martius) جو روما میں ایک بہت بڑا میدان تھا' اس دیوتا کی عبادت گاہ قرار دیا گیا تھا جہاں ہر رومی سپاہی فنون سپہگری کی مشق کر کے کمال حاصل کرتا ۔

یونان سے زیادہ روما میں ایریس کے مندروں کی کثرت تھی ۔ چونکہ اہل روما کسی زمانہ میں خالص

سپاہی پیشہ تھے اس لئے وہ اس دیوتا کی یونانیوں سے زیادہ قدر منزلت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روم میں جگہ جگہ اس کے مندر پائے جاتے ہیں۔ اس کا مجسمہ نہایت شاندار بنایا جاتا تھا۔ دو گھوڑوں کی رتھ میں ایک ضعیف آدمی بیٹھا ہوا ہوتا لیکن چہرہ سے جلال اور شان خونخواری ہویدا۔ تمام جسم بیش قیمت اسلحہ سے آراستہ جلو میں آگے کی طرف ایک عورت پھٹے کپڑوں میں لپٹی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ اسے نا اتفاقی کہتے تھے۔ پیچھے کی طرف ایک برہنہ وحشی کی مورت ہے جسے وہ غیظ و غضب سے تعبیر کرتے تھے۔

(۵) اپالو (Apollo) موسیقی، شاعری اور فصاحت کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ یہ بھی لیٹونا (Latona) کے بطن سے زیئوس ہی کا بیٹا تھا۔ زیئوس نے اپالو کے بیٹے اسکیولائپس (Aesculapius) کو بجلی کی رسی سے جسے سائیکلوپس کی نسل نے تیار کیا تھا، ہلاک کر دیا۔ اس بناء پر اپالو نے سائیکلوپس کی قوم کو قتل کر ڈالا۔ زیئوس اس حرکت پر بہت خفا ہوا اور اپالو کو اپنی آسمانی بادشاہت سے نکال باہر کیا۔ وہ ایک عرصہ تک تھسلی کے بادشاہ کی بھیڑوں کی گلہ بانی کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ کوہ پرناسس (Parnassus) پر جہاں فنون لطیفہ وغیرہ کی نو دیویاں جلوہ آرا تھیں مقیم ہو گیا۔ دیویوں کو جب اس کی آمد کی خبر ہوی تو اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بزم سرود کا صدر نشین بنایا۔ اب ہمیشہ راگ کی محفلیں سجنے لگیں۔ اپالو ایک زرین تخت پر رونق افروز ہوتا۔ نو دیویاں تخت کو اپنے حلقہ میں لئے کھڑی رہتیں۔ اپالو اپنی موسیقی اور آلات موسیقی سے ان کو نغمے سکھایا کرتا۔ ان نو دیویوں کو میوزیں (Muses) کہتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) یورینیا	(Urania)	علم ہیئت کی دیوی
(۲) پولی ہمنیا	(Polyhymnia)	علم کلام ؍؍ ؍؍
(۳) کلیو	(Clio)	تاریخ ؍؍ ؍؍
(۴) کیلیوپی	(Calliope)	نظم رزمیہ و فصاحت ؍؍ ؍؍
(۵) اراٹو	(Erato)	عشقیہ غزلیات ؍؍ ؍؍
(۶) یوٹرپی	(Euterpe)	علم موسیقی کی دیوی
(۷) ٹرپسیکور	(Terpsichore)	رقص ؍؍ ؍؍

(۸) میلپومین (Melpomene) سرود کی دیوی

(۹) تھیلیا (Thalia) نقل و سوانگ " "

(٦) ہرمیز (Hermes) یا عطارد (Mercurius) بھی زیوس ہی کا بیٹا تھا۔ زیوس نے اس کو تمام دیوتاؤں کا ایلچی اور دولت و تجارت کا سرپرست بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو اور باتوں میں بھی دخل تھا مثلاً وہ فصاحت اور فن تقریر میں صاحب کمال ہونے کے ساتھ ساتھ چوری کرنے میں بھی استاد تھا۔ چنانچہ وہ مختلف دیوتاؤں کے سامانوں کو باوجود ان کی سخت احتیاط کے کمال ہوشیاری سے چرایا کرتا تھا۔ اسی بنا پر یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ چوروں کا بھی دیوتا ہے۔ اور جس قدر ڈاکہ زنی اور چوریاں دنیا میں ہوا کرتی ہیں وہ سب اسی کی ایما سے۔ لیکن اہل روما کے نزدیک ہرمیز کا اصلی کام تمام دیوتاؤں کو زیوس کی پیغام رسانی کرنا ہے اور بس۔ اسی غرض سے زیوس نے اس کو ایک جوتا اور ٹوپی ایسی عنایت کی تھی کہ وہ اس کو پہنتے ہی چشم زدن میں جہاں چاہے پہنچ جاتا تھا۔

(۷) ہیریٰ (Here) دیویوں میں سب سے زبردست دیوی تسلیم کی گئی ہے۔ یہ زیوس کی سگی بہن ہے لیکن جب زیوس اپنی پہلی بیوی میٹس کو کھا چکا تو ہیری کو اپنی زوجیت میں لینا چاہا ایک عرصہ تک ہیری انکار کرتی رہی۔ لیکن تمام دیوتاؤں کے اصرار سے بالآخر مجبور ہو گئی، اس کی شادی میں جو نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی، عالم کے تمام دیوتا شریک تھے۔ ہیری کی زندگی شادی ہونے کے بعد سے ہمیشہ تلخ رہی کیوں کہ زیوس کے عیاش ہونے کی وجہ سے ہیری اس سے ہمیشہ جھگڑا کرتی رہتی تھی اس کو زیوس کے ساتھ اپنی شادی کرنے پر ناز تھا، اور اس لئے وہ اپنی ناجائز سوکنوں کو نفرت سے دیکھا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اپنی سوکنوں کی اولاد سے براسلوک کرنے کی بنا پر زیوس نے اس کو آسمان سے زمین پر دے پٹکا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے زیوس کی نظروں سے گر گئی۔

یونانی جس طرح زیوس کو اپنا سب سے بڑا دیوتا مانتے ہیں اسی طرح ہیری بھی دیویوں میں سب سے بڑی دیوی ہے۔ زیوس کے علاوہ سب دیوتاؤں سے زیادہ یونان میں اس کے مندر پائے جاتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اور دیوتاؤں سے بھی زیادہ یہ دیوی ہر دلعزیز تھی، یونانی اس کے مجسمے طرح طرح کے

نہایت خوبصورت اور عالیشان تیار کراتے تھے جنہیں فنون لطیفہ کا بہترین مظہر سمجھنا چاہئے۔

(۸) وینس[1] (Venus) یا زہرہ حسن و عشق کی دیوی ہے۔ یونانیوں میں اس کی پیدایش کے متعلق ایک عجیب مضحکہ خیز روایت چلی آتی ہے۔ تکوین عالم کے دوران میں جبکہ آسمان و زمین کا آپس میں نکاح ہوا تو ان کو اولاد بہت قوی اور زبردست ہونے لگی' آسمان کو اُن کی قوت کی بناء پر شبہ ہوا کہ کہیں بڑے ہو جانے پر وہ مجھے اپنی حکومت سے نہ خارج کر دیں' اس لئے آسمان اُن کو ہوش سنبھالتے ہی قید کر دیا کرتا زمین اپنے کمسن بچوں کی مصیبت کو برداشت نہ کر سکتی تھی' ایک دن اس نے اپنے گود کے بچے کرونوس کو ایک ہتھیار دیا' اور اس وقت جبکہ آسمان زمین سے اختلاط کرنے کے لئے تیار تھا' کرونوس نے اپنے باپ آسمان کا عضو تناسل کاٹ ڈالا۔ جو سمندر میں آگرا جس کی وجہ سے سمندر میں تھوڑی دیر تک ایک غیر معمولی تلاطم اور جوش و خروش پیدا ہوا اور اس کے بعد اس عضو تناسل سے ایک حسین و جمیل دیوی نمودار ہوئی۔ یہی وینس تھی۔ زیوس کے حکم سے یہ ہیفا یسٹس کے ساتھ بیاہی گئی۔ یہ اس قدر حسین تھی کہ ساری دیویوں میں بے مثل سمجھی گئی۔ ایک مرتبہ شاہ تھسلی پیلوس (Peleus) نے اپنی شادی میں سوائے نااتفاقی کی دیوی کے تمام دیویوں کو دعوت دی۔ نااتفاقی کی دیوی نے صرف ایک سیب روانہ کر دیا کہ یہ اس دیوی کو دیا جائے جو سب سے زیادہ حسین ہو۔ ہیری' وینس اور ایتھن' تینوں دیویاں اپنے آپ کو سب سے زیادہ حسین سمجھتی تھیں لہذا یہ تینوں اس سیب کے لئے جھگڑا کرنے لگیں۔ بالآخر پیارس نامی ایک چرواہا اس جھگڑے کا منصف قرار پایا۔ تینوں نے اپنی اپنی قوت کے مطابق دنیوی سلطنت' حسین عورت اور فوجی شان و حکومت کی لالچ دلائی کہ سیب مجھے دیدیا جائے' لیکن پیارس پر حسن کا جادو چل گیا اور اسنے وینس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اور وینس نے حسب وعدہ اس وقت کی مشہور ترین ملکہ حسن ہیلن[2] (Helen) کو

---

[1] یہ رومی زبان کا لفظ ہے اور یہی یونانیوں میں بھی رائج تھا' تاہم (Ahprodite) ایک خاص نام اس دیوی کو انہوں نے دے رکھا تھا۔

[2] یہ وہی ہیلن ہے جس کے نام کو ہومر کی مشہور و معروف نظم الیڈ نے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اور جنگ ٹرائے کا واقعہ جو اس نظم میں مذکور ہے سو اس کا سبب یہی مندرجہ بالا واقعہ ہے۔

جو شاہ اسپارٹا مینلاس (Menelaus) کی بیوی تھی، پیارس کے حوالے کر دیا۔ حسن و عشق کے باب میں یونانیوں کی ساری آرزوں اور تمناؤں کا ملجا و ماؤا یہی دیوی تھی۔ اس کے بھی نہایت خوبصورت اور پرشکوہ مجسّمے بنائے جاتے تھے۔

(۹) ایتھینی، علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی اور عقل و دانش کی دیوی ہے، اس کی پیدائش کا ذکر ہم نے تفصیل سے زیئوس کے حال میں کر دیا ہے، مختصر یہ ہے کہ وہ زیئوس کے سر سے جبکہ اس کے دو ٹکڑے کر دئے گئے، ایک حسین مسلح اور نوجوان دیوی کی شکل میں نمودار ہوئی تمام دیویوں نے اس کو اپنا سردار مانا۔ اور خود زیئوس بھی اس کے کمالات کا معترف ہو کر اس کو اپنا مشیر خاص بنایا۔ یہ ہمیشہ کنواری رہی۔ شہر ایتھنز[۱] میں اس دیوی کا بہت ہی خوبصورت مندر تھا جہاں صرف کنواریاں جمع ہو کر اس کی عبادت کیا کرتی تھیں۔

(۱۰) ارٹمیس (Artemis) چاند اور شکار کی دیوی کہلاتی تھی۔ یہ بھی لیٹونا کے بطن سے زیئوس کی بیٹی تھی۔ زیئوس نے حاملہ عورتوں کی حفاظت کی خدمت اس کے سپرد کر رکھی تھی، یہ بھی کنواری رہی۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جماعت کنواری دیویوں کی رہا کرتی تھی جو اس کے دست نگر تھی۔ وہ شکار کی بہت شائق تھی، اور ہمیشہ جنگلوں کو اپنی پوری جماعت کے ساتھ سیر و شکار کو جایا کرتی۔ حاملہ عورتیں خواہ وہ زمین کی ہوں یا آسمانی دیویاں، اس کی خاص طور پر عبادت کرتی تھیں۔ اہل روم اس کو ڈیانا (Diana) کہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس دیوی کا مسکن چاند کے اندر ہے۔

(۱۱) ڈمیٹر[۲] (Demeter) کا کام غلہ اگانا تھا۔ یونانیوں کے عقیدہ میں ان کے بارہ دیوتاؤں میں اس دیوی کی خاصی منزلت تھی، کیونکہ وہ دنیا کے انسانوں کے لئے خورونوش کی چیزیں فراہم کرنے والی تھی۔ اس کی ایک خوبصورت بیٹی پروسرپنا (Proserpina) تھی۔ ایک وقت جبکہ یہ سسلی کی کسی وادی میں سیر کر رہی تھی، پلوٹو (Pluto) نامی ایک دیوتا نے اسے دیکھا اور اس کے حسن پر شیدا ہو کر اس سے

---

[۱] چونکہ اس شہر میں ایتھینی کا مندر تھا اسلئے شہر کا نام بھی قدرے تغیر کے ساتھ ایتھنز (Athens) ہوگیا۔

[۲] اہل روم اس کو (Ceres) کہتے تھے۔

اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن جب پروسرپن کسی طرح اس کے دام میں نہ آئی تو یہ جبراً اس کو آسمان پر اڑا لے گیا۔ ڈمیٹر اپنی بیٹی کی تلاش میں بہت سرگرداں پھری۔ جب اس کو ہر طرف سے نا اُمیدی ہوئی تو وہ آسمان پر زیئوس کے دربار میں حاضر ہو کر داد کی طلبگار ہوئی۔ زیئوس نے پہلے پہل اس کی کچھ حامی نہ بھری۔ لیکن جب وہ زار و قطار رونے لگی تو اُس کو کچھ رحم آیا اور اس نے پروسرپن کو حکم دیا کہ وہ سال میں چھ مہینے اپنی ماں کے پاس رہے۔ جب وہ آسمان سے زمین پر آئی تو اس نے دیکھا کہ کاشتکاری سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ساری مخلوق بھوکی مر رہی ہے۔ ڈمیٹر نے خیال کیا کہ اگر میں ایک عرصہ کے لئے زمین سے غیر حاضر ہو جاؤں تو ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ یہیں سے اس نے انسانوں کو کاشتکاری کا فن سکھانا شروع کیا

(۱۲) ہسٹیا، خانگی کاروبار (جن کا تعلق گھریلو زندگی سے ہوتا تھا) کی دیوی تھی رومی اس دیوی کی عبادت عام طریق پر کیا کرتے تھے۔ برخلاف اس کے یونانی اس کے نام سے ایک آگ پارسیوں کی طرح جلایا کرتے تھے جو ہر وقت گھروں میں جلتی رہتی تھی۔ وہ اس آگ کی پوجا اور اس کی حفاظت کیا کرتے اگر اتفاقاً کسی گھر میں آگ بجھ جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ اس خاندان پر بہت بڑی بلا نازل ہونے والی ہے۔ رومیوں میں اس دیوی کی خاص طور پر عبادت ہوا کرتی تھی یعنی کنواری عورتوں کی ایک جماعت اس کی عبادت کے لئے وقف ہوتی تھی۔ اگر اس حلقہ کی کسی عورت کے دامن عفت پر دھبہ آجاتا تو وہ ایک منظر عام پر زندہ جلا دی جاتی۔

کل کا گھوڑا

از جناب مرزا الم نشرح صاحب

یہ مضمون بغرض اشاعت رسالہ نمایش کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن ہمارے کرم فرما مولوی عظمت اللہ خانصاحب کے اصرار پر جناب رفیق بیگ صاحب ایڈیٹر نمایش نے ازراہ عنایت ہمارے ہاں روانہ فرما دیا۔ صاحب موصوف کے ہم بے انتہا ممنون ہیں۔ مرزا الم نشرح صاحب نے ابتداءً جو خط ایڈیٹر صاحب نمایش کو لکھا تھا وہ بجائے خود دلچسپ ہے۔ اس لئے وہ بھی ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"مجلہ"

جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ نمایش

السلام علیکم

آپ جانتے ہیں کہ آجکل کی نئی پود نے ملک کی بہبودی کیلئے ڈاکہ کو جائز قرار دیا ہے چنانچہ بنگالہ کی حالت اسکی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو میں بھی "پنچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی" کے مقولہ پر عمل کر کے اردو کی خاطر انگریزی ادب پر ڈاکہ ڈالتا ہوں۔ لیکن مال کی ہیئت تبدیل کرنے کے لئے بہت کچھ کتر بیونت کر دیتا ہوں۔ تاکہ شناخت کی وجہ سے ڈاکہ کا الزام عاید نہ ہو سکے۔ اگر چوری کا مال خریدنے اور نکاسی کرنے کی ہمت ہے تو بسم اللہ نمایش میں کسی جگہ جما دیجئے ورنہ واپس فرمائیے۔ خدا کے فضل سے دنیا میں مال مسروقہ خریدنے والوں کا توڑا نہیں۔ مال کھرا ہے۔ میں کہیں اور دام کھرے کر لونگا۔ دیکھئے ایک راز کی بات بھی کہے دیتا ہوں۔ کسی سے کہیئگا نہیں اس مضمون کا کچھ خاکہ جون ۱۹۰۹ء کے پیرسنز میگزین سے اڑایا گیا ہے۔ لیکن اضافہ واقعات اور طرز ادا نے دونوں مضمونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی نہ کہیگا

کہ یہ مال فلاں مال کو گلا کر بنایا گیا ہے۔ پیرسنز میگزین بھی اس کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ آپ مقابلہ کرکے اپنی عقل کا اندازہ لگا لیجئے۔ والسلام

کمترین مرزا الم نشرح

موجد دنیا میں سیکڑوں ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مسٹر مور جیسا موجد نہ کرے۔ بندہ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ جب دیکھو اپنے دار التجربہ میں بیٹھے ہیں۔ جب جاؤ اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے آمدہ آ جاتی تھی۔ مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں خیریت سے تو ہو۔ ہزاروں ایجادوں سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھے کہ دنیا ہے کیا بلا۔ اور دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ جنگ عظیم میں ان کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں۔ لیکن ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جنگ کب چھڑی! کیوں چھڑی!! کون جیتا کون ہارا۔ ایک دن میں نے باتوں ہی باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی بساط سے بہت زیادہ ہمت دکھائی۔ پوچھنے لگے کہ یہ مسٹر بلجیم کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ بھلا ایسوں کی صحبت سے کسی کا کیا دل بہل سکتا ہے۔

میں تو ٹھیرا بیوپاری کہ پیسوں کے لئے مردہ کا کفن بھی اتروا لوں۔ اور مسٹر مور ٹھیرے ایسے بے پروا کہ اپنی کسی ایجاد کی رجسٹری تک نہ کروائی۔ میں نے کئی دفعہ کہا بھی تو یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامۂ خلایق کے فائدہ کے لئے ہے۔ کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے اور نہ ٹکے پیدا کرنے کے لئے ہے۔ ایک دوربین ایجاد کی تھی کہ گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھائی تھی۔ لیکن میرے یار نے اس کی بھی رجسٹری نہ کرائی۔ نتیجہ یہ ہوا ایک کارخانہ نے اپنے نام سے اس کی رجسٹری کرا کے لاکھوں روپیہ کھڑے کر لئے۔ جب میں نے مور سے اسکا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانہ پر ہرجہ کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ بہر حال مور کی ایجادات دریا کی لہریں تھیں کہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھیں۔ اور بغیر ان کو فائدہ پہنچائے ان کی حد تک فنا ہو جاتی تھیں۔ گو دوسرے ان سے پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔ اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ میں پہنچا دئے گئے ہوتے۔ ان کی ذات سے سب ہی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ نہ پہنچتا تھا تو مجھکو۔ کیونکہ مجھے خبر تک نہ ہوتی تھی کہ ان کی کوئی تازہ ایجاد کب مکمل ہوئی اور کب نصیب دشمناں ہو گئی۔ خود مور سے تو اس کی توقع رکھنی ہی فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے۔ اگر حال کھلتا تھا تو اخباروں سے۔ اور "اب پچھتائے

کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی۔ اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی۔ تو میں پرواہ بھی نکرتا۔ لیکن کار بار کے مندے اور اکثر بیوپاریوں کی نادھندہی نے مجھکو کھک کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں آپ ہی انصاف کیجیئے کہ اپنے سچے مگر حاجتمند دوست کے ساتھ مور کی یہہ بے اعتنائی قابلِ شکایت ہے یا نہیں۔ ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے دارالتجربہ میں کچھ کام کر رہے ہیں۔ وہیں چلا گیا اس روز ان کی طبیعت کچھ بشاش معلوم ہوتی تھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھکر پوچھنے لگے "یہ کیا کتاب ہے" میں نے کہا دہلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ پوچھا کہ مضمون کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یوں ہی واہی تباہی بکا ہے۔ ایک کل کا گھوڑا بنایا ہے۔ اس پر سوار ہو کر شاہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا۔ غرض اسی طرح کی بے تکی باتیں ہیں۔ مجھسے اتنا سنتے ہی مور کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے۔" ذرا مجھکو کل کے گھوڑے والا حصّہ تو سناؤ" میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔ لیکن پڑھنے میں خلاف فطرت باتوں کے متعلّق شاعر کا مذاق بھی اڑاتا گیا۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا" او بے ادب خاموش۔ تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پرزوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا۔ تم جیسوں کے لئے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں۔ لیکن سمجھنے والے کے لئے اس کا ہر نکتہ چراغِ ہدایت ہے۔" یہ سنکر میں دم بخود ہو گیا۔ کیونکہ ڈرتا تھا کہ یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکہ میں میرے جسم کے ذرات بنا کر ہوا میں نہ اڑادیں۔ اس لئے ٹالنے کے لئے مسکرا کر کہا کہ اگر تم کو یہ کتاب پسند ہے تو میں چھوڑے جاتا ہوں۔ میرے تو کسی کام کی نہیں۔ اس سے کیا بہتر ہے کہ میرے کسی دوست کے کام آجائے۔ مور نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ" یار عزیز اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے۔ اس کو میں عملی صورت دینا چاہتا ہوں۔ بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں تو بہتر ہے۔ اچھا خدا حافظ" اس کی یہ اکھڑی اکھڑی باتیں سنکر بڑی کوفت ہوئی اور میں دل میں اس کو صلواتیں سناتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

چند روز تک میرا مور کے پاس جانا نہ ہو سکا۔ ایک دن جو اُدھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مور کے دارالتجربہ میں ایک نہایت خوبصورت مشکی گھوڑا کھڑا ہنہنا رہا ہے۔ مجھے مور کے پاس گھوڑا دیکھکر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ۔ میں خود گھوڑوں کا بہت شوقین ہوں۔ کوئی گھوڑ دوڑ نہیں ہوتی جس میں اپنا کام ہرج کر کے نہ جاؤں۔ اس گھوڑے کو جو دیکھا تو بظاہر جاندار پایا۔ پاس جاکر تھپکا۔ سم دیکھے بھونریاں دیکھیں۔ جوڑ دیکھے۔ غرض ہر طرح بے عیب پایا۔ اتنے میں مور بھی اپنے کسی تجربہ سے فارغ ہو کر میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا "یار من یہ گھوڑا کہاں سے مار لائے اور لا کر کہاں رکھا ہے کہ دارالتجربہ میں۔ کیا خون کا امتحان کر رہے ہو۔ یا بجلی سے علاج"۔ مور نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور کہا "یار جانی۔ یہ وہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ صرف دوڑتا ہے۔ اُڑ نہیں سکتا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ کہ یہ شاعر غضب کا دماغ لیکر آیا تھا۔ پرزے تو میں نے بھی نکال لئے مگر ان کو بٹھا نہیں سکتا۔ خیر آئندہ دیکھا جائیگا"۔ مجھے مور کی یہ گفتگو بہت بُری معلوم ہوئی۔ گویا ہم کو اندھا بنا رہا ہے میں اُس کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ مگر وہ برابر ہنستا رہا۔ آخر کہنے لگا کہ کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو؟ میں نے کہا اور نہیں تو کیا یہ مٹی کا ہے۔

مور۔ مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے۔

میں۔ تو کیا میں اندھا ہوں۔

مور۔ تو اس کا اندازہ تم خود کر لو۔

یہ کہکر اُس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دبایا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار اِدھر سے اُدھر دوڑے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں پُرزے اس سرے سے اس سرے تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں یہ دیکھکر میرے ہوش گم ہو گئے۔ جب ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ مور کیا واقعی یہ گھوڑا دوڑ سکتا ہے۔

مور۔ تو کیا میں نے یہ بچّوں کا کھلونا بنایا ہے میاں دوڑیگا اور خوب دوڑیگا۔

میں۔ اور اس کی انتہائی رفتار۔

مور۔ اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم (۳۰۰) میل فی گھنٹہ ہوگی۔

میں۔ (۳۰۰) میل!

مور۔ ہاں (۳۰۰) تین سو میل بلکہ کچھ زیادہ۔

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنے کا خیال آگیا۔ اور سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا۔ تو بس میرے دِلدّر پار ہوگئے۔

میں۔ کیوں یار اسے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑاتے۔

مور۔ ڈربی کیا بلا ہے۔

میں نے اس کو سمجھانا چاہا مگر گھوڑ دوڑ کا مطلب نہ اس کی سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر میں نے اس سے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ اس کی رفتار کم زیادہ ہوسکتی ہے۔

مور۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ اگر رفتار کم زیادہ نہ ہوسکے تو پھر ایجاد ہی کیا خاک ہوئی۔

میں۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کرو گے کیا۔ کیا آچار ڈالو گے۔

مور۔ کچھ نہیں کوئی صاحب آکر اٹھا لیجائینگے پھر نہ گھوڑے کو مجھسے کچھ کام اور نہ مجھکو گھوڑے سے کچھ غرض۔

میں۔ تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو۔

مور۔ تم ہی لیجاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمھارا ہی ہے۔ تمھاری ہی کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے۔ اور تم ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ یعنے مور سے اس کے چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی۔ گھوڑے کو کمرہ سے نکالا۔ سوار ہو کر گھر آیا۔ اور تھان پر باندھ دیا۔ اس کے ایک دو روز بعد میں مور کے پاس گیا۔ اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھیڑا۔ لیکن میرے یار کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا یا نہیں چلو گئی گذری بات ہوئی۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈربی سے پہلے اس گھوڑے کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگالوں تاکہ لوگ اس کی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور ایک دفعہ ہی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونے کے متعلق کوئی خاص طور کا

اعتراض نہو سکے۔ رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرنے کے لئے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اسکا نام دریافت کیا۔ یہہ ٹیڑھی کھیر تھی اور میں اس کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن میری تیزی طبع نے اس مشکل کو بہ آسانی رفع کر دیا۔ پہلے میں نے اس کا نام "آدم" بتایا۔ مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کیلئے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جب انھوں نے ضابطہ کی دفعہ بتائی تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا۔ آخر سوچتے سوچتے "ایجاد" نام سمجھ میں آیا "ضرورت" کو ایجاد کی ماں بتایا اور "تجربہ" کو اس کا باپ۔ دادا پر دادا کا نام دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامہ پر عمل کر کے "شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر" کی بجائے۔ ترقی ابن ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ستر پشت تک گنوا دیا۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا۔ اور "ایجاد" کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹری ہو گئی۔

اب دوسری مشکل چابک سوار کی تھی۔ سوار ایسا ہونا چاہیئے تھا جس کا نام فہرست چابک سوار میں بھی درج ہو۔ اور جو لفظ ضمیر اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہو۔ اور ساتھ ہی قابل اعتبار بھی ہو ظاہر ہے کہ ان صفات کا انسان ملنا آسان نہیں ہے۔ مگر مثل مشہور ہے جویندہ یابندہ۔ ایک اللہ کے بندے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال ہی لیا۔ اس کا نام فہرست میں تو ضرور تھا لیکن مرد میداں نہ تھے۔ دو چار مرتبہ گھوڑ دوڑ میں شریک بھی ہوئے۔ مگر اپنی نا اہلی سے جیتتے ہوئے گھوڑوں کو ہرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کے کھانے کو رزق اور مرنے کو موت نہو۔ وہ بیچارہ ضمیر اور اس کے پیچیدہ افعال کی بحث میں کیوں جانے لگا۔ قصہ مختصر انہوں نے بلا پس و پیش نہایت خوشی سے میری ملازمت قبول کرلی۔ مجھے ان کی تمام صفتوں میں ان کی خاموشی سب سے زیادہ پسند آئی۔ ان کی خاموشی کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصاویر ان کی خاموشی پر رشک کرتی تھیں اور بت اس دیو جانس کلبی کے سامنے افلاطون اور سسرو معلوم ہوتے تھے۔

انکا نام تو کلیمنٹس۔ جولیس۔ آگسٹس جو فری ڈی گبر لیلیو تھا۔ لیکن اپنی خاموشی کو نباہنے کے لئے یہ صرف اپنا نام "کل" بتایا کرتے تھے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گھوڑا بھی کل کا اور چلانے والا بھی مجسم "کل"۔

میاں بات یہ ہے کہ یہ سب بن پڑی کا سودا ہے۔ جب تقدیر سیدھی ہو جاتی ہے تو سب مشکلیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں۔ چند ہی روز میں گھوڑا بھی مل گیا۔ اور کوڑا بھی مل گیا۔ اب رہ گئی دوڑ تو وہ تو پہلے سے جیتی جتائی رکھی تھی۔

غرض اسی طرح دن پر دن گذرتے گئے اور آخر کار گھوڑدوڑ کا دن آگیا۔ لیکن اس گھوڑے نے ایسی گمنامی میں پرورش پائی تھی کہ کسی کو کانوں کان یہ بھی خبر نہ تھی کہ "ایجاد" کیا بلا ہے کس دم کس کا ہے اور اس کے جیتنے کی بھی توقع ہے یا نہیں۔ عین گھوڑدوڑ کے دن صبح کو ٹٹو کی پہلی بیوقوفی کا اظہار ہوا شاید اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زین گھوڑے کی کمر پر کسا جاتا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو رفتار بدلنے کے بٹن پیٹھ پر قایم نہ کرتا۔ پہلی رفتار کا تعلق تو لگام سے رکھا تھا۔ لیکن بقیہ جس قدر تیز رفتاریاں تھیں۔ ان کے بٹن آگے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا دئے تھے۔ آخر مسٹر کل نے اس معمہ کو حل کیا اور زین بجائے پیٹھ کے "ایجاد" کے پٹھوں پر کس دیا گیا۔ چونکہ رکابوں کے لئے جگہ نہ تھی اس لئے ان کو سرے سے اڑا ہی دیا گیا۔ اور مسٹر کل زین پر اکڑوں بیٹھکر مقابلہ کے لئے میدان میں اس طرح داخل ہوئے کہ اُن کی سوکھی ٹانگوں کے گھٹنے اون کے کانوں سے اوپر نکل گئے تھے۔ کمر دوہری ہو کر کمان بن گئی تھی۔ اور وہ گھوڑے کے ہر جھٹکہ پر زین سے پھدکتے اور پھر وہیں آبیٹھتے تھے۔

رغبت اور نفرت دیوانگی کی ابتدائی حالتوں کا نام ہے۔ طبیعت ایک چیز کو بلا وجہ پسند کرتی ہے اور دوسری کو بلا وجہ ناپسند۔ یہی حالت گھوڑدوڑ کے گھوڑوں کی ہے۔ بعض گھوڑوں کو محض اس وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ ان کے باپ داداؤں نے یہ یہ کارگذاریاں دکھائی تھیں اور بعض کو اس لئے نظر سے گرایا جاتا ہے کہ انکا سلسلہ نصب حضرت آدم کے گھوڑے تک نہیں پہنچتا۔ میرے بیچارے گھوڑے کو اس طوفان بے تمیزی میں کون پوچھتا۔ اس کی حالت بس اس نواب بوچڑ یا راجہ پنساری کی سی تھی جو بھٹکتی نوابوں اور راجاؤں کے کسی جلسہ میں آگیا ہو۔ کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ گھوڑا ہے یا گھوڑی۔ گدھا ہے یا خچر۔ جب یہ صورت ہو تو بھلا اس چیز کا کون اندازہ کرنے لگا کہ واقعی یہ گھوڑا ہے بھی یا نہیں۔ البتہ مسٹر کل کے طریقہ نشست کا بڑا خاکہ اڑایا گیا۔ مگر اس اللہ کے بندے نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی

کہ یہ فقرے اس پر کسے جا رہے ہیں یا کسی اور پر۔ شرطوں کی یہ حالت تھی کہ بعض گھوڑوں پر ایک پر دو بھی مشکل سے ملتے تھے مگر "ایجاد" پر ایک ایک کے سَو سَو دینے پر لوگ تیار تھے۔ میں نے بھی اپنی جمع پونجی سب اس شرط پر لگا دی۔ اور نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔ گھنٹی بجی۔ جھنڈی گری اور گھوڑے تیر کی طرح نکلے۔ مسٹر کل نے یہ ہوشیاری کی کہ "ایجاد" کو شتر بے مہار نہیں کیا۔ بلکہ اس کو نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا لایا۔ اور صرف ناک کی پھننگ سے یہ دوڑ جیتی۔ ہزاروں کے دیوالے نکل گئے۔ اور میں نے صرف ایک دوڑ میں دس لاکھ روپے سمیٹ لئے۔ اس میں سے ایک لاکھ روپے تو مسٹر کل کے حصہ میں آئے۔ اور بقیہ نے میری حالت قابل رشک بنا دی۔ تمام دنیا میں اسی دوڑ کا چرچا ہو گیا۔ تین اخباروں کے مضامین کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں۔ اس سے لوگوں کے خیالات کا اندازہ لگ سکیگا۔

"اخبار گھوڑ دوڑ"

لکھتا ہے ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو گھوڑا گذشتہ دوڑ میں جیتا ہے۔ وہ سلطان روم کی خاص سواری کا تھا اور محض اس کی قوت اور کس کا اندازہ کرنے کے لئے تبدیل نام کے ساتھ اس کو اس دوڑ میں شریک کیا گیا تھا۔ ہم نے اپنے قارئین کی اطلاع کے لئے ہزاروں روپے خرچ کر کے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ اس گھوڑے کی نسل کو پوشیدہ رکھنے میں انتہائی کوشش کیجاتی ہے۔ اور بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی ماں اور باپ دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔ تا کہ نسل زیادہ نہ بڑھے۔ یہ ابتک پتہ نہ چلا کہ ان گھوڑوں کا جنگل صحرائے عرب کے کس حصہ میں واقع ہے۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو چکا ہے کہ جتنے سائیس اور سوار اس جنگل میں ہیں۔ اُن کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں۔ اور زبانیں کاٹ لی گئی ہیں۔ تاکہ کسی کو اس جنگل کی جائے وقوع معلوم نہ ہو سکے۔ آیندہ جو مزید حالات ظاہر ہوں گے وہ ناظرین کے معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے پیش کئے جائیں گے۔

اقتباس از اخبار پنچ

محققین زبان کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو گی کہ "دم پر نمدہ باندھنے" اور "دم دبا کر بھاگنے" کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک نئے گھوڑے "ایجاد" نامی نے بآسانی کھول دیا۔

ان دونوں محاوروں کا مفہوم ہمیشہ "بے تحاشا بھاگنا" لیا جاتا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دم پر سمدہ باندھنے یا دم دبانے سے رفتار میں تیزی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اس گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" کے زین کا سمدہ یعنی عرق گیر بجائے کمر پر رکھنے کے اس کے پٹھوں پر رکھا گیا اور واقعی اس طرح اس کی دم پر سمدہ بھی آگیا۔ اور دُم دب بھی گئی۔ اس گھوڑے کا ایسی بڑی دوڑ جیتنا اس کی تیز رفتاری کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم اس گھوڑے کے مالک کو ان کی کامیابی پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور لغات کے اہل فن کی جانب سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ ان کے گھوڑے کی بدولت بہ آسانی دو پیچیدہ محاوروں کی تشریح ہوگئی۔

مقالہ افتتاحیہ اخبار سائنس

رواج اور قدامت پسندی ہمیشہ سے مانع ترقی رہے ہیں۔ لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ جو گھوڑوں پر زین کسنے کے پرانے طریقے کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے اور پرانے کتبوں۔ تصویروں اور مجسّموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی پتہ چلتا ہے کہ زین یا چار جامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھ ہی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائینس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا جائے تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہوگا۔ گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے۔ کہ اس کے پچھلے پٹھے بوجھ سہارنے کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ اگلی ٹانگیں۔ اگر فطرت کا یہ تقاضا ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قائم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی تاکہ بوجھ ان چاروں حصّوں پر برابر تقسیم ہو جائے۔ لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو اور اگلے پاؤں رفتار کے لئے چھوڑ دو۔

خود چوپاؤں کے بھاگنے کے طریقہ پر اگر سائینس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے۔ تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ جانور کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکینگی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر دو آگے کی طرف اور دو پیچھے کی جانب مائل ہوں گی تو اُس کو تیز چلنے میں دشواری ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجئے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں تو ضرور آگے کو جُھک آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے اگلے پیر بجائے آگے جھکنے کے

پیچھے کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے ہمارے زیر غور تھا۔ لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے۔ اگر گذشتہ گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا کیونکہ ایسے قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عملی تجربہ دیکھنے کے بعد کھلینگی۔ اور آیندہ گھوڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلہ میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھینگے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پٹھوں پر زین کسے ہوئے ہونگے۔

غرض خدا خدا کر کے ایک ہی گھوڑ دوڑ میں میری مالت حالت درست ہوگئی۔ لیکن اب مصیبت یہ آپڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گمنامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں۔ اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا یہ کھاتا، پیتا، ہگتا، موتتا ہوا گھوڑا ہے۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا مگر میری جدت طبع نے اس کو بھی آسان کر دیا۔ ایک اسی کے قدوقامت، رنگ ڈھنگ، وضع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا۔ اصلی گھوڑے کو تھان پر باندھ دیا۔ اور نقلی کو ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ بڑے بڑے ماہران فن آتے اور گھوڑے کو دیکھ کر حیران ہوجاتے کہ اس میں تو کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھوڑ دوڑ اس کو جتوا سکے۔ نہ تو جوڑ ہی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سبک ہے۔ پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہوگئی تو کہاں سے پیدا ہوگئی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا۔ مگر اس مسئلہ لاینحل کو نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھوڑ دوڑ کا دن آگیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میں اوس اصلی گھوڑے کو لیکر عین وقت پر میدان میں پہنچے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب داں تقسیم وزن کا لحاظ کر کے ناپ ناپ کر انکے پٹھوں پر زین بند صوار ہے ہیں۔ غرض یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ اور گھنٹہ بجتے ہی سب گھوڑے دوڑ کے لئے ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ ادھر جھنڈی گری اور ادھر سواروں نے گھوڑوں کے چابک رسید کئے۔ چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہوگئی۔ مارے دولتیوں اور پشتکوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ہلادیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض ہمت والے تھے وہ یہ جھٹکے جھیلتے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں

تماشائیوں کے سروں اور کندھوں پر گھڑیوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک "ایجاد" تھا کہ وہ ہوالاول ہوالاخر سب ہی کچھ رہا۔ چونکہ اس دوڑ میں لوگوں نے ذرا سمجھ بوجھ کر روپیہ لگایا تھا۔ اس لئے بہری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہوئی۔ پھر بھی ستر اسی ہزار میں نے بنا ہی لئے۔

اس واقعہ کے متعلق اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا اقتباس ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"اخبار گھوڑ دوڑ"

ہم کو سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ علاقہ سنجد کے کسی نامعلوم مقام پر دو ہوائی جہازوں پر گولیاں برسائی گئیں جسکی وجہ سے وہ نیچے اترنے پر مجبور ہوئے۔ دونوں جہازوں پر جتنے لوگ سوار تھے۔ ان سب کو نہایت بیدردی سے ذبح کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی مقام کے آس پاس کہیں سلطان روم کے خاصہ کے گھوڑوں کا جنگل ہے۔ ورنہ بلا وجہ جہازوں پر گولیاں چلانے اور ان کی سواریوں کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ امید ہے کہ گورنمنٹ اس اہم معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر صدیوں کے راز کا انکشاف کریگی۔

پنچ میں ایک نہایت مختصر سا مضمون تھا۔ لکھا تھا کہ اس مرتبہ گھوڑوں کی دموں پر نمدہ باندھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے دوڑ کے وقت بہت سے سواروں کے چوتڑوں پر نمدہ بندھ گیا اور اکثر سواروں میں اتنی تیزی آگئی کہ وہ اپنے زور میں اچھل اچھل کر گھوڑوں کی گردنوں سے آگے نکل گئے۔

اخبار سائنس کا مضمون بہت عالمانہ تھا۔ اس نے روح پر بحث کر کے لکھا تھا کہ "ماہران فن علم حیوانات اس وقت تک قائل نہ تھے کہ انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی قسم کی روح ہوتی ہے۔ اور اسی لئے حیوانوں میں بھی رواج اور قدامت پسندی اسیطرح جاری اور ساری ہے۔ جس طرح انسانوں میں ہے۔ اس مسئلہ کا تصفیہ گذشتہ گھوڑ دوڑ نے نہایت اطمینان بخش طریقہ پر کر دیا اور اب کسی کو اس کے خلاف زبان ہلانے کی گنجایش نہیں رہی۔ رواج قدیم کے خلاف مگر اصول سائنس کے موافق اس گھوڑ دوڑ میں زین بجائے پیٹھ پر رکھنے کے گھوڑوں کے پیٹوں پر کسا گیا تھا۔ گو اس طریق عمل سے ان جانوروں کو زیادہ آسایش و سہولت تھی۔ لیکن رواج قدیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہوں نے بطور احتجاج دولتیاں چلانا

اور شیکلیں مارنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان گھوڑوں کی بیوقوفی کے باعث پھر "ایجاد" نامی گھوڑا جو اصول سائنس کو سمجھتا اور اپنی آسایش کا احساس رکھتا تھا، بازی لیگیا۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب یہ جانور بھی اپنی ضد سے باز آئینگے اور اپنی قدامت پسندی کو اسی طرح ترک کر دینگے جس طرح گذشتہ گھوڑدوڑ کے بعد سے انسانوں نے ترک کر دیا ہے۔

اب ڈربی کا نازک زمانہ قریب آگیا اور "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت چڑھنا شروع ہوئی۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ روپے پر ایک آنہ بھی کوئی دینے پر تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے پیچھے ایک دوسرا خفقان لگ گیا۔ جو لوگ گھوڑدوڑ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک گھوڑے کے نکل جانے سے شرطوں میں زمین آسمان کا فرق پڑھ جاتا ہے۔ اس لئے بعض بے ایمان لوگ ایسے نکل آتے ہیں جو گھوڑوں کو زہر دیدینے یا اصطبل کو بم سے اڑا دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ باوجود میری حفاظتی تدابیر کے ایک روز رات کے بارہ بجے میرا اصطبل مع اصلی گھوڑے کے بم سے اڑا دیا گیا۔ اور بیچارے ناکردہ گناہ کے چیچھڑے اور کھال کے ٹکڑے کئی کئی میل کے فاصلہ پر پائے گئے۔ لیکن شکر ہے کہ میرا "ایجاد" اس حملہ سے محفوظ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح کو اس واقعہ کا حال اخباروں میں بڑے بڑے موٹے موٹے حروفوں میں چھپ گیا اور چھپنے کے ساتھ ہی۔ ایجاد کے ٹکٹوں کی قیمت گر گئی۔ میرے لئے یہ "خدا شرے بر انگیزد کہ خیرے ما در آں باشد" کا مصداق ہوگیا۔ اور میں نے دل کھولکر ٹکٹ خرید نا شروع کئے۔ ہزاروں تار تعزیت کے آئے۔ مگر میں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ میں مرے ہوئے گھوڑے کے ٹکٹ کیوں خرید رہا ہوں۔ لوگوں میں بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں اور آخر انہوں نے پتہ چلالیا کہ "ایجاد" میرے سونے کے کمرے میں صحیح سلامت موجود ہے۔

ڈربی سے ایک دن پہلے میں اور مسٹر کل اپنے کمرہ میں کھڑے گھوڑے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ سامنے کی کھڑکی میں سے پستول چلا اور گولی "ایجاد" کے پہلو میں لگ کر آر سے پار ہوگئی۔ میں کھڑکی سے کود کر اس شخص کے پیچھے بھاگا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ پولیس میں اطلاع دینا گویا اپنا راز کھول کر خود کو تباہ کر لینا تھا۔ اس لئے خاموشی اختیار کی۔ واپس آکر میں نے اور مسٹر کل نے "ایجاد" کے پرزوں کو اچھی طرح

دیکھا بھالا۔ لیکن کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اور ہم نے "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا ورد کر کے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں "ایجاد" کے مالک کی حیثیت سے تو تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا لیکن دل چاہتا تھا کہ "ایجاد" پر سوار ہو کر اور خود ڈربی جیت کر اپنی شہرت کے چار چاند لگاؤں۔ اسلئے میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہو۔ اس مرتبہ تو میں ہی اسپر سوار ہونگا۔ مسٹر کل نے منع بھی کیا لیکن میں نے ایک نہ مانی۔ اور صبح ہی سے تیاری شروع کر دی۔

ڈربی کے میدان میں پہنچا تو دل ہیبت سے کانپ گیا جہانتک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ خود بادشاہ سلامت بھی معہ خاندان شاہی کے رونق افروز تھے۔ تمام گھوڑے یکے بعد دیگرے انکے سامنے سے گذارے گئے۔ جب "ایجاد" میدان میں آیا تو تالیوں کی گونج سے آسمان لرز گیا میں نے بھی خراماں خراماں گھوڑے کو میدان کا چکر دیا۔ اور سب گھوڑوں میں ملا کر کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بجا جھنڈی گری۔ اور سب گھوڑے آندھی کی طرح رواں ہوئے مگر "ایجاد" نے بے تحاشا بدکنا شروع کیا۔ ایک تو غصہ دوسرے شرمندگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پورے زور سے تیز رفتاری کا بٹن دبا دیا۔ جس وقت بٹن دبایا تو اس کے منہ کی بجائے اسکی پیٹھ میدان کی طرف تھی۔ میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا "ایجاد" نے پوری رفتار کے ساتھ الٹے پاؤں بھاگنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کی گولی نے لگام والی رفتار کے پرزہ کو تو کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ مگر تیز رفتاری کے پرزوں کے عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو روکنا چاہا۔ تو پسینے چھوٹ گئے۔ کیونکہ میرے زور سے دبانے کی وجہ سے بٹن دب کر ٹوٹ گیا تھا۔ اب کیا تھا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں دوسرے گھوڑوں کو جا لیا۔ اور آن واحد میں اُن سے آگے نکل گیا۔ گو یہ گھوڑے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر میرے اُلٹی رفتار کے باعث پیچھے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور گو میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ لیکن دراصل اُن سے آگے بڑھتا جاتا تھا۔ لوگوں کے قہقہوں اور تالیوں نے صور اسرافیل کی صورت پیدا کر لی۔ اور بعض سواروں کو ہنسی کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو روکنا پڑا۔ واقعہ کے بیان کرنے میں عرصہ لگا ہے۔ لیکن خود یہ واقعہ شروع ہوا اور آناً فاناً میں ختم ہو گیا۔ اور ڈربی کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ جیتنے میں

کسی گھوڑے کا حساب سر کی لمبان سے لگانے کی بجائے دم کی لمبان لگانا پڑا ہو۔

اب مشکل یہ آپڑی کہ گھوڑا نہ اب رُکتا ہے نہ جب میدان کو عبور کرکے باڑ کو توڑتا ہوا تماشائیوں میں گھس گیا۔ جدھر نکل گیا۔ کائی سی پھٹ گئی۔ بھیڑ چھٹ گئی اور میدان صاف ہوگیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں رفتار ایسی تیز تھی کہ کودنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں نے دُور سے دیکھا کہ ایک خالی موٹر کھڑی ہے۔ جب گھوڑا اُس کے پاس سے نکلا۔ میں اللہ کا نام لے دھم سے موٹر میں کود پڑا۔ اب رہے میاں "ایجاد" تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ البتہ دوسرے روز کے اخبار میں ہوائی خبر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا اُلٹا تیرتا ہوا افریقہ کے جنوبی کنارے پر دیکھا گیا۔ اخبار گھوڑ دوڑ کا خیال ہے کہ فطرت اس کو اپنے مسکن کی طرف لیجا رہی ہے۔ لیکن پنچ کی رائے ہے کہ جب تک اُس کی دم پر نمرہ بندھا رہیگا اس کی رفتار کم نہ ہوگی۔ اب آپ ہی بتائیے۔ کہ دونوں میں کون سچا ہے۔ میرے چوٹ تو آئی مگر سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ لنگڑے ہو گئے تو کیا ہرج۔ ڈربی تو جیت لی۔ بڑھیا مری تو مری آگرہ تو دیکھ لیا۔

کلیہ کی خبریں

از ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری ۔ زور

غالباً اس امر کا اظہار ضرور مسرت بخش ہوگا کہ ہمارا کلیہ ہر سال زیادہ مہتم بالشان ہوتا جارہا ہے، چنانچہ اس کی زندگی کا سال رواں بھی کئی امور کے لحاظ سے گذشتہ سالوں سے ممتاز ہے۔ اس بارے میں ہیں سب سے پہلے جس امر کا ذکر کرنا ہے، وہ کلیہ کے حلقۂ اساتذہ کی وسعت ہے۔ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ کلیہ کے شعبہ

حلقہ اساتذہ میں اضافہ

السنۂ مشرقیہ میں اساتذہ کی جو کمی تھی اب وہ کما حقہٗ پوری ہوگئی ہے۔ فارسی کی پروفیسری پر جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب مولوی فاضل۔ پی، اچ، ڈی اور عربی کے لئے جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی، لٹ۔ پی، اچ، ڈی کا تقرر اس شعبہ کے طلبہ کیلئے خوش قسمتی کا باعث ہے!! نیز اسی اثناء میں ہمارے ہی کلیہ کے ایک قدیم طالب علم جناب قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب ام، اے۔ ال، ال، بی کا انتخاب مددگار پروفسر فارسی کی جائداد پر عمل میں آیا ہے۔

جناب قاری صاحب سے پہلے بھی ہمارے کلیہ کے دو قدیم طالب علم جناب عبدالمجید صاحب صدیقی

برادران کلیہ حلقہ اساتذہ میں

ام، اے۔ ال، ال، بی اور جناب ضیاء الدین صاحب انصاری ام، اے کا تقرر شعبہ تاریخ اور شعبہ ریاضی کی مددگار پروفیسری پر ہوچکا ہے ہم اپنے ان تینوں برادران کلیہ کو مبارکباد دیتے ہیں!

چونکہ اس اثناء میں جناب ضیاء الدین صاحب انصاری مزید تعلیم حاصل کرنے کی خاطر متذکرہ بالا عہدہ سے مستعفی ہوکر راہی یورپ ہوئے، اس لئے ان کی جگہ پر

جناب خواجہ محی الدین صاحب ایم۔اے۔ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ اسی طرح جب بابر میرزا صاحب بی، اس، سی۔ مددگار پروفیسر حیاتیات بھی مزید تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے تو ان کا کام جناب عبدالباری صاحب بی، اس، سی۔ بی، ٹی۔ کے تفویض ہوا۔ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ مسٹر ای۔ ای اسپیٹ پروفیسر انگریزی کی مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور ہوئی ہے، اور جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی جو چند سال قبل مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ تشریف لے گئے تھے اب فائز المرام واپس ہوکر فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ یہ امر بھی موجب مسرت ہے کہ اسی دوران میں جناب حسین علی مرزا صاحب بارسٹرایٹ لا قانون کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ اور وکلائے عدالت العالیہ میں سے رائے بشیشر ناتھ صاحب بی، اے۔ ال، ال، بی، مسٹر رامچندر نائک ایم، اے۔ بارسٹرایٹ لا اور جناب خلیل الزماں صاحب بارسٹرایٹ لا کا کلیہ کی قانونی جماعتوں میں زائد درس دینے کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔

اب تک کلیہ میں جہاں شیعہ فنون کے "سنی" طلبہ کے لئے دینیات لازمی کی تعلیم کا انتظام تھا، شیعہ اور ہندو طالبعلم اس سے محروم تھے لیکن اب جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب منشی فاضل۔ مولوی عالم۔ اجازۃ التدریس، لیسانس جو اسی سال مصر سے فارغ التحصیل ہوکر اور وہاں کے علمی حلقہ میں اپنی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے باعث خاص طور پر شہرت حاصل کرکے بلدہ واپس ہوئے ہیں، ہندو اور شیعہ اخلاقیات کی تعلیم کے لئے کلیہ میں مددگار پروفیسر مقرر کئے گئے ہیں۔

ہم تمام جدید اساتذہ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

برادران کلیہ بلاد یورپ میں

اسی سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ اس وقت تک ہمارے کلیہ کے کئی طالب علم یورپ کی متفرق یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی خاطر روانہ ہوچکے ہیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ کام کر رہے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

	نام	مضمون	ڈگری	یونیورسٹی	کیفیت
۱	سید حسین صاحب ایم، اس، سی۔	کیمیا	پی، ایچ، ڈی	لندن	وظیفہ یاب سرکاری
۲	صلاح الدین صاحب ایم، اے۔	فلسفہ	"	اکسفورڈ	"

	نام	مضمون	ڈگری	یونیورسٹی	کیفیت
۳	میر ولی الدین صاحب منشی فاضل، ام اے۔	فلسفہ	پی، اچ، ڈی	لندن	وظیفہ یاب سرکاری
۴	میر سیادت علیخانصاحب مولوی فاضل۔ ام اے۔ ال، ال، بی۔	اصول قانون	″ ″ ″	اکسفورڈ	″ ″
۵	مقبول علی صاحب بی، اے۔	لسانیات	اف، آر، سی، اس	لندن	″ ″
۶	اکبر علیخانصاحب بی، اے۔	قانون	ال، ال، بی۔	″	ذاتی اخراجات سے روانہ ہوئے تھے۔ ال، ال، بی آنرز کی ڈگری حاصل کرنے اور بارسٹرایٹ لا ہونے کے بعد پیوستہ ماہ میں حیدرآباد واپس ہوئے ہیں۔ ہم انکا خیر مقدم کرتے ہیں۔
۷	محمود عالم صاحب بی، اے۔	انجنیرنگ	بی، اس، سی	مینچسٹر	وظیفہ یاب سرکاری
۸	نعمت اللہ صاحب	″	″	″	بی، اس، سی آنرس کی سند حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد واپس ہوئے ہیں، ہم انکا خیر مقدم کرتے ہیں۔
۹	جعفر حسن صاحب	معاشیات	پی، اچ، ڈی	جرمنی	ہمارے کلیہ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ ذاتی اخراجات سے روانہ ہوئیں
۱۰	صاحبزادہ سردار علیخاں صاحب	معاشیات	بی، کام	کمبرج	انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد سرکاری وظیفہ پر گئے ہیں۔

	نام	مضمون	ڈگری	یونیورسٹی	کیفیت
۱۱	عبدالوحید صاحب مولوی عالم منشی فاضل ام، اے۔ ال، ال، بی	قانون	ال، ال ڈی	لندن	ذاتی اخراجات سے روانہ ہوئے ہیں
۱۲	ضیاءالدین صاحب انصاری اِم، اے۔	انجنیرنگ	بی، اس، سی	مینچسٹر	مددگار پروفیسر کی جائداد سے مستعفی ہوکر وظیفہ سرکاری سے روانہ ہوئے ہیں۔
۱۳	رضی الدین صاحب بی، اے۔	ریاضی	(ٹرائپس)	کیمبرج	انعامی وظیفہ یاب

ان کے علاوہ شعبہ دینیات کے ایک طیلسانی قاری قطب الدین صاحب بی، اے۔ کو مصر میں اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے وظیفہ دیکر روانہ کیا گیا ہے اور محمد ابراھیم صاحب بی، اے کو ام، اس، سی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انجنیری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک ایشیائی وظیفہ دیا گیا ہے۔

ہمیں قوی امید ہے کہ یہ تمام برادران کلیہ اپنے اعلیٰ ارادوں میں مستقل رہکر اور اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر وطن واپس ہوں گے اور اپنے ملک کی خدمت بوجوہ احسن انجام دینگے۔ ہم ان کی ہر قسم کی ترقی کے لئے دست بدعا ہیں۔

حیدرآباد سول سروس

کئی سال تک بند رہنے کے بعد اس سال سے پھر حیدرآباد سول سروس کے لئے انتخابات شروع ہوئے ہیں، چنانچہ اس سال ہمارے کلیہ کے ایک طیلسانی حمید الدین محمود صاحب بی، اے۔ بھی منتخب کئے گئے ہیں۔ ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں۔

انجمن اتحاد کلیہ کے کارہائے نمایاں

اس سال کلیہ کی زندگی کو شاندار بنانے میں انجمن اتحاد نے بھی کافی حصہ لیا۔ اس کا پہلا جلسہ ایک مشاعرہ تھا جو نہ صرف کلیہ بلکہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا جلسہ تھا۔ اس میں عام مشاعروں کی طرح غزلگوئی کے لئے مصرعہ طرح دینے کے علاوہ ایک خاص موضوع "نغمہ" پر نظمیں لکھائی گئی تھیں۔ یہ نظمیں غیر معمولی طور پر کامیاب رہیں۔ چنانچہ جب انجمن اتحاد نے

ان کا مجموعہ شائع کیا تو ادبی حلقوں میں اس کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا۔ رسالجات "اردو"۔ "ہمایوں"۔ "الناظر" اور دیگر رسائل و اخبارات میں اس کی تعریفیں کی گئیں۔

انجمن اتحاد کا دوسرا جلسہ معاشرتی تھا۔ (Social Gathering) جو مسرت منزل میں منعقد ہوا تھا۔ اور درحقیقت کلیہ کی معاشرتی زندگی میں پہلا قدم تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا گیا تھا نظم خوانی کے علاوہ موسیقی سے بھی حاضرین بے حد محظوظ ہوئے۔ اس جلسہ میں سید اکبر وفا قانی صاحب بی' اے (عثمانیہ) کو بہترین سوانگ (Acting) کے صلہ میں ایک تمغہ دیا گیا۔

علاوہ منعقد معمولی جلسوں کے انجمن اتحاد نے خاص نوعیت کے چند غیر معمولی جلسے بھی کئے جن میں سے بعض کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ام' اے۔ پی' اچ' ڈی پروفیسر فلسفہ کی تقریر "شاعری کا اثر زندگی پر" کے نہایت دلچسپ موضوع پر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسکو ایک مستقل اور نئے عنوان سے قلمبند کر کے ہمارے رسالے کے لئے عنایت کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھینگے۔

۲۔ جناب حسین علی مرزا صاحب بارسٹراٹ لا پروفیسر قانون نے انگریزی میں ایک نہایت عالمانہ تقریر (Teh Rational Good in Legislation) پر فرمائی جس سے ہماری معلومات میں مفید اضافہ ہوا۔

۳۔ ڈاکٹر محمد مظفر الدین صاحب قریشی ام' اے۔ پی' اچ' ڈی پروفیسر کیمیا نے بھی انگریزی میں (Science and what the world owes to it) پر تقریر فرمائی جو باوجود ایک مخصوص علمی موضوع پر ہونے کے عام فہم اور جدت آمیز تھی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج میں ادبی اور معاشرتی اتحاد

اس سال کے خوشگوار واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج میں ادبی و معاشرتی اتحاد قائم ہوا" نظام کالج یونین" کے انگریزی انٹر کالج ڈبیٹ میں ہمارے یہاں سے تین طلبہ بھیجے گئے تھے مضمون (The League of Nations has justified itself) تھا۔ مقابلہ میں ہمارے

کلیہ کے ایک طالب علم محمد عبدالجلیل صاحب حال متعلم اِل، اِل، بی (ابتدائی) کی تقریر بہتر سمجھی گئی اور انھیں تمغہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ "نظام کالج یونین" نے "اردو برجستہ مضمون نگاری" کیلئے بھی ہمیں مدعو کیا۔ "تہذیبِ حاضر کی خصوصیات" پر مضمون لکھا گیا انہیں بھی ہمارے ہاں کے ایک طالبعلم محمد حمید اللہ صاحب حال متعلم بی، اے (سال دوم) اول آئے۔ اور انھیں تمغہ ملا۔

انجمن اتحاد اور دیگر مقامی انجمنیں انجمن اتحاد کو اس سال حیدرآباد کی اور انجمنوں نے بھی مقابلہ کی دعوت دی۔ "انجمن اتحاد المسلمین" کے مقابلے کے جلسوں میں ہمارے ہی کلیہ کے دو طالب علم اول رہے۔ سید محمد صاحب متعلم اِم، اے (سال اول) کو تقریر میں طلائی تمغہ ملا اور ابوالکلام بدرالدین صاحب بدر متعلم بی، اے (سال اول) کو "خلیفہ شاعری تمغہ" ملا۔ "مجلس جشن میلاد النبیؐ" سکندرآباد کی مضمون نگاری کے مقابلہ میں بھی ہمارے ہاں کے طالب علم محمد حمید اللہ صاحب متعلم بی، اے (سال دوم) اول آئے۔ ہم اپنے ان تمام کامگار بھائیوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

انجمن اتحاد اور "مجلہ عثمانیہ" کی اجرائی یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس سال انجمن اتحاد کا سب سے بڑا کارنامہ "مجلہ عثمانیہ" کی اجرائی ہے اس کے موجودہ عہدہ دار قابل مبارکباد ہیں کہ ان کے زمانہ میں انجمن کو یہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس باب میں جناب صدر صاحب کلیہ کی خاص عنایتوں کا شکریہ کسیطرح بھی ادا نہیں کیا جا سکتا انہوں نے اجرائی رسالہ کے متعلق انجمن کے جملہ مطالبات پر کافی غور و خوض فرمانے کے بعد نہ صرف ان کو کامیاب بنایا بلکہ رسالہ کے جملہ امور میں ہماری خاطر خواہ مدد فرمائی۔ انجمن اتحاد کے نائب صدر سید معین الدین صاحب قریشی نے اپنے خطبہ صدارت میں اپنے پیشروؤں کی طرح رسالہ کی اجرائی کا صرف وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کو پورا کرنے کے لئے بھی کافی جد و جہد کی، ہم ان کی مساعی جمیلہ کے معترف ہیں۔ اس بارے میں انجمن اپنے خزانہ دار ڈاکٹر نظام الدین صاحب کی بھی رہین منت ہے جنہوں نے رسالہ کی اجرائی کی تحریک میں خاص طور پر انجمن کا ہاتھ بٹایا۔

کلیہ کی دوسری انجمنیں اسی سلسلہ میں کلیہ کی بعض دوسری انجمنوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے:۔

۱۔ بزم معاشیات:۔ کلیہ کی سب سے قدیم انجمن ہے۔ اس کا ابتدائی دور بہت شاندار تھا۔ اب

خاموشی سے اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ اس کے نائب صدر ابو منصور حمید صاحب متعلم بی اے (سال سوم) اور معتمد عبدالرحمن رئیس صاحب متعلم (سال دوم) ہیں۔

۲۔ بزم تاریخ:۔۔۔۔۔۔ اس میں زیادہ تر تحقیقی مضامین پڑھے جاتے تھے۔ توقع ہے کہ اس کے مضامین عنقریب ایک رسالہ کی صورت میں شایع ہو جائیں گے۔ اس کے صدر سید ضیاءالعابدین صاحب متعلم ام اے و ال ال بی (آخری) اور معتمد نذیرالدین صاحب متعلم بی اے ہیں۔

۳۔ بزم سائنس:۔۔۔۔۔۔ اس میں سائنٹیفک مضامین پڑھے جانے کے علاوہ سائنس اور ریاضی کے اہم مسائل پر مباحثے ہوتے ہیں۔ اسکے نائب صدر رضی الدین صاحب اور معتمد انتصارالدین صاحب متعلم بی اے (سال دوم)

۴۔ بزم قانون:۔۔۔۔۔۔ یہ انجمن بہت گرمجوشی سے کام کر رہی ہے، علاوہ قانونی مباحث کے مصنوعی عدالتیں بھی اس کے زیر اہتمام قائم کیجاتی ہیں۔ نائب صدر۔ عبدالرؤف صاحب متعلم ام اے۔ ال ال بی (آخری) معتمد مدن موہن لعل صاحب متعلم ال ال بی (ابتدائی)

۵۔ ہم اس سلسلہ میں مرحوم ۔۔۔۔ بزم ادب ۔۔۔۔ کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ بزم تقریباً چار سال سے معطل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ السنہ مشرقیہ اور خصوصاً اردو کے اساتذہ اور طلبہ اس کی طرف خاص توجہ فرمائینگے۔

۶۔ الجمعیتہ العربیہ:۔۔۔۔۔۔ ان طلبہ کی بزم ہے جن کا اختیاری مضمون عربی ادب ہے۔ اسی سال قائم ہوئی ہے۔ اس کے صدر ڈاکٹر عبدالحق صاحب پروفیسر عربی ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا جملہ کاروبار عربی میں ہوتا ہے۔ شرکاء کو عربی زبان کی تقریر و تحریر کی طرف متوجہ کرنا اور اس کی عادت ڈالنا اس کا مقصد ہے۔ اس میں صرف عربی زبان میں تقریریں کرائی جاتی ہیں۔ اس کے نائب صدر خواجہ محمد احمد صاحب متعلم بی اے (سال دوم) اور معتمد حمید اللہ صاحب متعلم بی اے (سال دوم)۔

۷۔ "یونیورسٹی ٹریننگ کور":۔۔۔۔۔۔ اس کے متعلق بھی کارروائی جاری ہے۔

کھیل اس سال رقمی گنجایش میں کمی ہونے کے باعث طلبہ کو کھیلوں کی شرکت میں دقت واقع ہو رہی تھی لیکن عالیجناب صدر صاحب کلیہ، کھیلوں کے نگرانکار اساتذہ اور نائب صدر صاحب انجمن اتحاد کی ہمدردی اور مدد کی وجہ سے یہ مشکل بہت کچھ رفع ہوئی۔

۱۔ فٹ بال ٹیم :۔ ہمارے کلیہ کی فٹ بال ٹیم نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ اورنگ آباد، علی گڈھ، اور آل انڈیا مجید ٹورنمنٹس میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ یہاں کے سر رشتہ تعلیمات کے ٹورنمنٹ میں ہر سال کامیاب ہوتی رہی ہے۔ اس سال اورنگ آباد ٹورنمنٹ میں باوجود سخت مقابلوں کے نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہم اس کے تمام کھلاڑیوں خصوصاً اس کے کپٹن صاحبزادہ میر محبوب علیخاں صاحب متعلم انٹرمیڈیٹ (سال دوم) کی مساعی جمیلہ کی داد دیتے ہیں۔

اس اثناء میں "بی ٹیم" بھی خاصی ترقی کرتی رہی۔ لیکن گذشتہ سال پونہ نہ جاسکنے کے باعث اس میں کچھ پستی سی پیدا ہوگئی ہے اس وقت اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ فٹ بال ٹیم کے نگرانکار جناب الیاس برنی صاحب ام، اے۔ ال، ال، بی پروفیسر معاشیات ہیں

۲۔ ہاکی ٹیم :۔ گذشتہ دوایک سالوں سے خوب کام کررہی ہے۔ اس سال بھی اورنگ آباد ٹورنمنٹ میں جہاں نہایت مشاق ٹیموں سے مقابلہ کرنا پڑا خاصی کامیابی حاصل کی۔ اس کے کپٹن بشیر الدین احمد صاحب متعلم بی، اے (سال دوم) کی دلچسپی قابل قدر ہے۔ اس کے نگرانکار جناب ابن حسن صاحب ام اے پروفیسر تاریخ ہیں۔

۳۔ کرکٹ ٹیم :۔ اس ٹیم نے اس سال خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ چنانچہ جملہ مقامی ٹیموں کے مقابلہ میں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کے کپٹن علی محمد خاں صاحب متعلم ام، اے۔ ال، ال، بی (سال ابتدائی) ہیں جن کی گرمجوشی اور مستعدی کے باعث اس سال یہ ٹیم خاص طور پر بہتم بالشان ہوگئی ہے۔ چنانچہ اورنگ آباد میں بھی اس نے لائق تحسین کامیابی حاصل کی۔ اس کے نگرانکار ای، ای اسپیٹ پروفیسر انگریزی ہیں۔

۴۔ "ٹینس کلب" بھی خاصی ترقی کررہا ہے۔ اسکے سکرٹری اکرام اللہ صاحب متعلم۔ بی، اے (سال دوم) ہیں اور نگرانکار پروفیسر صدیق حسن صاحب ام، اے ہیں۔ اس سال کھلاڑیوں میں محبوب علی صاحب نے (جنکو فٹبال ہاکی اور کرکٹ تینوں سے خاص شغف ہے) بولنگ (Bowling) میں بشیر الدین احمد صاحب جمیل احمد صاحب و عبید اللہ صاحب کاظمی نے بیٹنگ (Batting) میں نمایاں طور پر ترقی کر کے تمغہ امتیاز حاصل کیا ہے۔ علی محمد خاں صاحب نے جو جنرل سکرٹری کی حیثیت سے ٹیموں کے ساتھ اورنگ آباد گئے تھے ہمارے کھلاڑیوں کو اپنے حسن انتظام سے

آرام پہونچانے میں کافی کامیابی حاصل کی۔ ہم ان تمام کو مبارکباد دیتے ہیں۔

کھیلوں کا ذکر کرتے ہوئے عالیجناب صدر صاحب کلیہ کی ان تمام عنایتوں کا اظہار کرنا ضروری ہے جو انہوں نے حیدرآباد کے مقامی ٹورنمنٹوں میں جب ہماری فٹ بال اور ہاکی ٹیمیں کامیاب رہیں تو انعامات تقسیم کئے اور کھلاڑیوں کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی ہم نگران کار صاحبان کو بھی ان کی ٹیموں کی کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ آئندہ وہ اپنی اپنی ٹیموں سے اور بھی زیادہ اظہار دلچسپی فرمائیں گے۔

متفرق مجالس علمی میں اساتذہ کلیہ کی جامعہ عثمانیہ کی جانب سے نمایندگی

اس سال "الہ آباد اورینٹل کانفرنس" کی شرکت کے لئے ہماری جامعہ کی جانب سے بھی اساتذہ روانہ کئے گئے تھے۔ جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب نے شعبہ فارسی کی، جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے شعبہ عربی کی اور جناب سبارأو صاحب نے السنہ تلنگی و کنڑی وغیرہ کی نمایندگی کی۔

اسی طرح "سائنس کانگریس لاہور" میں جناب وحید الرحمن صاحب پروفیسر طبیعیات اور جناب ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی پروفیسر کیمیا نے اور "فلاسفکل کانفرنس بنارس" میں جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر فلسفہ نے نمایندگی کی۔

وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی کی آمد

تعطیلات دسہرہ کے موقع پر مسٹر لانگلے وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی حیدرآباد تشریف لائے اور جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کو دیکھکر ان کی خاطر خواہ داد دی۔

بڑودہ یونیورسٹی کمیشن کی آمد

حال ہی میں تعطیلات موسم سرما کے زمانہ میں بڑودہ یونیورسٹی کمیشن کے اراکین مسٹر وجیری اور ڈاکٹر نائک جامعہ عثمانیہ کے عملی کاروبار اور علی الخصوص زبان مادری میں تعلیم دینے کے طریقے اور ان کے نتائج وغیرہ سے بہرہ ور ہونے کے لئے حیدرآباد آئے تھے جامعہ کے بعض عہدہ داروں اور اساتذہ سے دیر تک ملاقات کرنے کے بعد جامعہ کی سرگرمیوں اور اس کی وسیع کارگزاریوں کا اثر اپنے ساتھ لیتے گئے۔

نواب حیدر نواز جنگ بہادر کی خدمت میں مبارکباد

نہایت خوشی کا مقام ہے کہ عالیجناب نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس کو گذشتہ سال پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ سنانے کی دعوت دی گئی تھی

اور اب وہ " انٹر یونیورسٹی بورڈ " کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ہم اس اعزاز پر نواب صاحب ممدوح کو مبارکباد دیتے ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد اس سال کا بھی جلسہ تقسیم اسناد نہایت شاندار تھا۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ صدر اعظم اور امیر جامعہ عثمانیہ نے کامیاب طلبہ کو سندیں عنایت کیں۔ اور عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور اور میر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ نے اپنا پر مغز اور عالمانہ خطبہ سنایا۔ اگرچہ یہ خطبہ متعدد اخبار و رسائل میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کے بعض حصے ہمارے لئے خاص طور پر کارآمد ہیں اسلئے ہم ذیل میں اس کا اقتباس درج کرتے ہیں امید ہے کہ برادران کلیہ ان کا بغور مطالعہ کر کے کماحقہٗ مستفید ہوں گے۔

ہم نواب سر امین جنگ بہادر کے 'سی' آئی' ای۔ ال' ال' بی۔ اِف' آر' اے' اس کی خدمت میں جن کو اس سال ہماری جامعہ کی طرف سے ان کے علمی ذوق اور وسیع معلومات کے اعتراف میں ال' ال ڈی۔ کی اعزازی ڈگری دی گئی ہے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہمارے اُن کامیاب برادران کلیہ کو بھی جنھوں نے اس سال بی' اے۔ ام' اے اور ال' ال' بی کی سندیں حاصل کی ہیں مبارکباد دیتے ہیں۔

اقتباس خطبہ نواب صدر یار جنگ بہادر " میرے عزیز طلبا ئین۔ چند لفظ خصوصاً آپ کو بھی مخاطب کر کے پیش کرتے ہیں۔ نصیحت نہیں ہے۔ ناصح بننا مشکلات کا دروازہ کھولنا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ کی خیر خواہی اس موقع پر چند باتیں کہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ آپ کی سعادتمندی سے امید ہے کہ دل لگا کر سنیںگے۔ آپ تحصیل سے فارغ ہو کر جامعہ کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور مادر علمی کی آغوش شفقت سے عنقریب جدا ہو کر میدان عمل میں اپنے بل پر کھڑے رہنے والے ہیں جس کا دوسرا نام زندگی کی کشمکش میں در آنا ہے۔ اس کشمکش میں آپ کا طرز عمل ثابت کر دیگا کہ آپ حصول التعلیم میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور اس جامعہ کی تربیت نے کتنا گہرا اثر آپ کے دل و دماغ پر کیا۔ آیندہ زندگی کا میدان آپ کی نگاہوں میں اُمید کا ایسا دلکش سبزہ زار ہے' جس کی کامیابی کی راحت لہرا رہی ہے اور فتح و فیروزی کی بشارت سامعہ نواز ہے۔ اس دل خوش کن خیال میں خلل انداز ہونا' سنگدلی ہو سکتا ہے مگر فرض خیر خواہی

مجبور کرتا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ اس سبزہ زار میں کانٹے بھی ہیں، نشیب و فراز بھی۔ اسی طرح ٹھوکریں کھانے اور پاؤں زخمی ہونے کا سامان بھی تیار ہے۔ آپ کو احتیاط سے چلنا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ مشکلات پر غالب آنے کی سعی کرنی ہوگی۔ کامیابی کے دو طریقے آپ کے سامنے ہوں گے۔ ایک مردانہ اور فاتحانہ ہے دوسرا بزدلانہ اور غلامانہ۔ ان دونوں طریقوں میں سے ایک کا انتخاب ثابت کردیگا کہ آپ جامعہ سے کیا لیکر نکلے۔ مردانہ طریقہ صداقت، ہمت اور عزت نفس میں پوشیدہ ہے۔ اس طریقے سے مشکلات پر غالب آکر آپ کا دل وہ مسرت محسوس کرے گا جو ایک فاتح کا دل محسوس کرتا ہے۔ اس مسرت سے آپ کا دل بڑھیگا اور ہمت کی صدا " شاباش بیش " آپ کے ضمیر کے کان سنتے رہینگے۔ یہ صدا آپکے کاروان سعی کی بانگ درا ہوگی۔ جو شریفانہ صفات آپ جامعہ سے لیکر نکلے تھے وہ اس طرح پرورش پاتے اور ترقی کرتے رہینگے اور ان کا سایہ دنیا و آخرت میں آپ کے لئے روحی راحت کا سامان بنے گا۔ اور یہ بھی سن لو کہ جب آپ کی ان کامیابیوں کی خبریں آپ کی مادر مشفقہ جامعہ سنیگی اُسکے گھر میں عید ہوگی اور گھی کے چراغوں کی روشنی۔ وہ نور آیندہ نسل طلبا کے لئے چراغ ہدایت بنے گا۔ مبارک زندگی اسکو کہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ حصول مُدعا کا بزدلانہ میں نے بتایا ہے، اس طریقے کے گندے عناصر خوشامد، دھوکہ اور پست ہمتی ہیں۔ ان کے ذریعے سے مقصد اعلیٰ تو حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ ادنیٰ فوائد البتہ حاصل ہوجاتے ہیں۔ اس طریقے سے حصول مقصد کے بعد ضمیر وہ ندامت محسوس کرتا رہتا ہے جو ایک چور چوری کے بعد کرتا ہے اس روش سے وہ شریفانہ خصال جو ثمرہ تعلیم و تربیت ہیں رفتہ رفتہ پژمردہ ہوکر فنا ہوجاتے ہیں اور یہ پڑھے لکھے آدمی پھر جاہلوں کے طبقے میں جا ملتے ہیں۔

یہانتک میری التماس کا تعلق آپ کے تربیتی پہلو سے تھا۔ دوسرا پہلو آپ کی زندگی کا علمی ہے۔ اس جامعہ میں رہکر جو شرف علمی آپ نے حاصل کیا ہے وہ، وہ شرف ہے جس کی بدولت انسان انسان بنا بلکہ فرشتوں کا مسجود۔ اس شرف کی حفاظت اُسی طرح آپ پر فرض ہے جس طرح یہاں کے حاصل کردہ اخلاقی خصائل کی۔ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جامعہ کا نصاب ختم کرکے آپ شہر علم میں داخل ہوئے ہیں۔ جامعہ سے جدا ہوکر علمی ترقی اور مطالعے کا اہتمام آپ کا رفیق زندگی رہے۔ ایک عالم سے پوچھا کہ مطالعہ کی

انتہا کیا ہے۔ کہا جب تک زندگی مہربان رہے۔ مادامت الحیواۃ تحسن بہ۔ امام ادب ثعلب چلتے چلتے سرراہ کتاب دیکھتے جاتے تھے، کسی سواری کے دھکے سے گرے اور اس صدمے سے جاں بحق ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۹۶ برس کی تھی۔ ان دو مثالوں سے آپ کو سرحد مطالعہ کی دوری کا تصور ہو سکے گا۔

کلیوں کی دیواروں پر پرانے طلبا کے ناموں کی فہرستیں جلی حروف میں لکھی ہوئی آویزاں رہتی ہیں۔ ان فہرستوں میں اُن طلبا کے نام ہوتے ہیں جو جامعہ کی چار دیواری میں کسی نہ کسی حیثیت سے نامور رہے۔ کلیہ سے باہر جا کر بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو گمنام ہو جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھکر مفقود الخبر عزیزوں کی گم شدگی کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے، ان کے نام پڑھنے سے دل میں ایک فخریہ خیال پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کلیہ کے در و دیوار بھی اس فخر میں شریک ہیں۔ بعض ایسے نام ہوتے ہیں جو مابعد کی زندگی میں بدنام ہوئے، ان کو دیکھکر دل میں خجالت پیدا ہوتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ درسگاہ کے در و دیوار بھی اظہار ندامت کر رہے ہیں۔

خدا کرے آپ صداقت، ہمت، خودداری کے سایہ میں کامیابی کا سہرا حاصل کریں۔ بسم اللہ، زندگی کے میدان میں قدم رکھئے، مادر علمی کا پیام ہے۔ ع دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست۔

اے وہ نونہالانِ جامعہ جن کو ابھی یہاں رہنا ہے، خوبیٔ قسمت نے آپ کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جو انسان بننے کا مقام ہے۔ آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہاں کے فیض سے پورا نفع اٹھائیں، علم کے جواہرات سے دل و دماغ منور و پرنور ہو، تربیت عمدہ اخلاق کو طبیعت ثانیہ بنادے۔ یہ ممکن نہیں جب تک کہ آپ خود اپنی تعلیم میں اپنے استادوں کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ استاد، علم کی صدا آپ کے پردۂ گوش تک پہنچا سکتا ہے، وہاں سے دل تک لیجانا اور دل میں محفوظ رکھنا یہ آپ کا کام ہے، اس طرح ایکا کام بھی آسان نہیں۔ سستی اور ایام گزاری طالب علمانہ زندگی کیلئے سم قاتل ہے۔ ہمت کی بلندی ہی سے منزل طے ہوتی ہے۔ حکیم فارابی کو طالبعلمی کے زمانے میں چراغ جلانے کی مقدرت نہ تھی البتہ شوق، چراغ ہدایت تھا۔ پاسبانوں کی قندیلوں سے مطالعہ کرتا۔ اسی ہمت کی بلندی نے اسکو معلم ثانی یا دوسرا ارسطو بنادیا۔ جب تم بحر علم کے کنارے پر کھڑے ہو تو گھونگوں اور صدف پاروں کے جمع کرنے پر قانع مت ہو، سمندر میں کود، غوطے لگاؤ، گہرے جاؤ، در شاہوار نکالو اور ان کی روشنی نہ صرف تم کو بلکہ تمھاری جامعہ کے در و دیوار کو بھی روشن و تابناک بنادیگی۔"

خطبۂ صدارت

جستجو

سید معین الدین قریشی نائب صدر انجمن اتحاد نے فروری ۱۳۳۵ف کو انجمن اتحاد کے سالانہ افتتاحیہ جلسہ میں پڑھا۔

جنابِ صدر، معززِ اساتذہ اور برادرانِ کلیہ۔

آپ حضرات کے اس لطف و کرم کا میں تہِ دل سے ممنون ہوں جس کی بناء پر مجھے اس سال آپ کی خدمت گزاری کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ جس حُسنِ عقیدت اور عنایت سے آپ نے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے خدمات اور فرائض کو بہ احسن وجوہ انجام دوں اور آپ کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کروں۔

ہر نیا سال اپنے ساتھ نئی اُمیدوں اور تمناؤں کا ایک طوفان لاتا ہے۔ اس کی آمد زندگی کی ایک نوید ہوتی ہے جو ہمارے جوش میں تازگی اور ہمارے عمل میں استقامت پیدا کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نت نئے توقعات اور رنگ برنگ کے ولولوں سے آپ کے دل معمور ہیں۔ اور اُن کی تکمیل کے ذمہ دار میں اور میرے ساتھی گردانے گئے ہیں۔ ہم آپ کو اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی توقعات کو پورا کرنے میں ممکنہ کوشش کریں گے لیکن یہ کام تنہا ہمارے بس کا نہیں۔ خود آپ حضرات کی دلچسپی اور اتحادِ عمل مستقل طور پر ہمارے شاملِ حال رہا تو یقین ہے کہ ہم اپنے "خوابِ تمنا" کی تعبیر دیکھ سکیں۔

حضرات! ایک سال ختم ہوچکا اور نئے سال کا آغاز ہے لیکن مرحوم سال نے جاتے ہوئے ہماری بعض عزیز ترین ہستیوں کو بھی اپنے دامن میں چھپالیا ۔ حضرت منجھلی شہزادی صاحبہ کی وفات نے ملک پر غم و اندوہ کی ایک گھٹا مسلط کردی ۔ اعلیحضرت بندگان عالی کے اس رنج والم میں ملک کا بچہ بچہ شریک ہے جس کا ثبوت اس عام سوگواری سے مل سکتا ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بپا ہے ۔

کالج کی زندگی میں مولوی محبوب علی صاحب پروفیسر قانون کا انتقال نہایت ہی جاں سوز اور المناک سانحہ ہے جس نے یہاں کی علمی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اُن کی زندگی کا چراغ اگرچہ ہمیشہ کے لئے گُل ہوگیا لیکن مرحوم کی غیر معمولی ذہانت، ان تھک محنت اور سچے خلوص کا نقش ہمارے دلوں پر ثبت رہیگا ۔ وہ مصروف خواب ہیں لیکن اُن کے کارنامے ہمیشہ کے لئے زندہ رہینگے ۔ ہمارے دل کے زخم ابھی ہرے ہی تھے کہ ملک کے ایک سچے خدمتگزار کے لئے پھر ہمیں صف ماتم بچھانی پڑی جو صحیح معنوں میں شہید قوم کہا جاسکتا ہے ۔ اس کی زندگی کا تعلق اگرچہ کالج سے براہ راست نہیں تھا لیکن انکی کوششیں بڑی حد تک فرزندان کلیہ کی فلاح و بہبود سے وابستہ تھیں ۔ مولوی محمد مرتضیٰ، معتمد ایجوکیشنل کانفرنس ملک کے سچے ہمدرد اور خاموش کام کرنے والوں میں تھے ۔ اُن کی پاکیزہ سیرت، اور جذبۂ وطن پرستی آیندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت کا کام دیگا ۔

حضرات! حیدرآباد کی تاریخ میں جامعۂ عثمانیہ کا قیام وہ عہد آفریں کارنامہ ہے جس نے ہندوستان کے نظام تعلیم میں ایک نئے نصب العین کو پیش کیا ہے ۔ حیدرآباد اب تک تعلیمی حیثیت سے ہندوستان کے اور حصوں سے بہت پیچھے نظر آتا تھا۔ اور ارباب نظر کے لئے یہ ایک اہم اور دشوار طلب مسئلہ تھا کہ آخر یہاں کی تعلیمی حالت اس قدر پست اور گری ہوی کیوں ہے ۔ سررشتہ تعلیمات پر ایک زمانہ سے کثیر روپیہ صرف کیا جارہاہے اور اس بے دریغ فیاضی کے لحاظ سے یہاں کی تعلیمی پیداوار خاطر خواہ امید افزا نہ تھی ۔ منجملہ اور اسباب کے ایک وجہ نمایاں طور پر مجھے یہ نظر آتی ہے کہ اہل دکن اس عالمگیر نئی تہذیب کے اثر سے محفوظ رہے جس کی زد میں تقریباً تمام اہل ہند آچکے ہیں ۔ براہ راست اس سرزمین کو اس جدوجہد اور کشمکش سے سابقہ نہیں پڑا جس نے ہندوستان کے معاشرتی قالب میں ایک نئی روح

پھونک دی۔ مجھے یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ آیا یہ نئی روح ہندوستان کی عظمت و بزرگی، قدیم شہرت اور نام آوری کی بھی صحیح معنوں میں ضامن ہو سکی یا نہیں۔ لیکن اس بات سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جب کسی پست اور افتادہ قوم کو ایک دوسری زندہ اور ترقی یافتہ قوم سے میل جول اور تعلقات قائم کرنے کا موقع ملتا ہے تو زندہ قوم کی معاشرت اور تہذیب کا اثر غالب آنے لگتا ہے اور اگر وہ قوم اتفاق سے فاتح قوم ہے تو اس کے اثرات اور بھی گہرے اور دیرپا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دو قوموں کے اختلاط اور میل جول سے زندگی اور بیداری کے وہ آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں جن سے خستہ حال افراد قوم ترقی کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ تصویر کا روشن پہلو ہے لیکن اگر آپ اس کے دوسرے رخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ قوم کے سارے نصب العین ایک پردیسی تہذیب کی فاتحانہ شان میں گم ہونے لگتے ہیں۔ وہ کچھ لیتے ہیں لیکن اپنی چیز ہمیشہ کے لئے دے بیٹھتے ہیں۔ ساری قومی روایات اور قدیم انسٹیٹیوشن ایک اجنبی چیز میں ضم ہو جاتے ہیں۔ نئی روشنی کی تیز کرنوں سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور ہم سراسیمگی اور مرعوبیت کی حالت میں آزو بازو ٹٹولنے لگتے ہیں۔ اور جو چیز بھی ہمیں مل جائے اسے قدرت کا عطیہ اور ربانی برکات کا نمونہ سمجھکر حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح اس اندھی تقلید کی طرف قوم کی توجہ مائل ہو جاتی ہے جو بجائے اس کے کہ ہماری زندگی میں صحت بخش عنصر شامل کرے ہماری تہذیب کو گھن لگا دیتی ہے۔ بچہ کے ذہن میں کسی غلط چیز کے بٹھانے سے یہ کہیں بہتر سمجھا گیا ہے کہ وہ نرا جاہل ہی رہے۔ غلط بات ذہن سے بہت دنوں میں نکلتی ہے لیکن صحیح چیز کی تعلیم خواہ کتنی ہی دیر میں شروع کیجائے ذہنوں میں بہت جلد گھر کر لیتی ہے۔ یہی حال معاشرت اور تہذیب کا ہے جو مضر اور برباد کن اجزا اس کے تار و پود میں پیوست ہو جاتے ہیں اُن کا دُور کرنا ایک کٹھن کام ہے۔ بظاہر ہندوستان بہت سے معاملات میں بہت دُور نکل گیا ہے لیکن اب وہ اپنے غلطی کو سمجھکر پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد خوش نصیب ہے کہ اس کے تمدن میں مضر عنصر شامل نہ ہو سکے۔ اس نے اگرچہ ترقی نہیں کی لیکن اس کے قدیم روایات محفوظ ہیں۔ اس کے کام کرنے کی قوتیں صحیح و سالم ہیں

یہ قوتیں ابتک ابھر نہ سکیں کہ اُن کو اُبھارنے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ آبشاریں موجود ہیں لیکن ابھی بجلیاں نہیں پیدا ہوئیں ۔ اس لحاظ سے میں یہ عرض کروں گا کہ یونیورسٹی کا قیام ہمارے لئے آیۂ رحمت ثابت ہوا ۔ وہ دماغ جن کی جولانی کا کوئی میدان نہ تھا اب ٹھکانے لگ گئے ۔ وہ دل جن میں حوصلے اور آرزوئیں بڑی تڑپتی تھیں اب اپنے مرکز پر آ گئے ۔ یونیورسٹی کا قیام یوں تو عام طور پر اردو دنیا کے لئے ایک بڑی رحمت ہے اور ہندوستان کے نظام تعلیم میں ایک نئی روح پھونکنے کا باعث ہوا لیکن خاص طور پر دکن کی ساکن اور خاموش فضا میں اس نے ایک زبردست حرکت پیدا کر دی ۔ اس کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ تعلیمی بیداری تو پیدا ہو گئی ہے لیکن ابھی علمی بیداری کے آثار پورے طور پر ظاہر نہیں ہوئے ۔ نئی نسلیں جوق در جوق صحیح اصول پر علم کے حاصل کرنے میں مصروف ہیں لیکن ابھی امتحان کی آب و ہوا میں پل رہی ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ امتحانات کی فضا دماغوں میں گہرائی اور دلوں میں وسعت نہیں پیدا کر سکتی ۔ ع

دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

لیکن وہ زمانہ بھی دور نہیں جب کہ ہماری جامعہ کی وجہ سے علمی بیداری بھی پیدا ہو چلے گی ۔

یہ امر کس قدر ہمت افزا ہے کہ اس چھ سال کی تعلیمی جدوجہد کی پیداوار اس قدر مفید اور اطمینان بخش ثابت ہوئی کہ وہ لوگ بھی جو جامعہ کو بچوں کا کھلونا سمجھ رہے تھے اس کی غیر معمولی کامیابی پر مبارکباد دے رہے ہیں ۔ اب تو ہندوستان کے اور تعلیمی مرکزوں میں بھی ذریعہ تعلیم کا مسئلہ خاص طور پر اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے ۔ اسی سلسلہ میں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ابھی ابھی ڈاکٹر سپرو نے لکھنؤ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں جو خطبہ پڑھا تھا اس میں ہماری جامعہ کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے ۔ سلسلۂ بیان میں ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کے حوالہ سے (جو اتفاق سے ہمارے ہاں کے ممتحن مقرر ہوئے تھے) یہ بیان کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لڑکوں کے جوابات نہایت حیرت انگیز ہیں ۔ اُن کے خیالات میں جو جدت اور تازگی، انداز بیان میں جو شگفتگی اور بانکپن پایا جاتا ہے اس کا نمونہ ہندوستان کی اور یونیورسٹیاں بمشکل پیش کر سکتی ہیں ۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں کے طلبہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں جہاں جہاں گئے خدا کے فضل و کرم سے اپنی قابلیت اور ذہانت کا سکہ بٹھا کر ہی آئے ۔ اس خودستائی سے مجھے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سدا کامیابیاں اس مبارک علمی دور کا پیش خیمہ ہیں جو افق دکن پر طلوع ہونے والا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو شاعری کا چراغ جس سرزمین میں روشن ہوا تھا اب وہاں علم و ادب کی بجلیاں کوندنے کو ہیں ۔ وہ بچہ جس کے منہ سے شعر و سخن کے پھول جھڑتے تھے اور جو یہاں سے اور ممالک کی سیر کو گیا ہوا تھا اب علم و فضل کی قبا اوڑھے ہوئے پھر اپنے مرکز کو لوٹتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کی برکتیں ہمیں اس لئے حاصل ہیں کہ ہمیں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی نعمت میسر ہے یہ ایک ایسی سہولت ہمارے لئے فراہم کر دی گئی ہے جس سے علم و ادب کے دروازے ہم پر کھل گئے اور ہم براہِ راست علم کے اُبلتے چشموں سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں ۔ لیکن یہ یاد رہے کہ سہولت سے ہم دو قسم کے کام لے سکتے ہیں ۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی سی محنت سے ہم معمولی نتائج پیدا کریں لیکن اس سے زیادہ بلند حوصلگی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم زیادہ محنت کریں اور غیر معمولی نتائج پیدا کریں ۔ قوموں کے پنپنے کے لچھن یہی ہیں کہ وہ زندگی کی کشمکش میں اپنے آپ کو ڈال دیں، مردانہ وار علم کی ہر مہم کو سر کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد رہیں ۔ مشکل پسندی، سربلندی اور عزت و توقیر کی ضامن ہے ۔ انگلستان کا جدت نگار، آسکر وائلڈ بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ وہی کام شایانِ عمل ہے جو مشکل اور کٹھن ہو ۔ تعلیم کی جو سہولتیں خدا نے ہمارے لئے فراہم کر دی ہیں اُن کا صحیح مصرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی ممکنہ کوشش اور سرگرمی سے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیں ۔ یونیورسٹی اپنی پوری شان میں اُسی وقت جلوہ گر ہوگی جب کہ وہ ایک طرف ہماری قومی روایات کو محفوظ کرنے کا ذمہ لے تو دوسری طرف ہمارے دماغوں کو سنوارنے میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھے ۔ اس کی بزم تربیت سے ایسے لوگ اٹھیں جو اپنے دماغوں میں خیالات کی ایک نئی دنیا رکھتے ہوں جو اپنی جنبشِ قلم اور لطافتِ خیال سے عالم کو ایک نئے رنگ میں رنگ سکیں ۔ ہمارے قدیم علما پوری قوم کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کے ملجا و ماوا ہوتے تھے ۔ عام لوگ دنیاوی کد و کاوش اور رزم و پیکار سے

اکتا جاتے تو اُن علما کے دامنِ علم وکمال میں پناہ لیتے اور اس طرح اپنی فرصت کے چند گھنٹے علم کی فضا میں گزارتے۔

علمی بیداری کی ضیا پاشی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ لوگوں کے دماغوں میں حرکت پیدا ہو، سوچ بچار کی قوت نمودار ہو اور دماغ کے پرانے بُت ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا حقیقی منشا یہی ہے کہ غور وفکر کے وسیع میدانوں کی سیر کرائی جائے اور تلاشِ حق اور حصولِ کمال میں مجاہدینِ علم وفن کو اس طرح مصروفِ کار کردے کہ جب وہ اس گہوارہ علم وفن سے باہر قدم نکالیں تو اپنے خیالات کی رَو اور کمال کی خوبی سے ملک کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ ہے علمی بیداری کی وہ جھلکیاں جو میرے خیال میں ابھی یہاں پیدا نہیں ہوئیں۔ اور یونیورسٹی کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ وہ بیداری جلد سے جلد پیدا کیجائے تاکہ یہاں کی فضا ہماری علمی معرکہ آرائیوں سے گونجنے لگے۔

لیکن حضرات، ایسے لوگ عموماً ہر ملک میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو علم وفضل کے علم بردار کہے جاسکتے ہیں۔ ہر تعلیم یافتہ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئیے کہ وہ دستارِ فضیلت زیبِ سر کئے ہوئے ہو۔ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور یقین مانئیے کہ اگر کہیں ایسے چند افراد بھی پیدا ہوجائیں تو وہ قوم کی نجات اور دماغی آزادی کے لئے کافی ہیں۔ ہر تعلیم یافتہ شخص سے صرف اس قدر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ پاکیزہ اور ستھرا مذاق رکھتا ہو ہر اچھی چیز کو دیکھکر اس کا دل تڑپ جائے اور علمی ادبی جواہر ریزوں کو ایک جوہری کی طرح پرکھ سکتا ہو۔ لیکن اب ہمارے لئے بحث طلب امر یہی ہے کہ اس مذاقِ صحیح رکھنے والے تعلیم یافتہ شخص کی جگہ دنیا میں کیا ہے۔ اس کو یہ تعلیم اپنی روزمرہ کی زندگی میں کیا فائدہ پہنچاسکتی ہے۔ وہ یونیورسٹی کی چار دیواری سے باہر نکلتا ہے اور ہر شعبہ میں اپنی قسمت آزمائی کرتا ہے۔ پریشان روزگاری اور بے چارگی کی حالت میں ہر چیز کو دیکھکر لپکتا ہے اور مایوس ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ گیند کی طرح ہر جگہ ٹھکرایا جاتا ہے اور اسے اپنی منزل کا پتہ نہیں ملتا۔ روزگار کی اس کشمکش میں اس کی قوتیں مضمحل ہوجاتی ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے علم کی پونجی سے کس قسم کے

کام لے۔ یہی ہے وہ مقام جہاں آکر ہمیں غور کرنا پڑتا ہے کہ آخر ان بے چارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا کیا حشر ہوگا۔ ہماری یونیورسٹی نے ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام سے صرف ایک عبرت حاصل کی ہے اور وہ مادری زبان میں تعلیم کا رائج کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تجربہ بجائے خود نہایت مشکل اور نازک تھا جو ایک بڑی حد تک کامیاب رہا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہم نے دنیا کی تعلیمی تلخ کامیوں سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا۔ دنیا کے تعلیمی نظریئے اب قریب قریب اس نظریہ میں ضم ہو رہے ہیں کہ ہمیں ایسی تعلیم دینی چاہئے جو ہر فرد کو کشمکش حیات میں مدد دے سکے۔ رہے علما و فضلا سو وہ ہر یونیورسٹی میں پیدا ہوتے رہینگے۔ عام تعلیم یافتہ افراد کو پریشان روزگاری سے بچانا سب سے پہلے ضروری ہے۔ یہ عبرت یورپین مبصرین تعلیم نے اس وقت حاصل کی جب کہ انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے بعض گریجوئٹوں کو آسٹریلیا کے گلی کوچوں میں پتھر پھوڑتے ہوئے دیکھا۔ انگریزی نوآبادیوں سے مسلسل یہ آواز بلند ہوتی رہی کہ خدارا یہاں تعلیم یافتہ اشخاص کو نہ بھیجو کہ وہ بجائے اس کے کہ ہمارا بوجھ ہلکا کریں خود زمین کا بوجھ بن جاتے ہیں۔ وہ تعلیم کو اس قدر کارآمد بنانا چاہتے ہیں کہ ادھر یونیورسٹیوں سے گریجویٹ نکلیں اور ادھر اپنے دست و بازو سے کمانے لگیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص سب سے پہلے غم روزگار سے بےفکر کر دیا جائے۔ جب وہ امن چین کی زندگی بسر کرنے لگے گا تو خود آسانی سے پھر علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہو سکتا ہے۔ کوئی شریف فن کو، خواہ وہ کتنا ہی حقیر سمجھا جاتا ہو اختیار کرنا اُن کے نزدیک معیوب نہیں۔ اُن کے نزدیک ہر صاحب کمال اپنے پیشہ کا حکیم یا فلسفی ہے اس لئے کہ کمال خواہ وہ کسی پیشہ میں حاصل کیا جائے قابلِ عزّت و توقیر ہے۔ یہ خیال قطعی غلط ہے کہ دنیاوی جھگڑوں اور کاروباری زندگی میں پھنس کر انسان اپنی دماغی ترقّی کو کھو دیتا ہے۔ دماغ ہر رنگ میں اپنے جلوے دکھا سکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ترقی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ زندہ اقوام کاروبار اور حیات کے شعبوں میں اپنی اعلیٰ علمی اور عملی قابلیت کا ثبوت جس طرح دے رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ میں اس خصوص میں زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا صرف یہ عرض کرونگا کہ دنیا کی اس ساری جد و جہد اور کشمکش سے ہمیں بھی فائدہ اٹھانا چاہئے اور بجائے اس کے کہ کھو کر کچھ سیکھیں

ابتدا ہی سے سیکھنا اور کمانا جان لیں۔ خود ہندوستان پر یہ بپتا پڑ چکی ہے اور آئے دن لوگ مصیبتوں میں گھرے جا رہے ہیں۔ افلاس بڑھتا جا رہا ہے اور ہم جاں کنی میں پھنسے جا رہے ہیں۔ بقول مولانا حالی کے ہمارے ہاں کمانے والا ایک ہوتا ہے اور کھانے والے بہت۔ کمانے والا کماتے کماتے مرجاتا ہے لیکن ہم کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔

یہ مسئلہ یونیورسٹی کے لئے نہایت اہم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ خود ارباب جامعہ اس کو حل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا فریضہ ہے کہ ابھی سے ہم بھی اس پر غور کرنے لگیں اور عملی حیثیت سے اس آنے والی مصیبت سے بچیں جو ہم پر خدانخواستہ نازل ہونے والی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدردان سرکار حق المقدور ہماری قدر افزائی کریگی اور اعلیحضرت بندگانِ عالی کی "کریمانہ زرپاشیوں" سے مستفید ہو کر ہم میں سے بہت سارے افراد علم و ادب اور ملک و مالک کی خدمت کریں گے لیکن یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ملک میں دولت و ثروت کے بے شمار چشمے موجود ہیں۔ ملک کے چپہ چپہ میں دولت کی کانیں موجود ہیں اگر ہم ہمت آزمائی کریں اور مردانہ وار میدانِ عمل میں اُتر آئیں تو قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ کریں گے اور ملک کو معاشی تباہی سے بچائیں گے

حضرات! یہ وہ باتیں ہیں جو ضرور بہی خواہانِ جامعہ کے پیشِ نظر ہوں گی اور یقیناً آہستہ آہستہ عمل کا جامہ پہنینگی لیکن فی الحال ہمارا اہم فرض یہی ہے کہ جو سہولتیں اور نعمتیں اس وقت ہمیں حاصل ہیں اُن سے کما حقہ فائدہ اٹھائیں اور کالج کی زندگی کے مختلف حصوں میں جی بھر کر حصہ لیں۔ درس کی جماعتوں میں ہم علمی اور دماغی دلچسپیوں میں مصروف ہوں تو دوسری طرف کھیل کود کے میدانوں میں طرارے بھریں اور دماغی کسلمندی کو قدرت کی دلفریب فضامیں دور کریں اور اقامت خانوں میں اپنی اخلاقی اور "سماجی" زندگی کی تربیت کریں لیکن 'حضرات' ہمارے ہاں مختلف مذاہب اور مختلف مقامات کے نوجوان موجود ہیں جو مل جلکر ایک علمی برادری بناتے ہیں۔ اس وسیع برادری کے علم و عمل اور جولانیوں کی اگر کوئی چیز تماشا گاہ ہو سکتی ہے تو وہ کلیہ کی انجمن اتحاد ہے جو تمام نوجوانوں کو ایک اسٹیج پر لاتی ہے اور سب کو اتحاد و اخوت کی زنجیر میں جکڑ دیتی ہے۔ یہی وہ مبارک فضا ہے جہاں تمام افراد

اپنی انفرادی زندگی کو ایک اجتماعی نظام میں ضم کر دیتے ہیں اور متحدہ طور پر اپنی دبی ہوئی قوتوں کو ابھار سکتے ہیں۔

حضرات! انجمن اتحاد کی عمر اس وقت تقریباً تین سال کی ہے۔ اس تھوڑی مدت میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اگرچہ تھوڑی ہیں لیکن حالات کے لحاظ سے اس نے جو کچھ کیا وہ قابل ستائش ہے مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہم کو انجمن سے خاص دلچسپی نہیں پیدا ہوئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ہر سال کے شروع میں کالج کی دنیا میں ایک آندھی اٹھتی ہے جو صرف انتخاب کے زمانہ تک باقی رہتی ہے۔ پھر ہر طرف ایک سناٹا اور ہر سمت ایک خاموشی چھا جاتی ہے یہ بے التفاتی انجمن میں مستقل طور پر کوئی زندگی نہیں پیدا کر سکتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سخت بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہیں دعائیں دیتی پڑی رہتی ہے۔

برادرانِ کلیہ! اب ہمیں چاہیے کہ حقیقی دلچسپی اور سچے جوش سے اس کے قالب میں جان ڈالیں ایک جا جمع ہو کر اخلاص و محبت کے ترانے گائیں، خیالات کا تبادلہ کریں اور جادو بیانی کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ شعر و سخن کی بزم سجائیں تو خوشنوائی سے کالج میں زندگی کی لہر دوڑائیں۔ آپس میں ملیں تو زندہ دلی کے کرشموں اور قہقہوں کی گونج سے یہاں کی فضا کو معمور کر دیں۔ غرض ہم اس کو اپنے علم و عمل اور لطف و محبت کا ایک ایسا اکھاڑہ بنائیں جہاں ہماری دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور سوئی ہوئی موجیں تڑپنے لگیں۔

حضرات! طلبہ کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ انجمن ہمارے ہاں کے قابل اور فاضل اساتذہ کی عنایت و مہربانی کی بھی سخت محتاج ہے۔ کالج کا مختصر سا وقت اس قدر کافی نہیں ہے کہ ہم ان کے پاکیزہ خیالات سے پورے طور پر مستفید ہو سکیں۔ درس کی پابندیوں میں ہم ان کے اعلیٰ معلومات سے ایک بڑی حد تک محروم رہتے ہیں۔ جن سے ہماری دماغی سطح بلند ہو سکے۔ مجھے خانگی طور پر جب کبھی اپنے شفیق اساتذہ سے ملنے کا موقع ملتا ہے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ صرف چند گھنٹوں کی ملاقات میں وہ میرے دماغ میں وسعت اور زندگی کے نصب العین میں ایک نمایاں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں یہ وہ نعمت ہے

جو درس کی جماعتوں میں بہ مشکل حاصل ہو سکتی ہے۔ فرداً فرداً اس طرح طلبہ کا پروفیسروں سے ملنا بہت دشوار ہے اس لئے اگر طلبہ کو اس حیثیت سے فائدہ پہنچانے کا کہیں موقع مل سکتا ہے تو وہ انجمن اتحاد کا اسٹیج ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ہمارے اساتذہ وقتاً فوقتاً انجمن میں تشریف لاکر اپنی خوش بیانی اور وسیع معلومات سے فائدہ پہنچاتے رہینگے۔ اسی سلسلہ میں میں اُن حضرات کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں جو اس سال حلقۂ اساتذہ میں شامل ہوئے ہیں۔ نیز اُن اساتذہ کا جو دیار مغرب سے علمی فتوحات حاصل کر کے تشریف لائے ہیں۔ موخر الذکر حضرات سے خاص طور پر توقع ہے کہ زندہ اقوام کی معاشرت اور تہذیب اور اُن کی ادبی سرگرمیوں کے مختلف مباحث پر انجمن میں تقریر فرمائینگے۔

اس طرح میرا خیال ہے کہ طلبہ اور محترم اساتذہ کی باہمی کوشش و دلچسپی سے ہماری انجمن کا مستقبل شاندار رہیگا۔

حضرات! انجمن اتحاد کے آئندہ پیش نامہ (پروگرام) کے متعلق کچھ بیان کرنا روایۃً چلا آیا ہے لیکن آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں اس کے متعلق کچھ نہ عرض کروں۔ آیندہ سال کا کوئی لمبا چوڑا پیش نامہ عرض کرنے کی بجائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ خاموش رہوں اور عملی طور پر انجمن کی خدمتگزاری میں مصروف ہو جاؤں۔

آپ کی اجازت سے انجمن اتحاد کی ایک قدیم سنّت کو ادا کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یعنی رسالہ کی اجرائی قیام انجمن سے ابتک یہ راگنی برابر الاپی جارہی ہے۔ اور ہر سال رسالہ کی آمد کا سخت انتظار رہتا ہے نہیں معلوم اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کس کی قسمت میں لکھی ہے فی الحال میں آپ کو صرف ان الفاظ میں اطمینان دلا سکتا ہوں کہ قیامت کا آنا برحق ہے۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ خود عالیجناب صدر صاحب رضا اسکے لئے کوشاں ہیں اُمید ہے کہ آپ کی توجہ سے رسالہ کی کارروائی تکمل ہو جائیگی۔ انشاء اللہ انجمن بھی اس سال اس بارے میں پوری کوشش و توجہ صرف کریگی۔ ایک اہم بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ رسالہ تو ادیر سویر نکل ہی جائیگا لیکن اس کا طلبہ کی ادارت میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ چار پانچ سال پہلے بھی یہ تحریک اٹھائی گئی تھی لیکن شاید قبل از وقت سمجھکر ملتوی کر دی گئی تھی۔ اب جبکہ کالج کے طلبہ میں

خود اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے مناسب ہوگا کہ یہ کام ابتدا ہی سے ان کے ہاتھ میں رہے۔ عمل انسان کا اصل استاد ہے ۔ اور تجربہ اس کا حقیقی رہبر۔ مجھے امید ہے کہ طلبہ کے اس عام رجحان پر کافی توجہ برتی جائیگی

حضرات میں معافی چاہتا ہوں کہ اپنے ناچیز خیالات کے اظہار میں آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا۔ آخر میں اعلیحضرت بندگان عالی کے عمر و اقبال کے ازدیاد کے لئے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہوں جن کی بیدار مغزی، رعایا پروری اور معارف نوازیوں کی دھوم دور دور تک مچی ہوی ہے ۔ آپ کے بذل و نوال اور مدبرانہ کار فرمائیوں نے ملک کے ہر شعبہ میں جان ڈالدی اور حیدرآباد کو ہر قسم کی مفید اور کارآمد جدوجہد کی جولانگاہ بنا دیا ۔ خدا کرے کہ حضور پر نور کے ظلِ عاطفت میں ہم کو وہ عزت و سربلندی حاصل ہو جو زندہ اقوام کی نشانیاں ہیں ۔ علم کا لپکا طبیعت میں پیدا ہو اور عمل کا سمندر ہمارے سینوں میں موجیں مارنے لگے ۔ ہم دریا کی ہر لہر میں کوشش کا طوفان دیکھیں اور ہوا کے ہر جھونکے میں ہمیں عمل کی آندھیاں نظر آئیں ۔

In the Examination Hall

'Tis very like a greenhouse, warm and close;
No breezes stir the leaves, no air at all;
Immortal plants are settled in their rows
Each with his fruit of wisdom ripe to fall.

If trees have life? so Sidney asked, and Bose
Has laid that doubt for ever. Here are trees
Yet green and full of living joy that grows
To noble aims, noble endurances.

Now while each spirit in the silence glows
With rapt endeavour, guardian footsteps fall
As through their hearts He quietly comes and goes
The Unseen Gardener, the Lover of all.

E. E. SPEIGHT.

"Did you mean to make a fool of me, did you, you idiot? You come here so meek—'Try for me, do try for me'—and then you refuse to take the place. You rascal, you have disgraced me!"

Gerasim found nothing to say in reply. He reddened, and lowered his eyes. Yegor turned his back scornfully and said nothing more.

Then Gerasim quietly picked up his cap and left the coachman's room. He crossed the yard rapidly, went out by the gate, and hurried off down the street. He felt happy and light-hearted.

THE LONELY CHILD

Do you think, my boy, that when I put my arms around you,
To still your fears,
That it is I that conquer the dark and lonely night?

My arms seem to wrap love about you,
As your little heart fluttering at my breast
Throbs love through me.

But, dear one, it is not your father:
Other arms are about you, drawing you near,
And drawing the Earth near, and the Night near,
And your father near.

Some day you shall lie alone at nights,
As now your father lies.
And in those arms, as a leaf fallen on a tranquil stream,
Drift into dreams and healing sleep.

JAMES OPPENHEIM

work for such a long time. I know he'll do his work well and serve you faithfully. On account of having to report for military duty, he lost his last position. If it hadn't been for that, his master would never have let him go."

IV

The next evening Gerasim came again and asked:

"Well, could you do anything for me?"

"Something, I believe. First let's have some tea. Then we'll go to see my master."

Even tea had no allurements for Gerasim. He was eager for a decision; but under the compulsion of politeness to his host, he gulped down two glasses of tea, and then they betook themselves to Sharov.

Sharov asked Gerasim where he had lived before and what work he could do. Then he told him he was prepared to engage him as man of all-work, and he should come back the next day ready to take the place.

Gerasim was fairly stunned by the great stroke of fortune. So overwhelming was his joy that his legs would scarcely carry him. He went to the coachman's room, and Yegor said to him:

"Well, my lad, see to it that you do your work right, so that I shan't have to be ashamed of you. You know what masters are like. If you go wrong once, they'll be at you forever after with their fault-finding, and never give you peace."

"Don't worry about that, Yegor Danilych."

"Well—well."

Gerasim took leave, crossing the yard to go out by the gate. Polikarpych's rooms gave on the yard, and a broad beam of light from the window fell across Gerasim's way. He was curious to get a glimpse of his future home, but the panes were all frosted over, and it was impossible to peep through. However, he could hear what the people inside were saying.

"What shall we do now?" was said in a woman's voice.

"I don't know, I don't know," a man, undoubtedly Polikarpych, replied. "Go begging, I suppose."

"That's all we can do. There's nothing else left," said the woman. "Oh, we poor people, what a miserable life we lead. We work and work from early morning till late at night, day after day, and when we get old, then it's, Away with you!"

"What can we do? Our master is not one of us. It wouldn't be worth the while to say much to him about it. He cares only for his own advantage."

"All the masters are so mean. They don't think of any one but themselves. It doesn't occur to them that we work for them honestly and faithfully for years, and use up our best strength in their service. They're afraid to keep us a year longer, even though we've got all the strength we need to do their work. If we weren't strong enough, we'd go of our own accord."

"The master's not so much to blame as his coachman. Yegor Danilych wants to get a good position for his friend."

"Yes, he's a serpent. He knows how to wag his tongue. You wait, you foul-mouthed beast, I'll get even with you. I'll go straight to the master and tell him how the fellow deceives him, how he steals the hay and fodder. I'll put it down in writing, and he can convince himself how the fellow lies about us all."

"Don't, old woman. Don't sin."

"Sin? Isn't what I said all true? I know to a dot what I'm saying, and I mean to tell it straight out to the master. He should see with his own eyes. Why not? What can we do now anyhow? Where shall we go? He's ruined us, ruined us."

The old woman burst out sobbing.

Gerasim heard all that, and it stabbed him like a dagger. He realised what misfortune he would be bringing the old people, and it made him sick at heart. He stood there a long while, saddened, lost in thought, then he turned and went back into the coachman's room.

"Ah, you forgot something?"

"No, Yegor Danilych." Gerasim stammered out, "I've come—listen—I want to thank you ever and ever so much—for the way you received me—and —and all the trouble you took for me—but—I can't take the place."

"What! What does that mean?"

"Nothing. I don't want the place. I will look for another one for myself."

Yegor flew into a rage.

" I know it," he said. " But it's hard to find men like you, Yegor Danilych. If you were a poor worker, your master would not have kept you twelve years."

Yegor smiled. He liked the praise.

" That's it," he said. " If you were to live and serve as I do, you wouldn't be out of work for months and months."

Gerasim made no reply.

Yegor was summoned to his master.

" Wait a moment," he said to Gerasim. " I'll be back at once."

" Very well."

III

Yegor came back and reported that inside of half an hour he would have to have the horses harnessed, ready to drive his master to town. He lighted his pipe and took several turns in the room. Then he came to a halt in front of Gerasim.

" Listen, my boy," he said. " If you want, I'll ask my master to take you as a servant here."

" Does he need a man ?"

" We have one, but he's not much good. He's getting old, and it's very hard for him to do the work. It's lucky for us that the neighbourhood isn't a lively one and the police don't make a fuss about things being kept just so, else the old man couldn't manage to keep the place clean enough for them."

" Oh, if you can, then please do say a word for me, Yegor Danilych. I'll pray for you all my life. I can't stand being without work any longer."

" All right, I'll speak for you. Come again to-morrow, and in the meantime take this ten-kopek piece. It may come in handy."

" Thanks, Yegor Danilych. Then you will try for me ? Please do me the favour."

" All right. I'll try for you."

Gerasim left, and Yegor harnessed up his horses. Then he put on his coachman's habit, and drove up to the front door. Mr. Sharov stepped out of the house, seated himself in the sleigh, and the horses galloped off. He attended to his business in town and returned home. Yegor, observing that his master was in a good humour, said to him :

" Yegor Fiodorych, I have a favour to ask of you."

" What is it ?"

" There's a young man from my village here, a good boy. He's without a job."

" Well ?"

" Wouldn't you take him ?"

" What do I want him for ?"

" Use him as man of all work round the place."

" How about Polikarpych ?"

" What good is he ? It's about time you dismissed him."

" That wouldn't be fair. He has been with me so many years. I can't let him go just so, without any cause."

" Supposing he has worked for you for years. He didn't work for nothing. He got paid for it. He's certainly saved up a few dollars for his old age."

" Saved up ! How could he ? From what ? He's not alone in the world. He has a wife to support, and she has to eat and drink also."

" His wife earns money, too, at day's work as charwoman."

" A lot she could have made ! Enough for kvas."

" Why should you care about Polikarpych and his wife ? To tell you the truth, he's a very poor servant. Why should you throw your money away on him ? He never shovels the snow away on time, or does anything right. And when it comes his turn to be night watchman, he slips away at least ten times a night. It's too cold for him. You'll see, some day, because of him, you will have trouble with the police. The quarterly inspector will descend on us, and it won't be so agreeable for you to be responsible for Polikarpych."

" Still, it's pretty rough. He's been with me fifteen years. And to treat him that way in his old age—it would be a sin."

" A sin ! Why, what harm would you be doing him ? He won't starve. He'll go to the almshouse. It will be better for him, too, to be quiet in his old age."

Sharov reflected.

" All right," he said finally. " Bring your friend here. I'll see what I can do."

" Do take him, sir. I'm sorry for him. He's a good boy, and he's been without

The Servant

By S. T. SEMYONOV

(Russian)

I

Gerasim returned to Moscow just at a time when it was hardest to find work, a short while before Christmas, when a man sticks even to a poor job in the expectation of a present. For three weeks the peasant lad had been going about in vain seeking a position.

He stayed with relatives and friends from his village, and although he had not yet suffered great want, it disheartened him that he, a strong young man, should go without work.

Gerasim had lived in Moscow from early boyhood. When still a mere child, he had gone to work in a brewery as bottle-washer, and later as a lower servant in a house. In the last two years he had been in a merchant's employ, and would still have held that position, had he not been summoned back to his village for military duty. However, he had not been drafted. It seemed dull to him in the village, he was not used to the country life, so he decided he would rather count the stones in Moscow than stay there.

Every minute it was getting to be more and more irksome for him to be tramping the streets in idleness. Not a stone did he leave unturned in his efforts to secure any sort of work. He plagued all of his acquaintances, he even held up people on the street and asked them if they knew of a situation—all in vain.

Finally Gerasim could no longer bear being a burden on his people. Some of them were annoyed by his coming to them; and others had suffered unpleasantness from their masters on his account. He was altogether at a loss what to do. Sometimes he would go a whole day without eating.

II

One day Gerasim betook himself to a friend from his village, who lived at the extreme outer edge of Moscow, near Sokolnik. The man was coachman to a merchant by the name of Sharov, in whose service he had been for many years. He had ingratiated himself with his master, so that Sharov trusted him absolutely and gave every sign of holding him in high favour. It was the man's glib tongue, chiefly, that had gained him his master's confidence. He told on all the servants, and Sharov valued him for it.

Gerasim approached and greeted him. The coachman gave his guest a proper reception, served him with tea and something to eat, and asked him how he was doing.

"Very badly, Yegor Danilych," said Gerasim. "I've been without a job for weeks."

"Didn't you ask your old employer to take you back?"

"I did."

"He wouldn't take you again?"

"The position was filled already."

"That's it. That's the way you young fellows are. You serve your employers so-so, and when you leave your jobs, you usually have muddied up the way back to them. You ought to serve your masters so that they will think a lot of you, and when you come again, they will not refuse you, but rather dismiss the man who has taken your place."

"How can a man do that? In these days there aren't any employers like that, and we aren't exactly angels, either."

"What's the use of wasting words? I just want to tell you about myself. If for some reason or other I should ever have to leave this place and go home, not only would Mr. Sharov, if I came back, take me on again without a word, but he would be glad to, too."

Gerasim sat there downcast. He saw his friend was boasting, and it occurred to him to gratify him.

" Monsieur ? Monsieur ?"

A new sensation began to dominate his anguish of mind : fear. Fear that he might never remember the name, never. He got up, went out, walked for hours at random, hanging round the office of the lawyer. For the second time, night fell. He clutched his head in his hands and groaned :

" I shall go mad."

A terrible idea had now taken possession of his mind ; he had 200,000 francs, acquired by dishonesty, of course, but his, and they were out of his reach. To get them he had undergone five years imprisonment and now he could not touch them. The notes were there waiting for him, and one word, a mere word he could not remember, stood, an insuperable barrier, between him and them. He beat with clenched fists on his head, feeling his reason trembling in the balance ; he stumbled against lamp-posts with the sway of a drunken man, tripped over curbstones. It was no longer an obsession or a torment. It had become a frenzy of his whole being, of his brain and of his flesh. He had now become convinced that he would never remember. His imagination conjured up a sardonic laugh that rang in his ears ; people in the streets seemed to point at him as he passed. His steps quickened into a run that carried him straight ahead, knocking up against the passers-by, oblivious of the traffic. He wished to strike back, to be run over, crushed out of existence.

" Monsieur ? Monsieur ?"

At his feet the Seine flowed by, a muddy green sprangled with the reflections of the bright stars. He sobbed out :

" Monsieur......Oh, that name ! That name ! "

He went down the steps that led to the river, and lying face downwards, worked himself towards it to cool his face and hands. He was panting ; the water drew him...... his hot eyes......his ears....his whole body. He felt himself slipping, and unable to cling to the steep bank, he fell. The shock of the cold water set every nerve a-tingle. He struggled....thrust out his arms....flung his head up....went under ....rose to the surface again, and with a sudden mighty effort, his eyes staring from his head, he yelled :

" I've got it !....Help ! Duverger ! Du......"

The quay was deserted. The water rippled against the pillars of the bridge : the echo of the sombre arch repeated the name in the silence......The river rose and fell lazily : lights danced on it, white and red. A wave a little stronger than the rest licked the bank near the mooring rings......All was still.

"Agreed! What is your name?"

He replied without hesitation:

"Duverger, Henri Duverger."

When he got back to the street, he breathed a sigh of relief. The first part of his programme was over. They could clap the handcuffs on him now: the substance of his theft was beyond reach.

He had worked things out with cold deliberation on these lines: on the expiration of his sentence he would claim the deposit. No one would be able to dispute his right to it. Four or five unpleasant years to be gone through, and he would be a rich man! It was preferable to spending his life trudging from door to door collecting debts. He would go to live in the country. To every one he would be "Monsieur Duverger." He would grow old in peace and contentment, known as an honest, charitable man—for he would spend some of the money on others.

He waited twenty-four hours longer to make sure the numbers of the notes were not known, and reassured on this point, he gave himself up, a cigarette between his lips.

Another man in his place would have invented some story. He preferred to tell the truth, to admit the theft. Why waste time? But at his trial, as when he was first charged, it was impossible to drag from him a word about what he had done with the 200,000 francs. He confined himself to saying:—

"I don't know? I fell asleep on a bench.. In my turn I was robbed."

Thanks to his irreproachable past he was condemned to only five years' penal servitude. He heard the sentence without moving a muscle. He was thirty-five. At forty, he would be free and rich. He considered the confinement a small, necessary sacrifice.

In the prison where he served his sentence he was a model for all the others, just as he had been a model employee. He watched the slow days pass without impatience or anxiety, concerned only about his health.

At last the day of his discharge came. They gave him back his little stock of personal effects, and he left with but one idea in his mind, that of getting to the lawyer. As he walked along, he imagined the coming scene.

He would arrive. He would be ushered into the impressive office. Would the lawyer recognize him? He would look in the glass: decidedly he had grown considerably older, and no doubt his face bore traces of his experience. No, certainly the lawyer would not recognize him. Ha! Ha! It would add to the humour of the situation.

"What can I do for you, Monsieur?"

"I have come for a deposit I made here five years ago."

"Which deposit? In what name?"

"In the name of Monsieur........"

Ravenot stopped, suddenly murmuring:

"How extraordinary. I can't remember the name I gave."

He racked his brains—a blank! He sat down on a bench, and feeling that he was growing unnerved, reasoned with himself.

"Come, come! Be calm! Monsieur.. ......It began with......which letter?"

For an hour he sat lost in thought, straining his memory, groping after something that might suggest a clue. A waste of time. The name danced in front of him, round about him: he saw the letters jump, the syllables vanish. Every second he felt that he had it; that it was before his eyes, his lips. No! At first this only worried him then it became a sharp irritation that cut into him with a pain that was almost physical. Hot waves ran up and down his back. His muscles contracted: he found it impossible to sit still. His hands began to twitch. He bit his dry lips. He was divided between an impulse to weep and one to fight. But the more he focussed his attention, the further the name seemed to recede. He struck the ground with his foot, rose, and said aloud: "What's the good of worrying? It only makes things worse. If I leave off thinking about it, it will come of itself."

But an obsession cannot be shaken off in this way. In vain he turned his attention to the faces of the passers-by, stopped at the shop-windows, listened to the street noises: while he listened, unhearing, and looked, unseeing, the great question persisted:

"Monsieur? Monsieur?"

Night came. The streets were deserted. Worn out, he went to an hotel, asked for a room, and flung himself fully-dressed on the bed. For hours he went on racking his brain. At dawn he fell asleep. It was broad daylight when he awoke. He stretched himself luxuriously, his mind at ease; but in a flash the obsession gripped him again:

The Debt-Collector

By MAURICE LEVEL

(*French*)

Ravenot, debt-collector to the same bank for ten years, was a model employee. Never had there been the least cause to find fault with him. Never had the slightest error been detected in his books.

Living alone, carefully avoiding new acquaintances, keeping out of cafes and without love-affairs, he seemed happy, quite content with his lot. If it were sometimes said in his hearing: "It must be a temptation to handle such large sums!" he would quietly reply: "Why? Money that doesn't belong to you is not money."

In the locality in which he lived he was looked upon as a paragon, his advice sought after and taken.

On the evening of one collecting-day he did not return to his home. The idea of dishonesty never even suggested itself to those who knew him. Possibly a crime had been committed. The police traced his movements during the day. He had presented his bills punctually, and had collected his last sum near the Montrouge Gate about seven o'clock, when he had over two hundred thousand francs in his possession. Further than that all trace of him was lost. They scoured the waste ground that lies near the fortifications; the hovels that are found here and there in the military zone were ransacked: all with no result. As a matter of form they telegraphed in every direction, to every frontier station. But the directors of the bank, as well as the police, had little doubt that he had been laid in wait for, robbed, and thrown into the river. Basing their deductions on certain clues, they were able to state almost positively that the coup had been planned for some time by professional thieves.

Only one man in Paris shrugged his shoulders when he read about it in the papers: that man was Ravenot.

Just at the time when the keenest sleuth-hounds of the police were losing his scent, he had reached the Seine by the Boulevards Exterieurs. He had dressed himself under the arch of a bridge in some every-day clothes he had left there the night before had put the two hundred thousand francs in his pocket, and, making a bundle of his uniform and satchel, he had weighted it with a large stone and dropped it into the river; then, unperturbed, he had returned to Paris. He slept at an hotel, and slept well. In a few hours he had become a consummate thief.

Profiting by his start, he might have taken a train across the frontier. He was too wise to suppose that a few hundred kilometres would put him beyond the reach of the gendarmes, and he had no illusions as to the fate that awaited him. He would most assuredly be arrested. Besides, his plan was a very different one.

When daylight came, he enclosed the two hundred thousand francs in an envelope, sealed it with five seals, and went to a lawyer.

"Monsieur," said he, "this is why I have come to you. In this envelope I have some securities, papers that I want to leave in safety. I am going for a long journey, and I don't know when I shall return. I should like to leave this packet with you. I suppose you have no objection to my doing so?

"None whatever. I'll give you a receipt."

He assented, then began to think. A receipt? Where could he put it? To whom entrust it? If he kept it on his person, he would certainly lose his deposit. He hesitated, not having foreseen this complication. Then he said easily:

"I am alone in the world, without relations and friends. The journey I intend making is not without danger. I should run the risk of losing the receipt, or it might be destroyed. Would it not be possible for you to take possession of the packet and place it in safety among your documents, and when I return, I should merely have to tell you, or your successor, my name?"

"But if I do that........."

"State on the receipt that it can only be claimed in this way. At any rate, if there is any risk, it is mine."

The old man's fancy was at work—he had become a little boy for the moment, his mother was a gentlewoman, and he had his hoop and his little stick; he was playing driving the hoop with the little stick. He wore a white costume, his little legs were plump, bare at the knee....

The days passed; the work went on, the fancy persisted.

IV

The old man was returning from work one evening when he saw the hoop of an old barrel lying in the street. It was a rough, dirty object. The old man trembled with happiness and tears appeared in his dull eyes. A sudden, almost irresistible desire took possession of him.

He glanced cautiously around him; then he bent down, picked up the hoop with trembling hands, and smiling shamefacedly, carried it home with him.

No one noticed him, no one questioned him. Whose concern was it? A ragged old man was carrying an old, battered, useless hoop—who cared?

He carried it stealthily, afraid of ridicule. Why he picked it up and why he carried it, he himself could not tell. Still, it was like the boy's hoop, and this was enough. There was no harm in it lying about.

He could look at it; he could touch it. It would stimulate his reveries; the whistle and turmoil of the factory would grow fainter, the escaping vapours less dense....

For several days the hoop lay under the bed in the old man's poor, cramped quarters. Sometimes he would take it from its place and look at it; the dirty, grey hoop soothed the old man, and the sight of it quickened his persistent thoughts about the happy little boy.

V

It was a clear, warm morning, and the birds were chirping away in the consumptive urban trees somewhat more cheerfully than usual. The old man rose early, took his hoop, and walked a little distance out of town.

He coughed as he made his way among the old trees and the thorny bushes in the woods. The trees, covered with their dry, blackish, bursting bark, seemed to him incomprehensibly and sternly silent. The odours were strange; the insects astonishing, the ferns of gigantic growth. There was neither dust nor din here, and the gentle, exquisite morning mist lay behind the trees. The old feet glided over the dry leaves and stumbled across the old gnarled roots.

The old man broke off a dry limb and hung his hoop upon it.

He came upon an opening, full of daylight and of calm. The dewdrops, countless and opalescent, gleamed upon the green blades of newly mown grass.

Suddenly the old man let the hoop slide off the stick. He struck with the stick, and sent the hoop rolling across the green lawn. The old man laughed, brightened at once, and pursued the hoop like that little boy. He kicked up his feet and drove the hoop with his stick, which he flourished high over his head, just as that little boy did.

It seemed to him that he was small, beloved, and happy. It seemed to him that he was being looked after by his mother, who was following close behind and smiling. Like a child on his first outing, he felt refreshed on the bright grass, and on the still mosses.

His goat-like, dust-grey beard, that harmonized with his sallow face, trembled, while his cough mingled with his laughter, and raucous sounds came from his toothless mouth.

VI

And the old man grew to love his morning hour in the woods with the hoop.

He sometimes thought he might be discovered, and ridiculed—and this aroused him to a keen sense of shame. This shame resembled fear; he would grow numb, and his knees would give way under him. He would look round him with fright and timidity.

But no—there was no one to be seen, or to be heard..........

And having diverted himself to his heart's content he would return to the city, smiling gently and joyously.

VII

No one had ever found him out. And nothing unusual ever happened. The old man played peacefully for several days, and one very dewy morning he caught cold. He went to bed, and soon died. Dying in the factory hospital, among strangers, indifferent people, he smiled serenely.

His memories soothed him. He, too, had been a child; he, too, had laughed and scampered across the green grass, among the dark trees—his beloved mother had followed him with her eyes.

The Hoop

By FEODOR SOLOGUB

(*Russian*)

I

A WOMAN was taking her morning stroll in a lonely suburban street; a boy of four was with her. She was young and smart and she was smiling brightly; she was casting affectionate glances at her son, whose red cheeks beamed with happiness. The boy was bowling a hoop; a large, new, bright yellow hoop. He ran after his hoop awkwardly, laughed uproariously with joy, thrust forward his plump little legs, bare at the knee, and flourished his stick. He needn't have raised his stick so high above his head—but what of that?

What happiness! He had never had a hoop before; how briskly it made him run!

And nothing of this had existed for him before; everything was new to him—the streets in early morning, the merry sun, and the distant din of the city. Everything was new to the boy—and joyous and pure.

II

A shabbily dressed old man, with coarse hands stood at the street crossing. He pressed close to the wall to let the woman and the boy pass. The old man looked at the boy with dull eyes and smiled stupidly. Confused, sluggish thoughts struggled within his almost bald head.

"A little gentleman!" said he to himself. "Quite a small fellow. And simply bursting with joy. Just look at him cutting his paces!"

He could not quite understand it. Somehow it seemed strange to him.

Here was a child—a thing to be pulled about by the hair! Play is mischief. Children, as every one knows, are mischief-makers.

And there was the mother—she uttered no reproach, she made no fuss, she did not scold. She was smart and bright. It was quite easy to see that they were used to warmth and comfort.

On the other hand, when he, the old man, was a boy he lived a dog's life! There was nothing particularly rosy in his life even now; though, to be sure, he was no longer thrashed and he had plenty to eat. He recalled his younger days—their hunger, their cold, their drubbings. He had never had fun with a hoop, or other playthings of well-to-do folks. Thus passed all his life—in poverty, in care, in misery. And he could recall nothing—not a single joy.

He smiled with his toothless mouth at the boy, and he envied him. He reflected:

"What a silly sport!"

But envy tormented him.

He went to work—to the factory where he had worked from childhood, where he had grown old. And all day he thought of the boy.

It was a fixed, deep-rooted thought. He simply could not get the boy out of his mind. He saw him running, laughing, stamping his feet, bowling the hoop. What plump little legs he had, bare at the knee!....

All day long, amid the din of the factory wheels, the boy with the hoop appeared to him. And at night he saw the boy in a dream.

III

Next morning his reveries again pursued the old man.

The machines were clattering, the labour was monotonous, automatic. The hands were busy at their accustomed tasks; the toothless mouth was smiling at a diverting fancy. The air was thick with dust, and under the high ceiling strap after strap, with hissing sound, glided quickly from wheel to wheel, endless in number. The far corners were invisible for the dense escaping vapours. Men emerged here and there like phantoms, and the human voice was not heard for the incessant din of the machines.

pale and tightened ; he was gazing into the far distance with wide-open eyes. It was as if a threatening hand, piercing the grief, loneliness and dread that weighed on him, was pointing at him, as if the wind were rousing him with the cry : ' Beware !' His thread of hope was strained to breaking-point, and the naked truth, which he had not quite faced till that minute, struck him through the heart like a sword.

Had I approached him at that instant, and told him I was an omniscient spirit and knew his village well, and that his father was not lying dead, he would have fallen at my feet and believed, and I should have done him an infinite kindness.

But I did not speak to him, and I did not take his hand. All I wished to do was merely to watch him with the interest and insatiable curiosity which the human heart ever arouses in me.

THE TREES

O dreamy, gloomy, friendly Trees,
I came along your narrow track
To bring my gifts unto your knees
And gifts did you give back ;
For when I brought this heart that burns,
These thoughts that bitterly repine,
And laid them here among the ferns
And the hum of boughs divine,
Ye, vastest breathers of the air,
Shook down with slow and mighty poise
Your coolness on the human care,
Your wonder on its toys,
Your greenness on the heart's despair,
Your darkness on its noise.

HERBERT TRENCH

A Student

By STEFAN ZEROMSKI

(Polish)

I HAD spent an hour at the railway station, waiting for the train to come in. I had stared indifferently at several ladies in turn who were yawning in the corners of the waiting-room. Then I had tried the effect of making eyes at a fair-haired young girl with a small white nose, rosy cheeks, and eyes like forget-me-nots; she had stuck out her tongue (red as a field-poppy) at me, and I was now at a loss to know what to do next to kill time.

Fortunately for me two young students entered the waiting-room. They looked dirty from head to foot, mud-bespattered, untidy, and exhausted with travelling. One of them, a fair boy with a charming profile, seemed absent-minded or depressed. He sat down in a corner, took off his cap, and hid his face in his hands. His companion bought his ticket for him, sat down beside him, and grasped his hand from time to time.

'Why should you despair? All may yet be well. Listen, Anton.'

'No, it's no good, he is dying I know it.. ....I know....perhaps he is dead already.'

'Don't believe it! Has your father ever had this kind of attack before?'

'He has; he has suffered from his heart for three years. He used to drink at times. Think of it, there are eight of us, some are young children, and my mother is delicate. In another six months his pension would have been due. Terribly hard luck!'

'You are meeting trouble half-way. Anton.'

The bell sounded, and the waiting-room became a scene of confusion. People seized their luggage and trampled on each other's toes; the porter who stood at the entrance-door was stormed with questions. There was bustle and noise everywhere. I entered the third-class carriage in which the fair-haired student was sitting. His friend had put him into it, settling him in the corner-seat beside the window, as if he were an invalid, and urging him to take comfort. It did not come easy to him, the words seemed to stick in his throat. The fair-haired boy's face twitched convulsively, and his eyelids closed over his moist eyes.

'Anton, my dear fellow,' the other said, 'well, you understand what I mean; God knows. You may be sure... confound it all!'

The second bell sounded, and then the third. The sympathizing friend stepped out of the carriage, and, as the train started, he waved an odd kind of farewell greeting, as if he were threatening him with his fists.

In the carriage were a number of poor people, Jews, women with enormously wide cloaks, who had elbowed their way to their seats, and sat chattering or smoking.

The student stood up and looked out of the window without seeing. Lines of sparks like living fire passed by the grimy window-pane and balls of vapour and smoke, resembling large tufts of wool, were dashed to pieces and hurried to the ground by the wind. The smoke curled round the small shrubs growing close to the ground, moistened by the rain in the valley. The dusk of the autumn day spread a dim light over the landscape, and produced an effect of indescribable melancholy. Poor boy! Poor boy!

The loneliness of boundless sorrow was expressed in his weary look as he gazed out of the window. I knew that the pivot on which all his emotions turned was the anxiety of uncertainty, and that beyond the bounds of conscious thought an unknown loom was weaving for him a shadowy thread of hope. He saw, he heard nothing, while his vacant eyes followed the balls of smoke. As the train travelled along, I knew that he was miserable, tired out, that he would have liked to cry quietly. The thread of hope wound itself round his heart. Who could tell? Perhaps his father was recovering, perhaps all would be well?

Suddenly (I knew it would come), the blood rushed from his face, his lips went

A Conversation

AFTER IVAN TURGENIEF

(*Russian*)

THE topmost peak of the Himalayas . .

A whole chain of rugged precipices . .

The very heart of Asia.

Over the mountains a pale green, clear, dumb sky. Bitter, cruel frost; hard, sparkling snow; rising out of the snow, the gleaming peaks of the ice-covered, wind-swept mountains.

Two massive forms, two giants of the sides of the horizon, Gaurisankar and Kanchanjanga.

And Gaurisankar speaks to its neighbour. "What canst thou tell that is new? What is there down below?"

A few thousand years go by: one minute. And Kanchanjanga roars back in reply.

"Thick clouds over the earth. . . . wait a little!" Thousands more years go by: one minute.

"Well, and now?" asks Gaurisankar.

"Now I see blue waters, black forests, grey heaps of piled-up stones. Among them are still fussing to and fro the insects that have never yet defiled thee or me."

"Men?"

"Yes, men."

Thousands of years go by: one minute.

"Well, and now?" asks Gaurisankar.

"There seem fewer insects to be seen," thunders Kanchanjanga. "It is clearer down below; the waters have shrunk, the forests are thinner."

Again thousands of years go by: one minute.

"What canst thou see now?" says Gaurisankar.

"Close about us it seems purer," answers Kanchanjanga, "but there in the distance there are still spots in the valleys, and something is moving."

"And now?" asks Gaurisankar, after more thousands of years.

"Now it is well," answers Kanchanjanga.

"It is clean everywhere, quite white wherever you look. Everywhere is our snow, unbroken snow and ice. Everything is frozen. It is well now, it is quiet."

"Good," says Gaurisankar. "But we have gossipped enough, brother. It's time to slumber."

"It is time, indeed."

The huge mountains sleep; the green, clear heaven sleeps over the region of eternal silence.

from least suggestions, we need the spirit of Rosa Luxemburg, the brave woman who said: "Never forget to look around you, and then you will always become good again." Of her we are told: "At Christmas she lies in prison on a mattress as hard as stone. After ten o'clock at night her light must be out, but she can never fall asleep before one. 'And then I dream of many things in the darkness, and I smile through the darkness at life.' Underneath, in heavy boots that grate harshly on the wet sand, the sentry goes up and down, but the prisoner believes that she hears in each harsh step "a beautiful little song of life."

And in order that our power, however meagre it may be, shall win some place and joy in our narrow limitations, we need to believe in the deep truth that the sublime does not lie in the subject but in the spirit with which we invest it, in the ardour and conviction of our own personal reaction to life.

A composition which can be written in an hour in class would fall into that most inclusive of literary forms called the essay. An essay may tell us something in continuous narrative or it may group together familiar things and reflect upon them. Thus on one side it comes close to the short story, as we find in certain essays of Sir Richard Steele, Charles Lamb, J. A. Froude and Max Beerbohm. But the short story in essay form is generally a simple outline of reminiscence or an apologue, naturally less dramatic in plot and dialogue than a real short story.

Now if there were not so many wise heads on young shoulders in the East we should expect that students writing with free choice of subject would narrate rather than criticise or formulate. And it is my experience that they do if they are given encouragement. But in our systems of teaching far too little opportunity is given for the bringing out of the individual side of the student's life-experience, that side which is most valuable because most vital.

In the Madras scheme of things the students' compositions are confined for subject to certain prescribed books, generally of English fiction, so we have the depressing result that hundreds of students, instead of using the essay hour as their one outlet from the classroom into the world of real life, are condemned week after week to the task of condensing the atmosphere of *Persuasion* or *The Newcomes* or *The Trumpet Major*.

A very different thing happens when students are asked to write what has really happened to them. Then we are likely to get something worth reading and remembering.

In Japan I had the honour of presenting to the Prince of Wales a collection of such writings by Japanese students, nothing but their own memories, often narratives and reflections of very humble life, but fascinating for their very humanity.

It is a sad mistake to allow young people to write on abstract matters, to encourage them to usurp the critical function of mature years; unless, of course, they are given the freedom to criticise in the original and piquant way of children and young people who see things through their own eyes and not through books.

It is our intention in later numbers of the magazine to print some of the best of the compositions written by students of the college, and we have every hope that original work of merit will be forthcoming. There is a tendency among students to ask for guidance in their treatment of a subject. The great master of the realistic short story is Anton Chekhov, whose method is generally to take and isolate a section of ordinary middle or lower class life, and without any artificial heightening or elaborate plot, to give us as truthful dialogue and description as possible. The result is astonishingly vivid, and while it is so true to the psychology of the European people generally, it has its own peculiar Russian character which is often rather Oriental than Western.

Chekhov's stories are generally longer than could be written in an hour in class. So I am giving as illustrations five by other writers, two Russian, one Polish and one French. The last, entitled *The Debt Collector* is a capital example of what the French call a *feuilleton*, a brief story used to fill a certain portion of a daily newspaper. The constant demand for these has given French writers a long training in writing them, and they are the great masters of this type of story.

E. E. S.

Notes on Writing English

IN our B.A. class it is our practice that, once a week, the students spend an hour or so in class writing in English. They are naturally restricted to two forms, the essay and the story, which permit of much variety.

Too often these compositions written in class have little relation to the life of the writer, to the fulness of his personality, to the richer moments of his experience.

Too rarely do they show trust in his own judgment or imaginative power.

There are various reasons for this. One is that to write an Essay or a story in the class-room on a subject given there and there is no easy matter —It means Concentration of mind of a peculiar kind, and that, too, in public. And we know that the difficulty of writing anything original even when we have the advantage of privacy. This public exercise in writing English, is of course a necessary preparation for the final University Examination.

But there is another reason which I believe weighs more heavily in the Orient than in Europe.

Here in the East we find a more lasting reliance on what has already been thought and expressed, a stronger reluctance to invent, to disturb the flow of convention. The result is, that from Cairo to Kyoto, accepted form and tradition, matter and manner, are supreme in all branches of literature ; and within these boundaries the victories of the creative spirit have been great and multifarious. But in the regions of the West, where man is still subject to the restless instinct of migration and adventure, life is constantly offering new matter for translation by the artist into an increasing variety of form.

Of the stories by Indian writers shown to me with a view to their insertion in the magazine, I have advised the rejection of some for this very reason,—that the writers were closing their eyes and ears and offering us faint and colourless reflections of what they had never felt or experienced.

There is a Chinese proverb which says that the darkest spot is at the foot of the lighthouse.

To us in England, India is brimful of colour and romance. But here in India I hear so many young men say that there is so little of interest in their lives to write about.

Now what really is the matter is not the fault of our life and surroundings, but our own meagreness of power. Nothing that exists or happens in this world is beyond transformation into vital interest or lasting beauty. Tennyson once said that it does not matter what we write about, but how we write about it. The worst forms of meanness and selfishness,— cruelty, murder and other causes of horror have been transformed into the great tragedies of the world, the Oedipus plays, Antigone, King Lear, and saddest of all, Othello.

The commonest, most obvious and apparently insignificant things in life have been made the matter of the most exquisite poetry. Both Goethe and Tolstoi when writing their own biography, laid the greatest stress on the simple happenings of childhood. Burns and Wordsworth and Thomas Hardy were all content to find among the poor and obscure all the witness they desired to the nobility of human life.

We are bound to agree with Lessing when he says : " To a great man both things are needful : to treat trifles as trifles, and great things as important,"—but an even more needful thing is to recognize the important in the apparently trivial. Joseph Conrad found " at every turn the magnificence which besets our insignificant footsteps in good and evil." And two leading French artists of modern times have given expression to this as their fundamental faith,—Rodin when he says : " The expression of the most abject creature may be sublime," —and J. F. Millet, who never moved out of the humble life which he stirred the world to sympathise with : " One must know how to make the trivial serve to express the sublime : in that is real strength."

To carry these principles into our daily work we need a strong faith,—trust in ourselves and in that power which has made us and placed us where we are. To build up, as Wordsworth says, greatest things

Miracles

BY WALT WHITMAN

Why, who makes much of a miracle?
As to me, I know of nothing else but miracles,
Whether I walk the streets of Manhattan,
Or dart my sight over the roofs of houses toward the sky,
Or wade with naked feet along the beach, just in the edge of the water,
Or stand under trees in the woods,
Or talk by day with any one I love,—or sleep in the bed at night with any one I love,
Or sit at table at dinner with my mother,
Or look at strangers opposite me riding in the car,
Or watch honey-bees busy around the hive, of a summer forenoon,
Or animals feeding in the fields,
Or birds—or the wonderfulness of insects in the air,
Or the wonderfulness of the sun-down—or of stars shining so quiet and bright,
Or the exquisite, delicate, thin curve of the new moon in spring;
Or whether I go among those I like best, and that like me best—mechanics, boatmen,
Or among the savants—or to the soiree—or to the opera, *farmers,*
Or stand a long while looking at the movements of machinery,
Or behold children at their sports,
Or the admirable sight of the perfect old man, or the perfect old woman,
Or the sick in hospitals, or the dead carried to burial,
Or my own eyes and figure in the glass;
These, with the rest, one and all, are to me miracles,
The whole referring—yet each distinct, and in its place.
To me, every hour of the light and dark is a miracle,
Every square yard of the surface of earth is spread with the same,
Every foot of the interior swarms with the same;
Every spear of grass—frames, limbs, organs, of men and women, and all that concerns
All these to me are unspeakably perfect miracles. *them,*
To me the sea is a continual miracle;
The fishes that swim—the rocks—the motion of the waves—the ships, with men in them,
What stranger miracles are there?

Walt Whitman (1819—1900) is a figure that towers at the beginning of modern poetry, not only in English but in most great languages of civilization. Although he has only last year been given the honour of inclusion in the English Men of Letters Series, he has for a generation been the acknowledged leader of a movement against convention in poetic manner and matter. His medium is rhythmic prose, of which the above passage is a good example.

One article of Whitman's creed is that: A leaf of grass is no less than the journey-work of the stars. And he named his chief work *Leaves of Grass*, a glorified note-book or diary in which the entries are made in all stages of expression short of finished metrical form. Of the poems in this book he has left us a simple and honest explanation:

"The word I myself put primarily for the description of them is the word suggestiveness. I round and finish little, if anything; and could not, consistently with my scheme. The reader will always have his or her part to do, just as much as I have had mine. I seek less to state or display any theme or thought, and more to bring you, reader, into the atmosphere of the theme or thought—there to pursue your own thought."

Nawab Sadr Yar Jung's Speech

BY DR. KHALIFA ABDUL HAKIM

[Dr. Khalifa Abdul Hakim has kindly sent for our magazine an account of Nawab Sadr Yar Jung Bahadur's (Moulvi Habibur Rahman Khan Sherwani) speech on the occasion when the professors of the Osmania University College were "at home" to the Nawab Sahib after his return from the Pilgrimage. (Ed.)]

The staff of the Osmania University was at home to Nawab Sadr Yar Jung Bahadur to honour him and give an expression to their joy in welcoming him back to Hyderabad after the performance of the Pilgrimage. The Principal welcomed him on behalf of the staff and requested him to give them a description of his journey and his impressions of the Pilgrimage.

The Sadr-us-Sadur then rose in response to the request and referring to his speech in the Nizam Club he said that it was not possible to reproduce here the impressions of his pilgrimage, and the sentiments he had expressed in that club. He rightly observed that in certain gatherings there is created sometimes an atmosphere that draws forth emotions and expressions from the abysmal depths of a speaker's personality. The atmosphere of a gathering has a certain psychological or spiritual element which being not thoroughly analysable cannot be reconstructed at will. He remarked that this gathering of the learned did not allow him to be warmed up to that pitch, a fact that he attributed humourously to the intellectual coldness of science. He, however, expressed the hope that on some future occasion the atmosphere of the University may become electrified enough to draw forth emotional expressions from him. These remarks having thrown a wet blanket over the gathering the pitch of expectation became very low. But his short speech showed that the deeper realities of life and its fundamental truths even in their casual expression emerging from a soul that has not accepted them second hand from the rusty stores of tradition but has lived them out and felt the palpitation of Being have an intrinsic warmth. He confined himself to two points, the one was negative and the other positive. He said whoever expected from him a description of any aspects of the material civilization of Hejaz would meet with disappointment because in that monotonous desert there was neither nature nor art. That land seemed to be a manifestation of God's undifferentiated Unity and Infinity. Its population-centres and life-spots were few and far between. Centuries of chequered human history had passed over these infinite sands without quickening them into either organic or cultural life. It was a miracle of miracles that the greatest cosmopolitan centre on this earth should have been located amidst such barren physical surroundings. Arabia owed its position and prestige to Islam, being the cradle of a living and dynamic world-religion. Islam was, and still is, the sum total of its life. Every year from the thirty-two points of the compass a surging stream of humanity flows towards it. That is the spring time of these sands where instead of flower and fruit human hearts grow. The gathering at Arafat is a soul-stirring spectacle of God's democracy. Peoples of all colours, creeds and cultures meet there on the common ground of Humility and Hope, merging all the differences of birth and wealth in a common homage to the Creator. In the mighty sea of religious experience all the petty vanities of life are drowned. Like every fundamental and ultimate experience it was something to be felt and not argued. The fact and the value of it both lie in the experience. Whoever has ever felt it knows it and to whom it was not vouchsafed no amount of description and argument could bring it home to him. Religious experience is an experience *sui generis* like the charm of music or the love of beauty. Whoever feels the vibration of the inner chords of his being in tune with the Infinite knows that the value of it lies in its very ineffability. To have had such an experience is to have felt being lifted out of Time into Eternity and out of the Bondage of the Flesh into the Freedom of the Spirit. The Sadr-us-Sadur said, whoever turned to Hejaz with any other object was taking a wrong direction. The life of Hejaz lay in that cosmopolitan, truly democratic and humanly spiritual collective religious experience which no other time and no other place on this planet presents.

raw materials, she has an ample potential supply of cheap labour and adequate sources of power; and...... she is capable of turning these natural advantages to use."

This quotation from the Fiscal Commission Report of 1922 shows that India is capable of developing her industries, but Protection is indispensable to accelerate this process of development.

We recommend Customs duties in India from another consideration. The Indian sentiment is against direct taxation, which exists in India in the shape of land-tax and income tax. There are peculiar difficulties in collecting these taxes. Moreover high income-taxes have an undermining influence on the industrial development of a country. Direct taxation has reached its limit in India, and if any further taxation is needed its must be in the shape of indirect taxation and high tariff will accomplish this purpose, and at the same time it will have a protective influence upon the home industries. Since 1916 the Indian tariff is becoming less and less and consistent with the free trade principle of imposing levying taxes on goods which cannot be produced in the country. And in the second place the tariff policy is governed less by revenue consideration. But it is least convenient and least beneficial in giving protection, and therefore it is inevitable that India should adopt a protective policy like Germany in 1879. The advantages that will be derived from protection will greatly outweigh the burden that will be imposed upon the agricultural class as well as the middle class, provided that, this protection is given with discrimination.

For this purpose, a Tariff Board was recommended by the Fiscal Commission in 1922. It was to be composed of thoroughly competent men commanding the confidence of the people, its chief duty being to enquire into the conditions of the industry which applies for prohibition, and to make recommendations.

Accordingly the Government of India has appointed a Tariff Board consisting of impartial members. Their number as recommended by the Fiscal Commission is three.

During the last three years of its existence the Tariff Board has considered the question of Iron and Steel industry, and recommended protection for it, accordingly the Government has given protection to this industry.

Besides this, sulphur which is so essential for the manufacture of many commodities has been exempted from import duties at the recommendations of the Tariff Board.

Thus we see that a new day has dawned for the industrial progress of India. The attitude of the Government which had been hostile to India's progress is giving way, and we fervently hope that India will again be famous for her industries, as of old. Protection should be and would be given to such industries as require it, and that it should be given with discrimination as regards its amount and its length of time, so that the burden it imposes be as less as possible upon the consumer.

[Our readers will hardly need to be reminded that the policy so well pleaded for in the above article forms one of the crucial problems of economics. The imposition of a Customs Tariff, in the opinion of many able thinkers, involves at least as many disadvantages as advantages. Ed.]

Now we come to the second part of the subject, the existing position of Protectionism in India. As has been mentioned above, England was a staunch supporter of Free Trade. It was for her own interests that she maintained this policy. She had not learnt the severe lesson the War taught her in a few days. And India, unfortunately, was quite at the mercy of England. Having no voice of her own she could not claim her right—her " long standing and insistent demand " for Protection fell upon deaf ears. The desire on the part of the Indian public was long felt. It demanded the revision and the establishment of a systematic Tariff Policy. But unfortunately until 1916 the Government did not take any notice of this just and reasonable desire. After the war England realized her mistake with regard to the Fiscal Policy of India, and in 1916 when the Hon. Sir Ibrahim Rahimtoola moved a resolution in this respect, in the Imperial Legislative Council, the Government announced the appointment of the Industrial Commission. This commission was not to examine the fiscal policy best suited to India's interest. The Industrial Commission after due deliberation reported the necessity of India's industrialization, and recommended the appointment of a commission to examine the tariff question.

Accordingly, the Fiscal Commission was appointed in 1921, " To examine with reference to all interests concerned the Tariff Policy of the Government of India, including the question of the desirability of adopting the principle of Imperial Preference, and to make recommendations."

This commission, with due deliberation, came to the conclusion that, " In the best interest of India the adoption of a policy of protection to be applied with discrimination..........." was most advisable. All the members were not unanimous, the minority in their minute of dissent say " there should be an unqualified pronouncement that the fiscal policy best suited for India is protection." They say that whenever protection exists, it is apt to be applied with discrimination, and therefore the qualifying clause should be done away with.

Anyhow it has been accepted that Protection (with or without the qualifying clause), is best suited to the interests of India. The reasons given are as follows: Public sentiment desires protection. The wealth of ancient ages still lives in the memory of the Indians. They long for the return of the by-gone prosperity, and they believed that this could be done only by the industrialization of India. Free Trade policy has been ruinous to the interests of India. The example of all other countries is another factor which makes the Indian sentiment long for protection.

All the great industrial countries have progressed upon protectionist system, and they have adhered to it. Germany, the United States of America, France, and Japan have adopted Protectionism. They have progressed within the secure walls of protection.

Any policy, if adopted only because it is backed by public sentiment, is not sure to be the one best suited for its requirements, unless there are some very good advantages inherent in it. Protection always means a certain amount of loss to the nation as a whole. Its burden arises from the increase in prices. But this burden is perfectly justifiable, if it is imposed temporarily, and on the ground that " The native must sacrifice and give up a measure of material prosperity in order to gain culture, skill and power and united production; it must sacrifice some present advantages in order to insure to itself future ones."

But it must be borne in mind that after all, this burden on the consumer is always temporary. As the home industry develops, its cost of production is reduced, and the foreign commodities are sold at a higher rate, than these home manufactures. Gradually import of foreign goods may cease altogether, and the prices will be regulated according to the cost of production of the home-produced articles.

That India needs industrialization is a fact established beyond dispute. A perusal of the report of the Industrial Commission 1918, will show India's past greatness as an industrial country. This very fact goes to prove the capability of India in this respect. Whatever the natural aptitude of India in the past, she is again showing uneasiness to recover her lost industries. This, India cannot achieve without the protective wall of Protection. All other impediments in the industrialization of India have a tendency to improve themselves. " India is an agricultural country which possesses undoubted natural advantages for manufacturing." She produces an abundance of

does not advocate any prohibition of trade. The lesson it teaches is that every country should be a self-sufficient economic unit. And in order to achieve this object, special concessions should be granted for the development of native industries, and that slight restrictions should be imposed upon the import of such goods as are likely to compete with such home industries.

Another idea is to make the empire strong. For instance, India has a strategic position in the East, and therefore it should be made strong by the development of her industries. This is the key-note of the modern tendency for protectionism. Its need is felt by all. Even the great stronghold of Free Trade—England, has gone on to a Protectionist basis. This is shown by such measures as the "Safeguarding of British Industries Act," or by the imposition of the duty of 88⅓ per cent. on motor cars, or again, by the recent removal of the excise duty on sugar to encourage the nascent beet-sugar industry.

So far we have examined the origin of protection, now we will examine the advantages claimed and its alleged disadvantages.

The greatest advantage claimed is the protection and the development of infant industries. The advanced state of some particular industry in one country, and its backwardness in another country, might not be essentially due to any lack of natural advantages in the latter, but, as often, "the superiority of one country over another in a branch of production often arises only from having begun it sooner. There may be no inherent advantage in one, or disadvantage in the other, but only a present superiority of acquired skill and experience."

If one country has all the natural advantages for the development of a certain industry, but cannot compete with another country long engaged in the same industry, merely because it has not the skilled and experienced labour available, and because it has not an established market like the other, it should be given protection with discrimination as to the amount of it, and as to the length of time. Thus protection will help the development of infant industries, which in the long run will so establish themselves as to compete with the foreign countries.

Another argument for protection is that manufactures and commerce have a civilizing influence upon the people. As we know, agriculture has some inherent defects. If any country were to devote itself entirely to agriculture, it is apt to be conservative in economics and politics. Therefore, there should be a diversity of occupation, and those countries which have hitherto been employed in agriculture alone, find themselves badly handicapped by their industrialized neighbours. They cannot develop their industries without protection. It will not only benefit the manufacturer but also the farmer himself. The cost of transportation to distant countries, consumes a great part of the farmer's produce. If a country makes industrial progres the raw produce will be consumed within the country, and hence the saving of the huge costs of transportation.

Besides these obvious advantages, Carey lays great stress upon the benefit of association, and the necessity of returning to earth what is taken from it. Association develops individuality, "Which has ever been in the ratio of the power of man to combine with his fellowmen." Now, association cannot take place to any extent among those who pursue the same employment. Diversity is needed. Unlikes unite and supplement each other. The farmer combines with the black-smith, and the miller with the baker. The diversity of pursuit promotes and requires intellectual development. "America does not wish to become a great farm for a city called England, but this is what would result from following British policy." Thus to Carey, prohibition was a great boon, which should be supported because it had with it the "benefits of association."

Another argument in favour of protection is put forth by Carey: "The consumer must take his place beside the producer in order to enable man to comply with the condition on which he obtains loans from the great bank of mother earth—the simple condition that when he shall have done with the capital furnished to him, he shall return it to the place whence it has been taken[1]."

The fallacy, with regard to the exhaustion of soil in this law as enunciated by Carey, is obvious upon the face of it. But it must be mentioned to give an idea of the importance he attached to protectionism.

---

1 Principles of Social Science, p. 58.

The Genesis and the Present Position of Protectionism in India

By ZAHEERUDDEEN AHMED, B.A., (Osmania)

THIS subject involves two distinct investigations, the first is the genesis or origin of Protectionism ; and secondly, its present position in India.

In order to trace the origin of Protectionism let us first examine it from a historical standpoint.

All great movements in history seem to possess a tendency to repeat themselves. To every action there is a reaction, and economic movements are no exception to this general rule. From the sixteenth to the latter half of the eighteenth century, the economic views, which dominated the policy of European statesmen, are summed up in one word ' mercantalism.' It was largely concerned with commerce, and involved many restrictions. A policy of state interference with international trade was thought essential for the well-being of a country. Various measures were taken to make a country export more of her manufactures, and import less of her necessities. This was supposed to create a favourable ' balance of trade,' which brought more ' treasure ' to the country, and added much to its material wealth. We need not discuss the merits of these ideas. Enough to say that extreme state-intervention was not only tolerated but persistently recommended by the leading economists of the day.

But the latter half of the 18th century saw a new school of economists, who were directly opposed to these views. They were against all the restrictions upon trade. They preached a policy of *laissez faire* and non-intervention. Adam Smith's book was published in 1776 ; he advocated the policy of *laissez faire, laissez passer*. It was an epoch-making book, it brought about a complete reaction against mercantilism. Its author strongly advocated a policy of Free Trade.

It is at this time that the controversy about Free Trade and Protectionism arose. Anyhow the policy of Free Trade exercised a tremendous influence upon the economic life of different European countries, and before the Great War it was universally accepted by England as the policy best suited to her interests.

The Great War has disproved many economic and political theories. It has upset many a calculation. It has brought about revolutions more of an economic than a political character. Before the War some countries—like Germany and the United States of America, which adhered to a Protectionist policy—were looked down upon as conservative, and as offering impediments in the way of achieving the ideal of the ' greatest good of the greatest number.' The War proved that the millennium of peace and an international state is yet to come. Both the belligerents and the neutrals realized with horror their utmost dependence for the articles of subsistence, upon other countries.

England who had hitherto deemed herself to be economically, the most powerful country, was now made to realize the danger of her entire population. Not only this, but from the point of view of national defence different countries realized their weakness. England was engaged in a life and death struggle in Europe, and compelled to leave India altogether defenceless. And England fully realized what this meant. These bitter experiences have brought about a great change in the International Trade policy of England. The influence of Free Trade policy seems to have relaxed, and England herself is giving way before the Protectionists' idea.

Thus we see that Protectionism is a reaction against Free Trade. It must not, however, be confounded with mercantilism. It

It is very troublesome to live in the company of those who belong to a different genus. In this case they were quite different from each other in every respect. How well it is expressed by the poet in this line.

کہاں صورت جن کہاں شکل انس
غرض قہر ہے صحبت غیر جنس

Where is the fellowship of jins? And where the form of man?

In short, associating with strange folk is a, dire calamity.

As the Prince was in the hands of the Fairy, he was obliged to do her bidding. He was a human being and as such could not live without human companionship. He wept bitterly to remember his father and mother. He adapted himself with great difficulty to the adverse circumstances in which he was placed. In the following the poet describes the conflict that goes on in his mind and how he bears the calamity.

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں
کہا اس نے جو کچھ کہا اسکو ہاں
ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس
رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس
کبھی اشک آنکھوں میں بھر لائے وہ
کبھی سانس لیکر کہے ہائے وہ
وہ محلوں کی چہلیں وہ گھر کا سماں
رہے روبرو دھیان میں ہر زماں
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے
تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
کبھی اپنی تنہائی کا غم کرے
کبھی اپنے اوپر دعا دم کرے
بہانہ سے دن رات سویا کرے
نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے
غرض اضطراب اس کو ہر حال میں
کہ جوں مرغ تڑپے نیا جال میں

Anyhow, he managed to live there, but whatever she said, he only answered "Yes, Yes," and, like a wild animal, kept wandering about, sad and absent; sometimes, heaving great sighs, he filled his eyes with tears, at other times, fixing his thoughts on the pastimes of the palace and the joys of his home, he became beside himself; when he remembered the affection of his father and mother, then, weeping, he caused a river of tears to flow; ever and anon, he sighed over his own solitude, saying "Alas! where have I come?" At times he drew blessings on himself, saying "Alas! what has happened to me:" then, when he sometimes thought of the fond and caressing way he had been brought up, he heaved cold sighs; on some pretence or other, oft-times he would sleep day and night, and if left alone, would weep at absence from his native land. In short, he was always as restless as an animal freshly caught in a net.

Thou hast drowned me in a wonderful gulf of grief;

In truth, thou hast robbed me of my life.

When one is glad everything appears to be so, on the other hand if he is gloomy every thing seems to put on a sad appearance. In short the world shares our various moods. As long as the Prince was in the garden, the attendants were making merry; they were playing and doing mischief; but when the fairy carried away the Prince then even the trees of the garden appeared to mourn the loss. How well Mir Hasan pictures this in the following verse :—

گیا جب کہ وہ سرو اس باغ سے
نظر پھول آنے لگے داغ سے
ھوے خشک اور زرد سارے نہال
ثمر لگ کے پانؤں ھوے پائمال
ترانے سے بلبل کا جی ھٹ گیا
گلوں کا جگر درد سے پھٹ گیا
تبسم گیا حزن سے غنچہ بھول
گیا غم سے ازبس لھو پی کے پھول
اڑا نور نرگس کی آنکھوں کا سب
ھوے بال سنبل کے ماتم کی شب
لب جو سے اڑنے لگی گرد گرد
گل اشرفی کا ھوا رنگ زرد
لگی آگ لالے کے دل کو تمام
دیا خاک میں پھینک عشرت کا جام
گرے غم سے انگور مد ھوش ھو
پڑے سارے سائے سیہ پوش ھو
پڑا ماتم اوس باغ میں بسکہ سخت
ھوے نخل ماتم تمامی درخت

From the departure of that majestic moving cypress, all the flowers appeared covered with spots, and, from that fresh rose being hid, all the plants dried up, and became as sticks; the trees began to drop their leaves, and the fruit to be trodden under foot; the hearts of all the flowers, on account of this stroke of fortune, were broken, and the souls of the nightingales, from hearing this weeping and lamentation, refrained from uttering their sweet notes; the buds, from grief, began to wither and the roses reddened, and each hair of spikenard, being perplexed with sorrow, shrivelled up; the gold-mohur flower became changed to a yellow colour, and the tulips, from the fire of burning grief, were burned up to such a degree, that they threw the cup of pleasure into the mud; the grapes, from the wine of grief, became intoxicated, and fell, while the shadows of the trees became clad in black. In fact, such severe mourning arose there, that each tree became a plant of sorrow.

According to the order of the Fairy, the Prince's bed was removed to a bungalow set with jewels, on the bank of a flowing stream. When the Prince got up, he was astonished to find himself in quite a new place. The condition of the Prince's mind when he awoke and found himself in a strange place is beautifully described by the poet.

قضارا کھلی آنکھہ اس گل کی جو
نہ پائی وھاں شہر کی اپنے بو
نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا
تعجب سے ایک ایک کو تکتا رھا
اچنبے کا یہہ خواب دیکھا جو واں
لگا کہنے یارب میں آیا کہاں

When, by chance, the eyes of that rose opened

He found neither the smell of his own city,

Nor beheld those persons (his attendants), nor his own place;

From astonishment, he began looking from one to the other,

And, on seeing this wonderful vision there,

Commenced to say; " Lord! where have I come?"

When he looked towards the head of his bed, he beheld a beautiful woman who was a stranger, standing there. He addressed her: " Who art thou? Whose house is this? And who brought me here?" On hearing this, she turned her face and drew her veil over her face, smiled, and replied,

خدا جانے تو کون یاں ھے کہاں
مجھے بھی تعجب ھے ھاں ھے کہاں

" *God knows who thou art, and who I am;*

I also am astonished, what shall I say!"

Then after a short silence she burst out laughing and said; " Thou art my guest, and fate and destiny have brought thee here."

یہہ گھر گو کہ میرا ھے تیرا نہیں
پر اب گھر یہہ تیرا ھے میرا نہیں

" *Though this house once was mine, not thine,*

However now 'tis thine, not mine.

men and women. By his knowledge of human nature and his vast experience he can say in what manner the men and women in his Mathnawi will act in changing circumstances and environments.

It is the nature of young children that they laugh when they are tickled. In these lines this accurately depicted by Mir Hasan.

زمرد کے لے ہاتھ مین سنگ پا
کیا خادمون نے جو آہنگ پا
ہنسا کھل کھلا وہ گل نوبہار
لیا کھینچ پاؤن کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنین پر ہوا
اثر گدگدی کا جبین پر ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے
ہوے جی سے قربان چھوٹے بڑے

* The bathing attendants, bringing emerald pumice stones began to wash his feet. That rose of beauty, immediately on their hands touching him, drew back his foot in such a manner, that the effects of being tickled became apparent on his brow. While, tittering, he laughed so playfully, that everyone present burst out laughing. They were all ready to sacrifice themselves with all their hearts and souls to him.

The King gave orders to his attendants to guard the Prince carefully. They were all tired and the cool breezes sent them to sleep. When they got up, they could not find the Prince in his bed. They were in a critical position. They could not help informing the King about the matter, though they dreaded to come into his presence and moreover they shuddered at the idea of the severe punishment he might inflict upon them. In the following lines Mir Hasan describes their anxious state.

رہے دیکھ یہ حال حیران کار
کہ "یہ کیا ہوا ہائے پروردگار"
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی
کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی
کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو
گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخدان چھڑی
رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتون مین داب
کسی نے کہا "گھر ہوا یہ خراب"
کسی نے دئے کھول سنبل سے بال
طمانچون سے جون گل کئے سرخ گال

They were all astonished as to what had happened, saying " Alas ! O God ! what is this ?" Seeing this state of affairs some began to weep; and others began to lose their life from grief. Some, crying, began running to and fro, while others fell to the ground from faintness ; some placing their hands on their heads, became like pictures of sorrow ; while others keeping a stick below their chins remained like the narcissus with their eyes open from astonishment. Some pressing their fingers between their teeth remained standing as they were, while others said, ' Alas ! this house is now become desolate." Some undoing their 'spikenard-like-hair ' struck their faces till they grew red.

The Prince had been born after long expectations ; so it was natural for the parents to love him from the bottom of their heart. The attendants went before the King weeping and beating their breast and gave an account of what had happened. There was no end to the grief of the parents. They wept bitterly. The King demanded explanation from those who had brought the news and burst out : " Tell me where ye have lost my ruby and in what well ye have drowned my Joseph." Thereupon the attendants took the King to the spot in the garden-house where the incident had taken place. The King was very much moved and said :

یہی تھی جگہ وہ جہان سے گیا
کہا ہائے بیٹا تو یان سے گیا
"مرے نوجوان مین کہان جاؤن پیر"
"نظر تونے مجھ پر نہ کی بینظیر"
"عجب بحر غم مین ڈبویا مجھے"
غرض جان سے تونے کھویا مجھے

This is the place from which he went,
" *Alas ! my son ! hast thou gone from here !*
O, my young son ! where shall I, an old man, go ?
For thou hast not taken any notice of me, O, Benazir !

*The translation here used is Major Henry Court's, revised and partly rewritten.

On Sihr-ul-Bayan of Mir Hasan

By SAYYID VAQAR AHMAD, B.A., (Osmania).

MIR Hasan's ancestors were of Herat, but owing to the ups and downs of life, they left their native place and settled down in Delhi. Mir Hasan was born in Delhi in the year 1144 A. H. His father's name was Mir Ghulam Husain Dahik, was a poet of some merit and a contemporary of Sawda.

From his childhood, Mir Hasan was inclined towards poetry; while he was in Delhi, he used to go to Mir Dard to show his Ghazals for correction, but he did not become well known while living in that city.

Owing to the decline of the Mughal Empire, Mir Ghulam Husain Dahik, left Delhi and came to Lucknow in quest of employment in the time of Asaf-ud-Dawla. Mir Hasan who was young then, went with him to Lucknow, where he was supported by Nawab Safdar Jung.

In Lucknow, Mir Hasan came under the influence of Diya-ud-din, Diya, and Sawda, but in reality he was a true pupil of Diya. Here he became very famous for his poetry.

Of his four sons, three were poets, who played a great part in the development of 'Marsia,' especially his grandson Mir Anis, who is the greatest Marsia-writer in Urdu poetry.

Mir Hasan was the author of a 'Diwan' of about 800 verses and of a 'Tazkira' of Urdu poets; he is most famous for his 'Mathnawi,' called 'Sihr-ul-Bayan.' It deals in Urdu verse with the love affairs of Badr-e-Munir and Be-nazir. He wrote this master-piece while he was in Lucknow. He completed and dedicatd it to Nawab Asaf-ud-Dawla in the year 1785 A.D.(1199 A.H.). He died in 1790 A.D., (1204 A.H.).

Mir Hasan's style is simple and lucid. Like Ghalib, he is not fond of using big Persian words. His structure of sentences is purely Urdu. Even, his translations from Persian are very charming. In this aspect he resembles Mir Taki Mir, though as a Ghazal-writer he does not hold as high a rank as Mir Taki Mir. He did not write any 'Kasida,' but as a 'Mathnawi' writer, he takes the first place in Urdu literature. We do not find the description of ceremonies and customs in usage at the time in Mir Taki Mir's Mathnawies; on the other hand Mir Hasan's Mathnawi is the mirror of his age. Mir Hasan is also superior to all Urdu Mathnawi-writers in his study of human nature and his power of description. These are the distinguishing features of good poetry. Here we shall give a few instances from Sihr-ul-Bayan.

The story is simple enough. The King wanted to abandon the throne, overcome with grief that he had no child to succeed him, but his Prime Minister advised him not to be hopeless. After many days he had a child and the astrologers foretold that there was danger to the boy for the first twelve years, but advised every precaution. The greatest care was taken of the child. When it was within a day of the period of twelve years, the King permitted the child to sleep on the palace-roof and ordered a strict watch, but owing to the cool breezes, the attendants fell asleep. A fairy, while passing that way, saw the Prince sleeping and fell in love with him. She ordered her attendants to take him to Fairyland, without disturbing him in the slightest. They did accordingly.

The separation from his parents was too much for the Prince and he was always unhappy and dejected. One day the fairy gave him a machine-horse on promise that he would be ever faithful to her, but he broke his promise by falling in love with Badr-e-Munir. When the fairy came to know of this, she got angry and imprisoned him. Badr-e-Munir grieved at the parting. Najm-un-Nisa, a friend of her's, seeing the condition of the Princess, started in search of the Prince Be-nazir. At last, after a great many difficulties, she found the Prince and released him and brought him back to the Princess. After a time they were married and soon after proceeded with great pomp to see the King, his father.

Mir Hasan is a great observer of human nature. He knows the true character of

Burns and Blake were the direct predecessors of Wordsworth, Coleridge, Shelley and Keats. For all of them nature had a living interest which manifested itself in different colours.

The elemental necessities of Romanticism are curiosity and love of nature. We can go further still and say " the most insistent features of Romanticism are a subtle sense of mystery, and exuberant intellectual curiosity and an instinct for the elemental simplicities of life."

THUNDERSTORMS

My mind has thunderstorms,
That brood for heavy hours ;
Until they rain me words
My thoughts are drooping flowers
And sulking, silent birds.

Yet come, dark thunderstorms,
And brood your heavy hours ;
For when you rain me words
My thoughts are dancing flowers
And joyful singing birds.

W. H. DAVIES

up briefly. They insisted upon the observance of the critical rules laid down by the Ancients. Theirs was the final word in matters literary. They followed the ancients to the extent of losing their originality and individuality and judgment. In what high esteem Pope held the ancient critics will be evident from his lines :—

" *Those rules of old discovered, not devised,*
Are nature still, but Nature methodiz'd ;
Nature like liberty, is but restrained
By the same laws which first herself ordained."

In another place he says :

'*Learn hence for ancient rules a just esteem,*
To copy nature is to copy them."

To a critic his advice is :

'*You, then, whose judgment the right course would steer,*
Know well each ancient's proper character;
His fable, subject, scope in ev'ry page,
Religion, country, genius of his age,
With all of these at once before your eyes
Cavil you may but never criticize."

To him those who would not follow Aristotle are

"*desperate sots and fools*
Who durst depart from Aristotle's rules."

Their favourite metre was the heroic couplet, and they patronised a definite poetic diction and distinct matter. In short, the watchwords of the ' classical school ' are order, clarity and tranquility.

The ' classical school ' had worn itself out by insisting upon certain set rules that had by this time become stereotyped and commonplace. Their baneful effect was keenly felt. They marred originality and imagination. The Romantic school came as a relief and supplied the needs of the time. It very easily rooted out the classical school.

The publication of the ' Lyrical Ballads ' in 1798, marks the final downfall of the classical school. The reaction in favour of romanticism had set in long before this date. Even when the classical school was very popular the way was being prepared for its overthrow. Before Pope had reached the summit of his fame in the fourth decade of the eighteenth century Thomson's 'Winter ' (1726) and his complete ' Seasons ' (1739) had appeared. He was in a way the inspirer of Wordsworth, the protagonist of the ' Romantic School.' Thomson's work once more revived interest in the study and observation of nature. Side by side with this return we find other signs of revolt in both the form and subject matter of poetry. It was difficult to surpass Pope in the handling of his chosen metre, the couplet. Those poets who wished to excel him reverted to older metres, blank-verse, octosyllabic couplets and the Spenserian Stanza. Thomson's ' Season ' were written in blank-verse. Collins and Gray carried on the revolt, both in the use of less regular measures and in seeking sources of inspiration and subjects for their verse widely removed from the prevailing themes of the life of the town and of society.

This revolt commenced in the first half of the eighteenth century.. By about the middle of th ecentury it had become definite and formidable. Percy's 'Reliques' Macpherson's ' Ossian ' and Warton's opposition did a great deal to bring about the downfall of the ' classical school.' The ' Reliques ' were published in 1765. " The publication of the ' Reliques,' " writes Professor Hales, " constitutes an epoch in the history of the great revival of taste ; it changed the face of literature. After 1765, before the end of the century, numerous collections of old ballads were made. The taste that was awakened never slumbered again. The recognition of our old life and poetry that the ' Reliques ' gave was at least gloriously confirmed and established by Walter Scott." Wordsworth testified in 1815 : " I do not think that there is an able writer in verse of the present day who would not be proud to acknowledge his obligation to the ' Reliques '."

In Crabbe and Cowper the older creed is gasping its last, giving place to the new order in Blake and Burns. The last two poets were thorough 'romantics.' In their poetry pure natural feeling, wholly free from artifice, had returned to English song and found expression in natural language. Other symptoms of this revolt in contemporary poetry were : a study of social questions and new interest taken in the poor ; indications of the democratic spirit not confined to the other side of the channel ; truer delineation of human character ; a widening of human sympathies to include children and animals and the joys and sorrows of home.

cooling of creative and imaginative impulses reflection and criticism invariably intervene. Thus the age of Dryden comes in like a wedge between two periods of creative literature. The tendencies developed in the age of Dryden were developed still more in the age of Pope.

We must now look to the changes that were brought about by classicism in matters of versification, subject matter and diction. As has already been said the Elizabethans never cared to bind themselves with any set rules. That is why they preferred the use of blank-verse in poetry. It is very near to prose and facilitates the imaginative flow. The classicists were averse to blank-verse. They developed the heroic couplet, which was in assonance with the spirit of the age. It was practised on a small scale by the later Elizabethans. But its real pioneer was the poet Waller, who used it promiscuously in an uncongenial atmosphere. If we compare a contemporary work with his we shall find a vast difference. It resembled the classical couplet, and it is a fact that it was developed by Dryden and later on improved by Pope. He has a stop of some kind at the end of each couplet; sometimes seven succeeding romantic couplets have no stop of any kind at the close. Secondly, if the pause or overflow at the end of the first line of each couplet be examined, it will be found that the pause is much more marked and ' overflow ' much less common in Waller's verse than say in Ben Jonson's or Chapman's; and if we place Pope in place of Waller the contrast would be more striking.

Take up the question of versification in general. It will be seen that the versification of the Romantic school admits every possible variety in its feet and in its lines, while that of the classical school is characterised by the formal ' correctness ' on which it prided itself. Their choice of metre is equally significant: the chosen metre of the classics is that which allows least freedom and scope to the individuality of the writer-the heroic couplet. If at all the romantics have a chosen metre, it is blank-verse, the most complete antithesis to the couplet; but it would be truer to say that romanticism tries all metres and binds itself to none. The watchword of the one school in versification as in all else, is liberty, that of the other is order.

As to subject matter, the classical school cannot lay any claim to high seriousness. This, in my opinion, was partly due to the social condition of the time and partly due to the form adopted by the classical school. The patriotism of the English people had now lost its vigour and pride. They involved themselves in petty quarrels and were divided into factions. Much of the time of the best minds of the country was spent in some tavern or coffee-house. The literary men were in the service of some nobleman or other and wrote to slander one party or other. They were at the beck and call of their masters. In short, literature became the handmaid of politics and statecraft.

In one respect at least Augustan literature has a claim to high rank. It reflects faithfully the character of the age. The literature of the period was exclusively didactic, moral and satiric. ' It is time ' wrote Pope in 1772, 'to like or affect to like, the country when out of love with all but one's self.' They were very punctilious about form, which curbed their imagination and creative power. " Wit and fine writing " says Addison, " doth not consist so much in advancing things that are new, as in giving things that are known an agreeable turn. It is impossible for us who live in the latter age of the world to make observations in criticism, morality or in any art or science which have not been touched upon by others. We have little else left us but to represent the common sense of mankind in more strong, more beautiful, or more uncommon lights."

' True wit is Nature to advantage dress'd
What oft was thought, but ne'er so well expressed.'

The same thought again. Shairp in one place remarks, " what most strikes one in the poetry of Pope and Addison's period is its external character and its limited range of subjects."

Poetic diction: It is that system of conventional titles and epithets that was set apart as peculiar to metrical composition in the eighteenth century. It was the direct outcome of a desire to make a distinction between words ordinarily used in conversation and those that were used in poetry. It was no longer possible for the ' Augustans ' to speak of birds or men except in prose; in poetry they became 'the feathered quire' and 'swains' respectively.

The classical principles may be summed

The Romantic and the Classic Creeds

BY SYED FAZLE HAQ

BEFORE writing anything about classicism we must acquaint ourselves with the characteristics of the Elizabethan period which preceded the classical period known in the history of English literature as the Augustan Age. Why the writers of the time chose this name for themselves shall be dealt with later on. The division of English literature into several periods is made for the sake of convenience and not with any idea of accuracy. English literature is approximately divided into three periods between 1579 and 1832 : the first is the Elizabethan period which extends from 1579 to 1660 ; the second is the Augustan Age from 1660 to 1798 ; and the third is the Age of Wordsworth which covers a period between 1798 and 1832. In this essay we are concerned with all these periods.

It would be convenient to explain the terms 'classic' and 'romantic' at the outset. The 'classic' writers prided themselves on their imitation of the ancients, *i.e.* the Greek and the Latin authors whom they regarded as the final authority in matters literary : hence they delighted to call their epoch the Augustan Age of English literature. Their literary creed is briefly expressed by the critic Walsh, who wielded great influence on Pope, when he wrote to him in 1707 : " The best of the modern poets in all languages are those that have the nearest copied the ancients." The term 'correct ' was also applied by the classicists to themselves and their poetry. Pope once wrote to Spence : " Walsh used to tell me that there was one way left of excelling ; for though we had several great poets, we never had any one great poet who was 'correct,' and he desired me to make that my study and aim."

' Late, very late, correctness grew our care,
When the tired nation breathed from Civil war.'

wrote Pope himself in his ' Essay on Criticism' and adds :—

'Ev'n copious Dryden wanted or forgot,
The last and greatest art, the art to blot.'

Pope takes 'correctness' in a very limited sense and puts forth his claim to it. But this would be a wrong notion. Milton before him was more correct than Pope.

The word 'romantic ' was first applied in its present literary sense by the romantics of the early nineteenth century. Pope and other ' Augustans ' had used the word in a depreciatory sense to mean ' sentimental,' almost an antithesis of classical. Their successors applied the term to themselves and to those with whom they claimed kinship, the Elizabethans.

It is necessary to write a few words by way of elucidation about the spirit of the Elizabethan age and show how it helped ' romanticism ' and carried it to the highest pitch, and after a time brought about its final downfall. In Elizabeth's day Englishmen were just waking up to the vastness and fulness of existence. They were struck by the immensity of life and the greatness of the world. They were conscious of their own vitality and spirit. They enjoyed freedom and appreciated nature. Theirs was an enterprising and adventurous spirit which opened to them the ' treasures of the deep.'

The one quality which they greatly needed was temperance, sobriety. Hence the extraordinary brilliance, the many-coloured variety and the abundant incongruity of their life wore them out soon. Their literature was inspired by passion and imagination and form was partly disparaged, partly made subservient to the unrestrained expression of thought and feeling.

This state of things could not continue for a long time. With the cooling of passion and emotion, with the replacement of spontaniety and abandon by reserve and introspection, with fierce party feeling taking the place of patriotism, the chief attention came to be directed to correctness and neatness of expression and the critical rules of art which finally developed into a cold exactness and perfection of form, unbroken by the sudden pauses and turns of thought natural to passion and imagination. On the

field of Urdu literature is neglected and where the teacher and the taught live mostly on what others, such as Hali and Bijnawri, have thought for them. Even when conscious attempt is made in our Universities to form a fresh estimation of Ghalib, our *savants* go to him not for the sake of his poetry but to add, if possible, as many additional heads to his trunk as they can invent for him.

The craze for Ghalib is so much on the increase that in the interests of the Urdu literature it is necessary that an attempt should be made by scholars, in collaboration if possible, to appraise the quality of his mind and art on sound and scientific lines.

The task however is fraught with great difficulties. There is no systematic account of Ghalib's life in existence. His letters which have supplied almost all the available material, about the facts of his life are not chronologically arranged in any edition, although they are the subject of study in the Indian Universities in their highest classes. A good many of them bear no dates at all. The Diwan itself originally compiled out of his poems by Ghalib himself does not suggest when and in what circumstances each Ghazal was composed. To study Ghalib under such conditions becomes exceedingly difficult. Still, if proper judgment is exercised, it may not be altogether impossible to recreate Ghalib for the present generation.

[We are much obliged to Dr. Syed Abdul Latif for the above article on the Approach to Ghalib. It appeared originally in the Twentieth Anniversary number of the Mussulman of Calcutta. The right of reproduction was reserved by the author. He has kindly allowed us to insert it in our first issue.

It will be received with great pleasure that Dr. Latif has undertaken to suggest a scheme of investigation as an aid to the study, the life and the Urdu poetry of Ghalib and the several problems they give rise to. This article is a prelude to it and is sufficient to give an idea of the importance of the prospective work and its place in criticism so much needed in Urdu. Ed.]

The second part of Hali's dissertation is an examination of Ghalib's poetry. But the treatment is again sectional. A few pages are devoted to illustrate by just a few stray lines the characteristics of his poetry, which according to Hali are " freshness of themes, and of ideas," " novelness of figures," " pleasantry," " mastery in clothing subtle thoughts in words of ordinary significance," and " conventional conceits common to his age." This done, Hali feels at once disinclined to pursue his subject. Says he : " There is scope for a great deal of further discussion on Ghalib's poetry. But as few have any great interest in such things, we close the discussion, and content ourself with giving a list of such lines of Ghalib as seem striking *at a glance*," and " explaining their meaning and annotating them." In this very dramatic manner does the most popular of Ghalib's biographers brush aside all the difficulties of the problem. Even in his concluding part which he regards as the "life-essence " of his work, does he hardly care to dwell on the " life-essence," of Ghalib's poetry.

In spite of his laborious task, Hali has not made it possible for the general reader to get at the heart and soul of Ghalib. Sectional treatment, cutting him into pieces without even suggesting their inter-relation is not suited to raise before one's mind a clear vision of the genius of Ghalib.

A special feature of Hali's dissertation, is his comparison of Ghalib with other poets, especially of Persia. Comparison for the sake of judicious estimation is one of the favourite methods in literary criticism. But it is a misleading and dangerous method when applied to conventional poetry and pursued without any reference to the circumstances of the life and the environment of each poet, the nature and character of the themes expressed, and the occasion of each utterance. For otherwise it becomes difficult to adjudge which lines in the Ghazals of a poet are conventional compositions of artificial nature, and which are the outcome of irrepressible impulses. Unless this differentiation is made—a task not very easy, by the very conditions of the art of Ghazal writing and for want of the circumstances when each Ghazal was composed, unless this is done, comparison is futile, especially so when, as in the *Yadgar*, the field covered by it is but 8 distichs written in imitation of Naziri, and 10 in that of Zahuri.

It will be remembered that in his prefatory note to the *Yadgar*, Hali suggested that a leading feature of his dissertation would be the determination of Ghalib's place among the leading poets of Persia by comparing their writings with his. When, however, the problem faces him in its practical bearing, he turns away from his purpose. Says he, " The occasion really demands the comparison of some of the Ghazals of Ghalib with those of all those people on whose ghazal-writing Ghalib's ghazal-writing, indeed all his poetry is based, *viz.*, Naziri, Urfi, Zahuri, Talib and others. Space however, does not allow all this. (the *Yadgar* runs into 321 pages !) Besides, few can appreciate the results of such investigations. I shall therefore take only two of Ghalib's Ghazals, and compare them with those of Naziri, and Zahuri, particularly because the Diwans of the two poets are at this moment before me. There is a well-known Ghazal of Naziri rhyming 'pa Khuftast' and 'bala Khuftast.' Ghalib has modelled a ghazal on that. Naziri's has 9 distichs, one of which cannot be deciphered. Ghalib's has 12. Hence only 8 of his will be selected, so that a proper comparison may be made."

Ghalib's poetic genius is to be appraised here on the merits of 8 distichs composed not in response to the call of any subjective poetic feeling, but as a matter of intellectual, imitative, experimental exercise ! The strangest part of this comparison is that few of the distichs compared agree in theme with their corresponding distichs. They have nothing in common except the metre and the rhyme order.

Another serious drawback in the methods of both Hali and Bijnawri is that they have on the strength of a line here or a line there jumped to the conclusion that Ghalib was a philosopher, astronomer, preacher, lover and so forth. This tendency is no less noticeable in one other critic, Dr. Sayyid Mahmud, Ph. D., Bar.-at-Law, of Patna who in his preface to the Badayuni edition of Ghalib's Urdu Diwan makes the poet the Apostle of Indian nationalism !

Valuations such as these, have created a wrong taste for literature among the Urdu-knowing public. It is a matter of deep regret that this taste is fostered not in ante-Diluvian circles so much as in our persent-day seats of learnings, where research in the

doubt as to what really constitutes Ghalib's greatness as a poet.

Hali's *Yadgar-i-Ghalib* is a less pretentious work, though bulkier. Unlike Bijnawri, he does not ramble wildly in a wilderness of dramatists, epical writers, scientists, philosophers and others, for the sake of appreciating the lyrical quality of Ghalib's writing. On the other hand, he works on certain intelligible lines.

In his preface to the work, he says that two methods of approach suggest themselves to him. One is

1. " to copy the best portions of his poems under each form,"

2. " to explain the beauty of each word, its meaning, its elegance, its subtlety,"

3. " to suggest to what class of poets he belonged, and to determine his position among them by comparing his writings with theirs, Ghazal with Ghazal, Qasida with Qasida and so on."

Hali calls this his ' ideal ' method. But he discards it as too difficult to pursue, and valueless or unprofitable to his age. He does not stop to explain why it should be difficult to pursue, and how unprofitable and valueless to his age.

After all, the right judgment in literature is a duty. A critic, especially one who has the right thing to say, who has a message to deliver for the correction of the prevailing taste, must speak his mind. Not everyone may understand him at the time. What of that ? Enough if a few do. An ideal is the impulse of a moment or of a strenuous reflection. It is a creation of its own kind and must be preserved. If it is suppressed for any reason it is a crime, a denial of what man has achieved.

After all, Hali's ideal method does not seem to be so very ideal. " To copy the best portion of Ghalib's poems under each form ; to explain the beauty of each word, its meaning, its elegance, subtlety ; to suggest to what class of poets he belonged and determine his position among them by comparing his writings with theirs, Ghazal with Ghazal, Qasida with Qasida and so on " is to work vertically, a method which will not help the treatment of Ghalib as a living organism. It will cut him into pieces and destroy the chance of creating a unified impression.

Hali's other method which he has preferred to follow in his *Yadgar* deals with the subject in three parts. The first part gives " an account of the facts of Ghalib's life," the second gives " selections from his verse and prose," and also a " comparison of each such selection with the writings of the Persian poets of established reputation." The third part is stated to be a " brief 'review' of Ghalib's life as a whole and of the character of his poetry and style."

The present writer has examined the results of this method very sympathetically. The method, as such, is not so very unscientific as the ' ideal ' method, Hali has luckily discarded. But in its process the method forgets its aim. Take his first part where he has attempted to give an account of the life of Ghalib. The facts of the life are not arranged chronologically or in a progressive order. They do not throw any light on the growth and development of his mind and art. Even the dates are not given according to any single calendar. They are sometimes according to the Christian, sometimes according te the Hijri. This is the order of his treatment :—

1. Birth 1212 A.H. and parentage, 2. Early training, 3. Journey to Calcutta (which took place when he was about 40 years old, date not given), 4. Pension from Lucknow (date not given), 5. Two grammatical difficulties, 6. Offer of Persian chair at the Delhi College 1842 A.D., 7. Imprisonment, 1261 A.H., 8. Court Historian of Bahadur Shah 1266 A.H., 9. Correction of Bahadur Shah's verses. 10. An incident during his visit to Calcutta. 11. Children, 12. Elegy on the death of Arif, 13. Mutiny, 14. Pension from Rampur, 15. *Qati-i-Burhan* controversy, 16. Ghalib s proficiency in Arabic, Persian, Prosody, Astrology.. Tassawuf, History, etc., verse-recitation, 17. Good manners, 18. Politeness, 19. Philanthrophy, 20. Memory, 21. Æsthetic perception, 22. Beauty of expression, 23. Self-respect, 24. Diet, 25. Love of mangoes, 26. Faith in Islam, 27. Bahadur Shah and the Shia Creed, 28. Meekness, 29. Sound judgment, 30. Recognition of merit in others, 31. Sense of justice, 32. Art of preface writing, 33. Love of truth, 34. Complaint of public neglect, 35. Confession of his age, 36. His distaste for satire, 37. His domestic affairs, 38. His death.

A treatment, such as this, of the facts of Ghalib's life hardly can produce a cumulative and unified effect on the mind of the reader.

Approach to Ghalib

BY DR. SYED ABDUL LATIF, PH.D., (LONDON)

Professor of English, Osmania University

THE Urdu Diwan of Ghalib, the Diwan as finally shaped by Ghalib himself covers eighteen hundred and odd distichs. Apparently it is a meagre output, very meagre indeed if we place it by the side of the quantity of verse produced by the other leading poets. Still, Ghalib is given by the present generation a place which is not willingly accorded to any other Urdu poet.

Since Ghalib died in 1869, various critics have attempted to appraise his contribution to Urdu poetry. Some have worked on merely conventional lines : have either expressed uninformed wonder in words with little intelligible meaning behind them, or lost themselves in verbal disquisitions over the poet's diction and style. None of this class has entered into the spirit of his writings and examined the character of his poetic feeling, thought, and imagination. This group of critics have appealed most especially to those whose education has een conducted, more or less, on indigenous lines and whose aesthetic sense has not been touched by the influence of Western literatures. There are, however, others—few in number—who have entered upon their task with larger aims than what have been before the conventionl critics. To these belong the late poet Hali, Sayyid Altaf Husayn, and the late Muhammad Abdul Rahman Bijnawri, a Doctor of Philosophy of the University of Goettingen. Particular mention is made of them for the reason that their contributions are of more serious nature than those of others, and also because the student of Ghalib turns to them sometimes for help and guidance but very often for ready-made opinions.

Hali and Dr. Bijnawri show profound scholarship in their approach to Ghalib, but they fail to draw a comprehensive picture of his mind and art. Dr. Bijnawri's *Mahasin-i-Kalam-i-Ghalib* appeared several years after Hali's *Yadgar-i-Ghalib*. His acquaintance with the literary ideals of the East, as well as of the West, fitted him probably better than Hali to undertake the appreciation of Ghalib on modern scientific lines. His *Mahasin*, however, too clearly brings it home to the reader that he has allowed his exuberant enthusiasm for Ghalib to swamp his judgment. What confidence can a critic inspire in the mind of his reader when he is told in the very first sentence of his contribution, a sentence standing as a paragraph by itself, this staggering opinion that " There are only two inspired books in India : the Sacred Vedas and the Diwan of Ghalib." An *obiter dictum* such as this at once suggests that the critic has no respect for perspective. That is exactly the impression which the reader gathers, as he follows Dr. Bijnawri in his impassioned ramble in the rest of his contribution. Ghalib, whatever he was, was primarily a lyrical poet. If, in order to appreciate the lyrical quality of his utterance, comparison with others was deemed so very essential, the natural line of action should have been to go to his brother lyrists, and not to conduct his idol to scoff at every figure known to Dr. Bijnawri in European art, literature and philosophy, like Raphael, Ruebens, Virgil, Ariosto, Goethe, Mombert, Millarme, Rimbaud, Mademoiselle De Maupin, Verlaine, Maeterlinck, Ibsen, Shakespeare, Wordsworth, Kant, Hegel, Spinoza, Bacon, Berkeley, Darwin, Wallace, Laplace, Spencer, Mendel, Weismann, Lodge, Herschell, Fichte, and Bergson. Such an imposing array of names, far from helping an understanding of the qualities of Ghalib's mind and art has, if anything, served to obscure them. No attempt is made to form a judicious estimate of the author by showing his characteristic defects equally with his distinctive merits as a poet. Moreover, the extracts from German and French writers designed to bring out by comparison or contrast the peculiar virtues of Ghalib were not translated for the benefit of the readers, who were mostly ignorant of those languages. After reading his lengthy review, one is still left in

one direction. I heard a man's voice weeping and declaiming wildly.

'What is it?' I inquired, among the outskirts.

'A great misfortune!' someone answered. 'A poor servant has lost a whip worth fifty Turkish pounds, his master's property. It was stolen from him by a miscreant—a wicked cabman. His lord will kill him if he fails to find it.'

Seized with interest, I shouldered my way forward. There was Rashid against the wall of a large mosque, beating himself against that wall with a most fearful outcry. A group of high-fezzed soldiers, the policemen of the city, hung round him in compassion, questioning. Happily, I wore a fez, and so, was inconspicuous.

'Fifty Turkish pounds!' he yelled. 'A hundred would not buy its brother! My master, the tremendous Count of all the English—their chief prince, by Allah!—loves it as his soul. He will pluck out and devour my heart and liver. O High Protector! O Almighty Lord!'

'What like was this said cabman?' asked a sergeant of the watch.

Rashid, with sobs and many pious interjections, described the cabman rather neatly as 'a one-eyed man, full-bearded, of a form as if inflated in the lower half. His name, he told me, was Habib; but Allah knows!'

'The man is known!' exclaimed the sergeant, eagerly. 'His dwelling is close by. Come, O thou poor, ill-used one. We will take the whip from him.'

At that Rashid's grief ceased as if by magic. He took the sergeant's hand and fondled it, as they went off together. I followed with the crowd as far as to the cabman's door, a filthy entry in a narrow lane, where, wishing to avoid discovery, I broke away and walked back quickly to the khan.

I had been there in my private alcove some few minutes, when Rashid arrived with a triumphant air, holding on high the famous whip. The sergeant came across the court with him. A score of soldiers waited in the gateway as I could see by the light of the great lantern hanging from the arch.

'Praise be to Allah, I have found it!' cried Rashid.

'Praise be to Allah, we have been enabled to do a little service for your Highness,' cried the sergeant. Therewith he pounced upon my hand and kissed it. I made them both sit down and called for coffee. Between the two of them, I heard the story. The sergeant praised Rashid's intelligence in going out and crying in a public place until the city and its whole police force had a share in his distress. Rashid, on his side, said that all that would have been in vain but for the sergeant's knowledge of the cabman's house. The sergeant, with a chuckle, owned that that same knowledge would have been of no effect had not Rashid once more displayed his keen intelligence. They had poured into the house—a single room, illumined only by a saucer lamp upon the ground—and searched it thoroughly, the cabman all the while protesting his great innocence, and swearing he had never in this world beheld a whip like that described. The soldiers, finding no whip, were beginning to believe his word when Rashid, who had remained aloof, observing that the cabman's wife stood very still beneath her veils, assailed her with a mighty push, which sent her staggering across the room. The whip was then discovered. It had been hidden underneath her petticoats. They had given the delinquent a good beating then and there. Would that be punishment enough in my opinion? asked the sergeant.

We decided that the beating was enough. I gave the sergeant a small present when he left. Rashid went with him, after carefully concealing the now famous whip. I suppose they went off to some tavern to discuss the wonderful adventure more at length; for I supped alone, and had been some time stretched upon my mattress on the floor before Rashid came in and spread his bed beside me.

'Art thou awake, O my dear lord?' he whispered. 'By Allah, thou didst wrong to give that sergeant any money. I had made thy name so great that but to look on thee was fee sufficient for a poor, lean dog like him.'

He then was silent for so long a while that I imagined he had gone to sleep. But, suddenly, he whispered once again:

'O my dear lord, forgive me the disturbance, but hast thou our revolver safe?'

'By Allah, Yes! Here, ready to my hand.'

'Good. But it would be better for the future that I should bear our whip and our revolver. I have made thy name so great that thou shouldst carry nothing.'

[From the book *Oriental Encounters*. By kind permission of Mr. Pickthall.]

The Rhinoceros Whip

By MARMADUKE PICKTHALL

WHERE is the whip? Rashid cried, suddenly, turning upon me in the gateway of the khan where we had just arrived.

'Merciful Allah! It is not with me. I must have left it in the carriage.'

Rashid threw down the saddle-bags, our customary luggage, which he had been carrying, and started running for his life. The carriage had got half-way down the narrow street half-roofed with awnings. At Rashid's fierce shout of 'Wait, O my uncle! We have left our whip!' the driver turned and glanced behind him, but, instead of stopping, lashed his horses to a gallop. Rashid ran even faster than before. The chase, receding rapidly, soon vanished from my sight. Twilight was coming on. Above the low, flat roofs to westward, the crescent moon hung in the green of sunset behind the minarets of the great mosque. I then took up the saddle-bags and delicately picked my way through couchant camels, tethered mules and horses in the courtyard to the khan itself, which was a kind of cloister. I was making my arrangements with the landlord, when Rashid returned, the picture of despair. He flung up both his hands, announcing failure, and then sank down upon the ground and moaned. The host, a burly man inquired what ailed him. I told him, when he uttered just reflections upon cabmen and the vanity of worldly wealth. Rashid, as I could see, was 'zi'lan'—a prey to that strange mixture of mad rage and sorrow and despair, which is a real disease for children of the Arabs. An English servant would not thus have cared about the loss of a small item of his master's property, not by his fault but through that master's oversight. But my possessions were Rashid's delight, his claim to honour. He boasted of them to all comers. In particular did he revere my gun, my service revolver, and this whip—a tough thong of rhinoceros hide, rather nicely mounted with silver, which had been presented to me by an aged Arab in return for some imagined favour. I had found it useful against pariah-dogs when these rushed out in packs to bite one's horse's legs, but had never viewed it as a badge of honour till Rashid came to me. To him it was the best of our possessions, marking us as of rank above the common. He thrust it on me even when I went out walking; and he it was who, when we started from our mountain home at noon that day, had laid it reverently down upon the seat beside me before he climbed upon the box beside the driver. And now the whip was lost through my neglectfulness. Rashid's dejection made me feel a worm.

'Allah! Allah!' he made moan. 'What can I do? The driver was a chance encounter. I do not know his dwelling, which may God destroy!'

The host remarked in comfortable tones that flesh is grass, all treasure perishable, and that it behoves a man to fix desire on higher things. Whereat Rashid sprang up, as one past patience, and departed, darting through the cattle in the yard with almost supernatural agility. 'Let him eat his rage alone!' the host advised me, with a shrug.

Having ordered supper for the third hour of the night, I, too, went out to stretch my limbs, which were stiff and bruised from four hours' jolting in a springless carriage, always on the point of overturning. We should have done better to have come on horseback in the usual way; but Rashid, having chanced upon the carriage, a great rarity, had decided on that way of going as more fashionable, forgetful of the fact that there was not a road.

The stars were out. In the few shops which still kept open lanterns hung, throwing streaks of yellow light on the uneven causeway, a gleam into the eyes of wayfarers and prowling dogs. Many of the people in the streets, too, carried lanterns whose swing made objects in their circle seem to leap and fall. I came at length into an open place where there was a concourse—a kind of square which might be called the centre of the city.

The crowd there, as I noted with surprise, was stationary, with all its faces turned in

The dominant impression made by him, is of an amazingly flexible mind, tempered by meditation, yet untrammelled in its range. In Sir Jagadis the culture of thirty centuries has blossomed into scientific brain which we cannot quite duplicate in the West. We have the courage, the quickness, perhaps the intuitive faculty, but we find in him a spiritual sense difficult to define, intangible yet evident, pre-eminently of the East, the quality out of which all great faiths have grown.

The result of his work on the thought of our time cannot yet be estimated, but it is not too early to say that once again a man from the East has taught us the ancient lesson of the mystics, that the world invisible may be seen and the voiceless word be heard, and that there are powers at the border lands of consciousness which the mind of man has yet to explore.

May his Institute go from strength to strength, giving freely of the subtlety of the Indian spirit to blend with the coarser but no less valuable mind-texture of the West, in man's onward march towards divinity.

[*The above generous appreciation of one of the world's living heroes appeared recently in the London* Spectator. Ed.]

Sir Jagadis Chandra Bose

THERE is a system of thought, a mental discipline in India, which we in the West should learn, if we are to hope for progress. But it remained for Bose to prove to us that this ancient tradition is still a vital force to-day.

Where are the great Eastern thinkers, we may ask? We understand the doer but not the dreamer. And it is just for this reason that Sir Jagadis Bose has been at last accepted and acclaimed by the Western world. He has beaten us at our own games of measurement, classification, analysis, inference. He has married the deathless and virile beauty of the Aryan tradition to the still adolescent debutante of Western science.

In plain words, the reader will ask: What exactly has Bose done? The answer to this question involves condensing thirty years of work into a couple of paragraphs, but it is not difficult to do this for as Bose says: 'All science is really simple, for truth is simple,' and the results of his life-work may be stated so that a child can understand them, although the reasoning that led to these results is as abstruse as anything that Einstein has ever predicted.

To begin with, Bose has proved that all life is one. This is not theory. Bose will commit himself to no theories or philosophies or religions, but merely give out his researches for moralists to do what they will with them. He has shown, then, that there is a basic Unity in composition, and in response to outer stimulus that runs through all matter, however, apparently inert or however palpitatingly alive.

The next great truth that Bose has demonstrated is that adversity is necessary, throughout the order of Nature, for the development of the powers of an organism. As an ethical point, this has long been known, but to prove it on a black-board was another matter. This is how Bose does it: he takes, say, a Mimosa as his subject, and allows it to grow up in his Institute carefully shielded from any harmful contact with the outer world. Just so much air and food and light are allowed to reach it—no more and no less, than the absolute theoretical ideal for its health and happiness. The Mimosa apparently flourishes under this regime and grows into a prosperous plant. But appearances are deceptive: there is a rottenness in the being of that Mimosa. It degenerates in its nervous fibre, just as a person that has never been tempered at the fire of sorrow, or borne adversity, cannot be a full man or woman. The pampered plant cannot react as a Mimosa should to stimuli from without. Its nervous reflex-arc has contracted. There is a slowing down of that mysterious vital force, concerning which Sir Jagadis, just because he has come closer to it than any other living man, does not presume to theorise.

The Bose Institute in Calcutta was dedicated to science and was built by funds supplied by Sir Jagadis and his charming wife. Sixteen students are at work there, devoting themselves wholly to science, not as a means of livelihood nor to gratify personal ambition, but, in the words of their founder, 'in order to win knowledge for its own sake and see truth face to face.'

The instruments by which Sir Jagadis measures the unvoiced emotions of the plant world are of such miraculous sensibility that they can magnify a plant emotion one hundred million times, in order to make it visible to our mortal eyes. He can drive an electric needle into the stem of a plant, and register its reaction so that you may see its agony. He can show you the heart-beat of a tree, or the flux and reflux of its sap. He can make you a witness of the death-throes of creatures which we hitherto believed to belong to another order of life than ourselves. He will show you how a shrub goes to sleep, how a carrot will behave under the whip of alcohol, or how a marigold will nod away under a narcotic. Plants feel, even as you and I. It is mere illusion, due to their static appearance, which leads us to believe that they are not sensitive. " There are no orders of life," says Sir Jagadis," but only one Life, under varying names, forms, time and space, appearances and causalities."

Plato

BY NAWAB NIZAMAT JUNG BAHADUR

Nawab Nizamat Jung Bahadur is a poet who writes little, but with that little he takes a world of pains. The Sonnet is a form which has been overdone in English as in other languages and is thus the more difficult to succeed in, as the Nawab Saheb has undoubtedly succeeded in his sonnets. It has recently been well said of them that they are extraordinarily graceful. This is as true as that they are immaculate in their mastery of form and in choice of words. I think also that they typify the greater art in obtruding no over-emphasised individuality such as the last century produced so abundantly in revolt against outworn convention.

They have the consoling quiet of classic utterance. They are as transparent in their thought and feeling as the best French poetry, and they enshrine passages of rare beauty, such as this lovely one :

Silence, the voice of God, alone must be
Love's voice for thee, beloved as thou art.

And these sonnets are all the truer poetry for the fact that their writer has gained his effects by groupings of simple words such as Shakespeare and Heine and even Browning fall back upon in their supreme moments.

E. E. S.

PLATO

He lived with beauty mirrored in his soul.
'Twas not the beauty and the majesty
Of this fair earth, the vast and solemn sea,
Or of the skies where starry myriads roll.
He looked beyond, and in the Infinite whole
He saw the Master's mind, the mystery
Of Love and Beauty, Truth and Harmony
Pervading Life. In him did faith control
Misdoubting faith, and reason, reason's pride ;
Till all the bitter strife of hope and fear
Was calmed, and thoughts that harass the weak mind.
His spirit pierced the many veils that hide
The Eternal, and he saw with vision clear
The final Good ordained for humankind.

NIZAMAT JUNG

long experience and meritorious services to the State.

We heartily congratulate the Nawab Sahib and other degree holders of the University for the year. We are indeed proud to count the Nawab Sahib as one of us.

This time the Convocation Address was given by Nawab Sadr Yar Jung Bahadur. The personality of the Nawab Sahib does not need any introduction. He is very well known throughout the length and breadth of India. He is remarkably fitted for such a responsible work, which is quite evident from his learned address. The Nawab Sahib's address is the result of matured experience and long educational activities. Within a short compass he touched on every important phase of the University and its future prospects. His advice to students needs special mention here and we wish them to make it an aim of their life and do credit to their *Alma Mater*.

The need of a magazine for our College has been greatly felt and a scheme to start one was thought of long ago, but remained unrealised until now. It was to come to fruition at the hands of our worthy Principal Mr. Abdur Rahman Khan. He is a friend and benefactor of his students, with whose interests he identifies himself, which accounts for his popularity with them. It is mainly due to his endeavours that the magazine, in which he takes personal interest, is coming into existence.

We hope the students will achieve higher and nobler aims under his moral influence, and by following his practical example which is constantly before them.

* * *

We owe a deep debt of gratitude to Professors E. E. Speight and Dr. Mohd. Nizamuddin who are the advisers of the English and Urdu Sections, respectively, of our magazine.

Professor Speight has always evinced keen interest in all the literary activities of our University. We regard him as a great asset to our English department. He is always ready to teach and assist his students. No less is his share in our magazine. He has given us valuable suggestions and every encouragement, we were so much in need of, and has taken great pains to make it successful. He has infused spirit into us and has practically taught us to take the optimistic and bright side of things.

Dr. Nizamuddin is not in any way less enthusiastic about the magazine in general and the Urdu section in particular.

We sincerely hope that the interest of both the professors will continue unabated throughout.

* * *

The Union is running smoothly. It has been regularly holding debates and arranging lectures. A Mushaera was also held under its auspices and the poems that were written for the occasion were afterwards published in the form of a booklet.

The present group of officers is fortunate in this that the magazine was started during its term and partly through its efforts, especially of the Vice-President, Mr. Quraishi, who has worked very enthusiastically on its behalf.

The term of these officers is soon coming to an end. The new election is upon us, and we trust that the students will be very careful in the choice of their representatives and also take keen interest in the proceedings of the Union.

We are glad that Mr. Moinuddin Quraishi the Vice-President, before he retired from the office, was appointed one of the editors of the magazine.

We heartily congratulate him and Mr. Mohiuddin Qadri Zoar on their appointment as editors of the Urdu section of the magazine.

* * *

Two of our old boys Messrs. Khaja Mohd. Naematulla Khan and Akbar Ali Khan have returned from England recently.

Mr. Naematulla Khan is the first man from our University who was awarded a European Scholarship for Engineering. He has taken his B.Sc. from Manchester. Mr. Akbar Ali Khan has taken his LL.B. honours from London University and was also called to the Bar.

We heartily congratulate both these gentlemen on their success and wish them the best of fortune in their future endeavours.

Editorial

BY the establishment of this magazine an important step has been taken towards unifying the activities of the Osmania University. No great and increasing institution such as ours, with its various affiliations, internal and external, should be without an easily accessible record of its doings and aspirations. We are certainly a very mixed community, with our cardinal differences of race, language and creed ; and one of the ideals of such a University is that it should serve to bring together in constructive and mutually helpful work those whom Nature has divided. During this early period of our existence, when our work is not yet centralized for lack of suitable buildings, such an organ as this is doubly desirable. We hope that workers in all the branches of study carried on here will come forward and help us with contributions which will throw light on what is being done in work and play and social activities by members of Osmania University at home and abroad.

* * *

It is of course natural in an institution in which Urdu is the home language of three quarter of the students and staff that the main body of the University Magazine should be written in that language. Our English section, which is intended to serve both as the representative of the University in the outer world, and as additional help in English studies, has to content itself with one-third of the space allotted to the Urdu section. There is no cause for complaint here. As Max Muller said : *The art of writing, in our times, is the art of condensing*, and although English writers are not exactly a laconic or epigrammatic tribe, the greatest things they have done, especially in lyric and drama, have been done in full consciousness of the force of brevity.

To write in brief a legend in a line.

Thus, Thomas Lodge voiced an ideal of which we have always had followers.

Much can be done, both contractive and expansive, moving to compressed energy and to healthy laughter by economy in words. Horace Walpole quotes this letter of a French lady :

Je vous ecris parceque je n'ai rien a faire : je finis parceque je n'ai rien a vous dire.

I write to you because I have nothing to do : I finish because I have nothing to say.

The shortest story is probably the well-known :

Algy met a bear. The bear was bulgy. The bulge was Algy.

And the shortest poem of modern times—in American free verse, is :

Till you came I was not I.

Even this yields in brevity to Shakespeare's account of himself : *I am that I am,*—and Iago's similar : *I am not that I am.*

It is ours, then, in this English section, to keep in mind the Irish saying : Shorten the road, my son !

We have been asked by many to state at length the policy we are going to adopt for our magazine. We have not got any very grand scheme to work out at present. It is as simple and obvious as the one followed by the magazines of institutions like ours. It professes to be an organ of the students. We hope that it will create and diffuse among them a literary taste. They will contribute to it and thus have a chance of developing their writing capacity. The articles published in it will be of general interest dealing with literature, history, economics and anything except political or religious questions of controversial nature.

Our professors and other people of light and learning will be requested to contribute articles from time to time and thus assist the students in their studies.

The Convocation of our University came off on the 3rd December 1926 under the auspices of Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, the Chancellor of the University. It was conducted with all decorum and propriety. After the degrees were awarded to the successful candidates of the year, the Chancellor was pleased to confer the honorary degree of Doctor of Law upon Nawab Sir Amin Jung Bahadur, who rightly deserved this honour for his literary talents,

glory. The example set by the Osmania University is about to be copied—so we understand—by several educational institutions in British India. Other suitable vernaculars may follow in the footsteps of Urdu and thus contribute to the general educational uplifting of the peoples of India.

The day is not far distant when the Osmania University will have fully developed its various faculties, and be ready to give to the world its share of original work that will be worthy of the generous support it receives from its enlightened patron.

Foreword

WE take advantage of this opportunity to give expression to our feeling of gratitude and deep sense of obligation to His Exalted Highness the Nizam, Asaf Jah Nizam-ul-Mulk, Mir Osman Ali Khan, G.C.S.I., for his munificent patronage of the Osmania University. The need for such an institution as a University, where problems of the highest form of education could be solved in all their complexity, with special reference to local requirements, was long felt in Hyderabad. Affiliation of the educational institutions of the country to one of the most efficient Universities of India could, from the very nature of things, offer only a partial solution. No apology is needed for the inauguration of a local University in a State of such immense importance as ours; but a few words by way of explanation may not be considered amiss in dealing with the uniqueness of the Osmania University in its bold departure from the long established method of imparting education in its higher forms through the medium of the English language.

Opinions have differed and may continue to differ in India for a long time, about the ultimate advantage in making one's mother tongue the medium of instruction. This is neither a fitting occasion, nor are these pages a proper place wherein to discuss this subject. But we think that we shall be failing in our duty to the University and to its august patron if we do not mention briefly a few of the more important features of the method of instruction that has been adopted at our University. In fact, it is with particular reference to these special features that the University is so indebted to the generosity of His Exalted Highness, and the country so deeply beholden to his educational instinct and literary genius.

A casual glance at our curricula and courses of study will suffice to show that while all the subjects of our various Faculties :—of Arts, Theology, Science, Law, etc., are taught through the medium of Urdu, English is by no means relegated to a position of secondary importance. To render into Urdu the works and achievements of Western *savants* and to maintain throughout the high standard of a modern University is a stupendous task, requiring the co-operation of the ablest brains and calling for the most enthusiastic support from a consummate critic and princely patron of letters. As a result of this happy combination we are in a position to say that the Osmania students assimilate thoroughly what they learn ; their science is not a mere collection of terms whose significance and real meaning they do not know ; " their Botany (or Zoology, etc.) is not but Latin names ;" the apparatus they handle in their laboratories is neither a fetish, nor an object of awe, nor yet foreign material. The mere fact that they give it a name from their mother-tongue imbues them with familiarity, so that they feel that it is in the fullest sense of the word *their own*. From the very inception of their collegiate course they learn how to approach the original sources—the fountain-heads of information. English to them is of even greater importance than to students of other Indian Universities, because they learn and feel how the facts and ideas inculcated into them have been drawn mainly from English sources. Often they go even further, and realise how a conception or principle elaborated or perfected in Europe took its root primarily in the brain of an Arab philosopher or a Hindu *savant*. In making Urdu discharge the functions of a fully developed and comprehensive language they, unconsciously, learn to realise and appreciate the reach and resourcefulness of the English language and to revel in the immensity of English Literature.

All these advantages we owe to the genius of our exalted patron, the Sultan-ul-Uloom of our University, for which we offer heartily our tribute of gratitude. The lamp of learning that he has lighted at Hyderabad has already begun to shed its light far and wide through the length and breadth of India. Not only has he confirmed and encouraged the raising of Urdu to the status of a fully developed living language—capable alike of expressing every shade of thought and emotion,—he has given Urdu a rank and a supremacy which it never hitherto enjoyed even at the courts of Delhi or Lucknow in the days of their highest

آقائے ولی نعمت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ



OUR ROYAL MASTER

CONTENTS